اب تک
ظفر اقبال
• تنسیخ • تحلیل • تقلیل
• تخفیف • ترکیب • تشکیک
کُلیاتِ غزل
جلد چہارم

کُلّیاتِ غزل

(جلد چہارم)

ظفر اقبال

معیاری اُردو زبان اور
دُرست املا کا محرک
اشاعتی ادارہ

MULTI MEDIA AFFAIRS

اب تک (جلد چہارم) ظفر اقبال
ISBN:978-969-596-005-9

اہتمام :
اشاعت اوّل : 2012ء
ٹائٹل : ریاض
کمپوزنگ : اعظم علی شاہ
مطبع : دی ریکوز پبلی کیشن، لاہور
ناشر : ملٹی میڈیا افیئرز
قیمت : 1200روپے
دکانچہ، نادر کتب : ریڈنگ شاپ
42-B لوئر مال روڈ لاہور
(042)37246110

MULTI MEDIA AFFAIRS
21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji,
Lahore-54505, Pakistan. Tel: (92-042) 37356454
Mobile:0333-4222998, 0322-4222998
E-Mail:multimediaaffairs@hotmail.com
multimediaaffairs@gmail.com

احمد مشتاق کے لیے

"اپنی غلطیاں کم سے کم کرنے کے لیے شاعر کو اپنے باطن سے ناقدانہ صلاحیت کا اظہار کرنا چاہیے، اور اپنا ناقد خود بننا چاہیے۔ اُس کے اندر محسوس کرنے والا ایک بچہ ہو، ایک باعمل خانہ دار خاتون ہو، ایک منطقی ہو، ایک بھکّڑ ہو، ایک مفقود الحواس شخص ہو، ایک ایسا سفاک علمبردار ہو جو شعر و شاعری کو تمام بکواس سمجھتا ہو"۔

(ڈبلیو ایچ آڈن)

تحلیل

تقلیل

ترکیب

شعریاتِ ظفر: چند باتیں

ظفر اقبال کی شاعری، شاعری کی نئی شعریات وضع کرنے پر اُکساتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جدید اور مابعد جدید اُردو غزل کے لیے اس نئی شعریات کی کیا معنویت ہے، اہم بات یہ ہے کہ نئی شعریات کے بغیر ہم ظفر اقبال کی غزل کا مُطالعہ کر ہی نہیں سکتے اور یہاں مقصود غزل کا ایسا مُطالعہ ہے جو صرف معانی کی سطحوں اور قسموں کو یا اسالیب کے تنوّع ہی کی نشان دہی نہیں کرتا بل کہ اسالیب و معانی کے پُورے نظام کو گرفت میں لیتا ہے اور اُن تمام سوالات کے جوابات مُہیا کرتا ہے جو تحیّر پسند اور متنوع شعار متنِ ظفر کے مُطالعے سے عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

جو لوگ شاعری کے تشریحی و توضیحی مُطالعے کے علاوہ تنقیدی مُطالعے کا تصوّر نہیں رکھتے، اُن کے لیے شعریات کے کوئی معنی نہیں، نہ اُنھیں ظفر اقبال کے سلسلے میں نئی شعریات کی تشکیل سے کچھ لینا دینا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری جب نئی شعریات کے لیے اُکساتی ہے تو گویا باور کرواتی ہے کہ اُسے خود اُس کے داخلی سیاق ہی کی روشنی میں پڑھا جائے اور ان توقعات سے دست کش ہوا جائے جو ہم اُردو غزل کے عمومی مُطالعے کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ ظفر اقبال کے یہاں ایسی غزلیں مل جاتی ہیں جن میں کہیں کلاسیکی اور کہیں جدید غزل کے تیور ہیں، مگر یہ ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں یا شاید یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اُردو غزل کے پیش تر ذائقوں سے کما حقہٗ آگاہ اور اُنھیں برتنے پر قادر ہیں۔ ان کی بنیاد پر ظفر اقبال کی اس انفرادیت کا خاکہ تک نہیں کھینچا جا سکتا، جو اُردو میں جتنی نمایاں ہے اُس سے بڑھ کر مبارز طلب ہے!...... اُس کے یہاں بعض مقامات پر نئی شعریات کے لیے تحریک اس قدر شدید ہے کہ اُردو غزل کی عمومی شعریات ہی سے بے زاری ہونے لگتی ہے۔ اسی سے آپ متنِ ظفر کے دودھاری تلوار کی طرح ہونے کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں: ایک ہی متن نئی شعریات کی ضرورت اور پُرانی شعریات کی ازکار رفتگی کا مضحکہ خیز احساس اُبھارتا ہے۔ ظفر اقبال کے یہاں طنز و تمسخر اور اُن کے اماثل کو اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ظفر اقبال کی غزل کو، خود اس کی شعریات کی روشنی میں پڑھنے کی سنجیدہ کوشش افتخار جالب نے کی تھی۔ میں نے یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کا ذکر دانستہ نہیں کیا۔ بجا کہ فاروقی کے مضامین نے ظفر اقبال کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا اور ظفر اقبال کے بنیادی شعری رویوں کی عمدہ نشان دہی کی، مگر وہ جسے ظفر کی شعریات کے طور پر دریافت کرتے ہیں، وہ اصلاً کلاسیکی شعریات ہے۔ البتہ افتخار جالب نے شعریاتِ ظفر کے سلسلے میں یہ اہم بات کہی تھی کہ ''یہاں ترتیبی سکیم کئی مقامات پر علی الاعلان مستقیم جملے کی تردید کرتی ہے۔ الفاظ کے جھرمٹ کہ جن میں فاعل، مفعول، فعل کے تعیّنات یکسر غائب ہیں، بتدریج اُمڈتے چلے آتے ہیں۔ مختلف الفاظ ایک دوسرے سے فکر، گرامر اور جذباتی اسلوب سے نہیں بندھتے، بل کہ الفاظ کی مخفی مناسبتیں چہ بلحاظ معنی اور چہ بلحاظ صوت و آہنگ وہ رشتے مُہیا کرتی ہیں، جن پر اُن کے جھرمٹ بننے کا دارومدار ہے۔'' بلاشبہ یہ شعریاتِ ظفر تک رسائی کی باضابطہ اور سنجیدہ کوشش تھی اور اس میں اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ زبان محض ذریعۂ اظہار نہیں، خیالات و جذبات کی تشکیلی جنم بھومی ہے۔ اُردو کی شعری تنقید میں افتخار جالب نے پہلی بار زبان کے ترسیلی کردار پر اُس کے تشکیلی کردار کے تفوّق کو اُجاگر کیا۔ اپنی نوعیت اور مضمرات کے اعتبار سے یہ ایک عظیم پیش رفت تھی، مگر افسوس کہ خود افتخار جالب اور اُن کے ہم نوا بھی اس کے حقیقی مضمرات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کر سکے۔ اُنھوں نے ظفر اقبال کی شاعری کے جس حصے کی بنیاد پر اپنی آرا قائم کیں، اُن میں زبان کے ترسیلی کردار کے عمومی تصوّر کی نفی تو ہوتی تھی، مگر زبان کے تشکیلی کردار کی وضاحت سرے سے نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ظفر اقبال کی شاعری کا محض ایک حصہ نحوی تعیّنات کی شکست کرتا اور الفاظ کی مخفی مناسبتوں کی دریافت کرتا ہے۔ یہ رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ ان کی شاعری کا یہی حصہ (خصوصاً ''گلافتاب'') اُن کی شاعری کا نمائندہ اور بہترین ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ لسانی تشکیلات کے حامل نقاد، ظفر اقبال کے سلسلے میں تجریدی طور پر کام یاب مگر عمومی طور پر ناکام ہیں۔ اور اس ناکامی کی سب سے بڑی وجہ زبان کے اُس تشکیلی کردار کا سرسری تصوّر تھا، جو اُن نقادوں کے پیشِ نظر تھا، مگر جسے ظفر اقبال خاموش ہُنرمندانہ انداز میں اپنی شاعری میں بروئے کار لاتے ہیں۔

ظفر اقبال کی شاعری، خود شاعری اور زبان کی موجودگی (Presence) اور غیاب

(Absence) کا ایک ایسا تماشا (Play) ہے، جس میں غیاب لوح پر لانے اور پہلے سے قائم موجودگی کو بے دخل کرنے، غیاب کو موجودگی بنانے اور پھر اسی کو چیلنج کرنے اور بے مقام کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ یہی وہ شعریات ہے جو ظفر کے متن کے مرتکز مطالعے سے برآمد ہوتی ہے۔

اس شعریات کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ یہ شاعری کا تصور زبان کی طرح کرتی ہے۔ یعنی زبان کو شعری مواد کے اظہار کا ذریعہ قرار نہیں دیتی یا دوسرے لفظوں میں شعری مواد اور اظہار کی ثنویت کو رد کرتی ہے۔ اس ثنویت کا تجربی اثبات الگ معاملہ ہے اور اسے قبول کر کے شعر لکھنا یا شعری تنقید لکھنا بالکل دوسری بات ہے۔ جہاں اس ثنویت کو قبول کیا جاتا ہے وہاں شعری مواد یا زبان کے ترسیلی کردار، کسی ایک کو لازماً اولیت اور برتری حاصل ہوتی ہے اور آپ جسے بھی اول تسلیم کرتے ہیں اسے مستحکم، اپنے آپ میں قائم اور مثالی بھی تسلیم کرتے ہیں اور وہ اپنی ضد مخالف کے لیے معیار بھی ہوتا ہے۔ مگر جب شاعری کا تصور زبان کی طرح کیا جائے تو شاعری زبان ہی کی طرح "معنی خیزی کا نظام" ہوتی ہے۔ معنی کی ترسیل اور معنی خیزی کے نظام میں فرق کیا جانا لازم ہے۔ معنی کی ترسیل کا لازمی مطلب ہے کہ معنی ایک الگ، جداگانہ 'ہستی' ہے اور زبان اسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کرتی ہے اور اس عمل میں خود غیر جانب دار ہوتی ہے، جب کہ "معنی خیزی کا نظام" کا مفہوم ہے کہ زبان اور شاعری معنی کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ گویا جسے ہم معنی کہتے ہیں، وہ زبان کے اندر، زبان کے تحت، زبان کی وجہ سے موجود ہے۔ زبان سے ہٹ کر اور زبان سے علیحدہ کر کے، معنی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ جب ہم شاعری کو زبان کے مانند قرار دیتے ہیں تو خود شاعری ہی کو (شاعرانہ) معانی کی تخلیق کا سرچشمہ تسلیم کرتے ہیں۔

شعریات ظفر کے مذکورہ امتیاز ہی سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شاعری نہ تو کسی آئیڈیالوجی کی ترسیل کا ذریعہ ہے اور نہ ذات کا اظہار ہے۔ شعریات ظفر ان دونوں تصورات شعر سے نفور ہے کہ دونوں میں آئیڈیالوجی اور ذات کو اول اور شاعری سے پہلے اور باہر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے تصور ادب میں بنیادی فرق موجود نہیں تھا۔ دونوں ادب کو ایک پہلے سے موجود و مستحکم معنی کی ترسیل کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ایک کے یہاں یہ معنی نظریہ، آئیڈیالوجی تھا اور دوسرے کے یہاں یہ ذات تھا۔ گویا دونوں ادب کو "حقیقت" کی نمایندگی یا انکشاف کا وسیلہ سمجھتے تھے، فرق صرف اس حقیقت کی تعبیر کا تھا۔ ظفر اقبال کی شاعری کا راستہ دونوں سے الگ ہے۔ یہاں اس بات کو ثابت کرنا مقصود نہیں کہ

آئیڈیالوجی اور ذات وجود نہیں رکھتے، اس بات پر زور دینا مطلوب ہے کہ دونوں زبان کے اندر تشکیل پاتے ہیں۔ انھیں زبان سے باہر اور پہلے تصور کرنے کا مقصد ان کا اجارہ ہی ہو سکتا ہے۔

شعریات ظفر جب لسانی موجودگی وغیاب کے تماشے پر استوار ہونا قبول کرتی ہے تو شاعری کے اس تصور سے بھی دست کش ہو جاتی ہے، جس میں موضوع ومضمون کی اقداری درجہ بندی ہوتی ہے۔ کلاسیکی مشرقی شعریات میں بھی موضوع ومضمون کی درجہ بندی موجود نہیں تھی۔ مثلاً قدامہ بن جعفر نے اشعر الناس سے متعلق اصمعی کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اصمعی نے کہا کہ اشعر الناس وہ ہے جو معمولی، مبتذل مضمون کو اپنے لفظوں میں محتشم بالشان اور وقیع بنا دے یا بلند سے بلند مطلب کو اپنے الفاظ کے زور سے پست کر دکھائے۔ گویا شاعری کے لیے موضوع ومضمون کی کوئی قید نہیں تھی اور شاعری میں مضمون کی پستی وبلندی کا کوئی امتیاز بھی موجود نہیں تھا۔ ہر چند اس تصور کے نتیجے میں شاعری نے ایک قسم کی خود مختاری حاصل کر لی تھی کہ بلند وپست کے اخلاقی تصورات کا اطلاق شاعری پر نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ بلند وپست قلمرو شعر میں داخل ہوتے تھے تو ان پر حکم سماجی اخلاقیات نہیں، شاعرانہ جمالیات ہوتی تھی۔ بایں ہمہ اس شعریات میں بھی شعری مواد اور پیرایہ اظہار کی ثنویت موجود تھی اور پیرایہ اظہار کو اپنے آپ میں قائم، مثالی اور معیار قرار دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ظفر اقبال کے یہاں موضوع ومضمون کی درجہ بندی کو مسترد کرنے کا جو میلان ملتا ہے، اسے کلاسیکی مشرقی شعریات کے احیا سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا—— ہمارے یہاں موضوع ومضمون کی درجہ بندی کا آغاز انجمن پنجاب کی تحریک سے ہوا۔ اردو غزل کے غالب مضامین کو طنز وتنقید کا نشانہ بنایا گیا اور ان کی جگہ نیچرل مضامین رائج کرنے کی ادارہ جاتی کوششیں کی گئیں۔ آگے ملی، مذہبی اور ترقی پسند شاعری میں بھی شعری مضامین کی درجہ بندی کار فرما رہی۔ اس کے اسباب خواہ کچھ ہوں، اردو شاعری میں ایک آئیڈیالوجیکل رویہ ضرور وجود میں آ گیا۔ اس رویے کا مظہر کہیں اخلاق، کہیں قوم، کہیں سماج اور کہیں جمالیاتی اصول تھا جو شعری مضامین کو چھانٹتا اور ان کے پست وبلند کے زمرے قائم کرتا تھا۔ اس امر کا ابھی پوری طرح احساس نہیں کیا گیا کہ مذکورہ آئیڈیالوجیکل رویے نے اردو شاعری کو کس بری طرح سے ایک خاص قسم کی 'فرقہ واریت' کا شکار کیا ہے: ایک ہی عہد کی شاعری کے دو زمرے (جیسے ترقی پسند اور جدید شاعری) ایک دوسرے کے سخت حریف بنے۔ ظفر اقبال کی شاعری پر اس آئیڈیالوجیکل رویے کا سایہ موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی موضوع غیر شاعرانہ نہیں۔

یہ تعریف کلیہ م ازم مین مغالطوں کو رد کرتا ہے: (۔شاعری خاص قسم کے موضوع، خیال، تجربے کی بنیاد پر شناخت رکھتی ہے: ب۔عام زبان اور شاعرانہ زبان میں جوہری سطح پر امتیاز موجود ہے۔جو لوگ یہ امتیاز روا رکھتے ہیں، وہ زبان کے تخلیقی مضمرات کا عرفان نہیں رکھتے۔ایک زمانے تک یہ تصور راسخ رہا ہے کہ استعارہ عام زبان اور شاعرانہ زبان میں حد فاصل قائم کرتا ہے۔اب یہ واضح ہے کہ استعارہ سازی کی صلاحیت عام زبان میں بھی موجود ہے۔شاعری اس صلاحیت کو زبان میں داخل نہیں کرتی، اس کا زیادہ اور بہتر استعمال کرتی ہے۔ استعارہ کی بنیاد مماثلت پر ہے اور زبان کا پورا نظام ہی مماثلت (Similarity) اور قربت (Contigenity) کے رشتوں پر استوار ہے۔ج۔زبان محض موجودگی سے عبارت ہے، یعنی زبان کا فقط وہی کردار ہے جس کا تعین بولنے والے کا منشا کرتا ہے، زبان میں مقرر کے منشا کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے۔لہٰذا زبان جس قدر موجود ہے، اس سے زیادہ غیاب میں ہے۔دوسرے لفظوں میں زبان جتنی اپنے حوالہ جاتی فریم ورک میں نظر آتی ہے، اس سے کہیں زیادہ اپنے غیر متعین اشاراتی دائروں میں کارفرما ہوتی ہے......

اگر آپ ان مغالطوں کو رد کیے بغیر ظفر اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں تو پھر آپ اُن کی شاعری کا مغالطہ آمیز مطالعہ ہی کرتے ہیں۔

زبان میں موجودگی اور غیاب کے تماشے کا ایک رُخ ظفر اقبال کے ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

جہاں میرے نہ ہونے کا نشاں پھیلا ہوا ہے
سمجھتا ہوں غبارِ آسماں پھیلا ہوا ہے

میں اس کو دیکھنے اور بھول جانے میں مگن ہوں
مرے آگے جو یہ خوابِ رواں پھیلا ہوا ہے

ابھی دو حیرتوں کے درمیاں موجود ہوں میں
سرِ آبِ یقیں ، عکسِ گماں پھیلا ہوا ہے

ظفر اب کے سخن کی سرزمیں پر ہے یہ موسم
بیاں غائب ہے اور رنگِ بیاں پھیلا ہوا ہے

یہ اشعار لکھے ہی نہ جا سکتے تھے اگر شاعر زبان کی اس خصوصیت کا عرفان نہ رکھتا اور اس کے

ہنرمندانہ استعمال پر قادر نہ ہوتا کہ زبان میں معنی کی موجودگی، پتھر کی لکیر کی طرح نہیں ہوتی، معنی دائمی طور پر کسی ایک مقام پر کندہ نہیں ہوتا۔معنی کی ہر موجودگی کا غیاب ہوتا ہے اور وہی موجودگی کے دائمی استحکام یا مستقل اجارے کی راہ مسدود کرتا ہے۔ظفر اقبال، اُن شاعروں سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے جن کی نگاہ و تخیل معنی کی موجودگی کے پار یا دائیں بائیں کے منطقوں تک رسائی سے قاصر ہوتی ہے اور وہ سرمایہ عمر خاص قسم کے معانی کی موجودگی کے استحکام و استقرار کی مساعی میں صرف کر دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ظفر اقبال کے یہاں موجودگی اور اس کے تسلط سے مبارزطلبی کا مستقل محاذ کھلا ہوا ہے۔ کہیں تو وہ موجودگی کو سرے سے تحس نحس کرنے کا اقدام کرتے ہیں، زبان کے رائج نحوی ڈھانچے اور اس سے متبادر ہونے والے معنیاتی نظام کی توڑ پھوڑ کرتے ہیں اور کہیں وہ موجودگی کے غیاب کو دریافت کرتے، اسے موجودگی کے مقابل لاتے، ایک تازہ قسم کی صورت قائم کرتے اور اس سب کے نتیجے میں معنی کی آفرینش کرتے ہیں۔مندرجہ بالا تمام اشعار میں آپ کو یہی عمل ملے گا۔ ہر شعر میں آپ کو موجودگی وغیاب کی صورت ملے گی جو کسی ایک معنی کے استقرار کے بجائے معانی کی بے کناریت (Open-endedness) کی فضا قائم کرتی محسوس ہو گی۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ان اشعار کی معنیاتی بے کناریت، شعری متن کی تشکیل سے پہلے اور باہر موجود نہیں تھی جسے شاعر نے متن میں منتقل کر دیا ہو۔ یہ تخلیقِ شعر کے لمحے میں، تخلیق شعر کے عمل میں اور شعر بہ طور لسانی مظہر ہی میں وجود پذیر ہوئی ہے۔ مثلاً یہی دیکھیے: یقین کی موجودگی کا غیاب گماں ہے۔ ہر موجودگی کی ایک اتھارٹی یا مقتدرہ ہے۔ چوں کہ اتھارٹی ہے، لہٰذا یہ کسی پر عمل آرا بھی ہوتی ہے۔ گماں کی تخلیق، یقین کی موجودگی و اتھارٹی کی عمل آرائی ہی کے لیے ہوئی ہے۔ یقین اپنی عمل آرائی یا استحکام کے لیے گمان کو دھکیلتا ہے اور غیاب میں پہنچاتا ہے۔ ظفر اقبال کے متن کی خوبی یہ ہے کہ اس میں یقین و گماں کے رشتے کی یہ ثقافتی ساخت ترخ جاتی ہے۔ یقیں، گماں کو Repress نہیں کرتا، گماں، یقیں کے پورے وجود میں سرایت کر جاتا اور اس کی اتھارٹی/ اجارے کو چیلنج کرتا ہے۔ آبِ یقیں میں عکسِ گماں کی تمثال، موجودگی وغیاب کے تماشے ہی کو پیش کرتی ہے۔ آفرینشِ معنی کی اس سے بھی بڑھ کر صورت آخری شعر میں ظاہر ہوئی ہے۔ شاعری روایتی طور پر بیاں (مضمون) اور رنگِ بیاں (اسلوب) سے عبارت رکھی گئی ہے۔ مگر یہاں یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ مضمون یا بیاں سرے سے غائب ہو گیا ہے۔ کیا یہ متن صرف یہ کہہ رہا ہے کہ متکلم یا اس کے عصر کی شاعری میں اصل اہمیت اسلوب، پیرایہ اظہار یا رنگِ بیاں کی

ہے"۔ جی ہاں! اس متن کا یہ مقتضا بھی ہے اور اس سے ہوا بھی۔ رنگِ بیاں جب پہلے تھی اپنی موجودگی باور کرواتا ہے تو وہ بیان غیر ضروری اور غائب ہو جاتا ہے جو شعری متن کے وجود میں آنے سے پہلے اور باہر موجود ہوتا ہے۔ رنگِ بیاں خود بیان تخلیق کر لیتا ہے۔ سادہ لفظوں میں شاعری موجود دنیا کی ترجمانی یا نمایندگی نہیں کرتی، معنی کی ایک نئی دنیا خود خلق کرتی ہے۔

ہماری تنقید کے لیے ابھی یہ تصور اجنبی ہے کہ متن، معانی کی تشکیل کا عرصہ (Space) ہوتا ہے۔ ابھی ہماری تنقید نے اس خیال کو بھینچ کر سینے سے لگایا ہوا ہے کہ متن، معنی کی تشکیل نہیں ترسیل کرتا ہے۔ چناں چہ ہم یا تو متن سے انھی معانی کی دریافت تو کرتے ہیں، جنھیں ہم متن سے باہر کسی سماجی صورتِ حال یا واقعے، نفسیاتی وقوعے، داخلی واردات، صوفیانہ کشف کے طور پر متعین کر چکے ہوتے ہیں، یا پھر متن کے جمالیاتی پیرایے کی تحسین کرتے ہیں۔ جہاں ہم متن کی علامتوں کو کھولتے اور ایک سے زائد معانی کی دریافت پر بغلیں بجاتے ہیں، وہاں بھی پہلے سے متعین معانی کی دریافت تو ہی کرتے ہیں۔ اس طور پر ہم متن کی قرأت نہیں کرتے، متن کی پہیلی بوجھتے ہیں۔ ظفر اقبال کی شاعری کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ ہمیں باور کروانے پر اکساتی ہے کہ متن پہلے سے موجود و مستحکم معانی کی ترسیل نہیں، متن سازی ہی میں معانی کی تشکیل کرتا ہے۔

یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ معانی متن سے پہلے اور باہر موجود ہوں یا متن سازی کے عمل ہی میں وجود میں آئیں، معانی ہی ہیں۔ آخر ان میں فرق ہی کیا ہے یا اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے کہ معنی دہرائے جائیں یا خلق کیے جائیں؟ گزارش ہے کہ بہت فرق پڑتا ہے۔ ہر معنی سیاق کا پابند ہوتا ہے۔ معنی اپنی اصل میں سیال ہے، سیاق اسے قابلِ شناخت، قابلِ بحث صورت دیتا ہے۔ متن سے باہر جو معانی موجود ہیں وہ اپنے سیاق سے مختص ہیں۔ یہ معانی جس صورتِ حال، واقعے، منظر، تجربے، کلامیے، آئیڈیالوجی سے جڑے ہیں وہی ان کا سیاق ہے۔ لیکن جو معانی متن سازی کے دوران میں تشکیل پاتے ہیں، ان کا سیاق بھی خود متن ہی ہوتا ہے یا متن میں موجود ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نئے معانی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی متن نئے سیاق میں نئے معانی کی تخلیق نہیں کر رہا تو وہ جھک مار رہا ہے۔ اس طرح کا متن، حقیقت میں ادبی متن نہیں، ادبی متن کا چربہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے متن اور رٹو توتے میں کوئی فرق نہیں ہوتا جو دوسروں کی وضع کی گئی باتوں (معانی) کو خود سمجھے یا ان میں اضافہ کیے بغیر دہرا دیتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو ہر چند ظفر اقبال کے یہاں بیسیوں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں پہلے سے موجود معانی کو شعری پیکر دے دیا گیا ہے،

بالخصوص "سرِ عام" کی غزلیں، جنھیں سراج منیر نے سیاسی معاملہ بندی کا نام دیا تھا اور ظفر اقبال جنھیں نئے شعری پیرایے کی تلاش کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، اسی طرح "مہے ہنومان" کی غزلیں ہیں۔ انھیں اساطیری معاملہ بندی کہہ سکتے ہیں، مگر یہ آرا ظفر اقبال کی شاعری سے سرسری گذرنے کا نتیجہ ہیں۔ ظفر اقبال جب پہلے سے موجود معانی یا سامنے کی باتوں کو شعر میں ڈھالتے ہیں تو وہ سامنے کی باتیں نہیں رہتیں، ان کی تقلیب ہو جاتی ہے۔ تاہم یہاں تقلیب کا ذریعہ ہیجان خیز (Emotive) انداز ہے۔ ان غزلوں میں سیاسی و سماجی صورتِ حال کو کہیں احتجاجی، کہیں طنزیہ، کہیں ملامتی اور کہیں نیم المیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ہر جگہ شاعر اس پچانوے فی صد طبقے کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے جو طاقت سے محروم مگر طاقت کی بدمستیوں کا نشانہ ہے۔ ان اشعار میں ظفر اقبال طاقت کے اجارہ داروں کی موجودگی کو اسی طرح چیلنج کرتے ہیں جس طرح وہ زبان اور شعری روایت کی موجودگی/ مقتدرہ/ اتھارٹی کو چیلنج کرتے ہیں۔ بایں ہمہ انھیں ہم ظفر اقبال کے شعری جینئس کے اظہار کا نمایندہ قرار نہیں دے سکتے۔ ظفر اقبال کے شعری جینئس کا غیر معمولی اظہار وہاں ہوا ہے، جہاں ان کا متن یہ واضح اعلان کرتا ہے کہ "متن سے باہر کچھ نہیں"۔ یہاں متن اپنی وجودیات کا اظہار غیر مشتبہ انداز میں کرتا ہے اور ان کا شعری آرٹ اپنی خالص ترین اور ارفع سطح پر نظر آتا ہے — آرٹ کی عظمت اس میں ہے کہ وہ تمام علائق، بیساکھیوں، سہاروں سے آزاد ہو کر اپنی اصل اور اپنے خود مختار وجود کا اظہار کرے۔ مثلاً مصوری کی عظمت اس میں ہے کہ وہ اشیاے مظاہر کی نمایندگی ترک کرے تاکہ اسے اپنے اصل وجود کے اظہار و انکشاف میں کسی اور شے کا سہارا نہ لینا پڑے۔ مصوری جب نمایندگی کی بیساکھی پھینک ڈالتی ہے تو اس میں تجریدیت پیدا ہوتی ہے۔ تجریدیت، آرٹ کی خود مختاری، آرٹ کی عظمت، آرٹ کی خالص اور غیر آلودہ اصل کا اظہار ہے۔ شعری آرٹ کی عظمت بھی علائق اور سہاروں سے آزاد ہونے میں ہے، مگر مختلف لوگوں کے یہاں اس عظمت کے حصول کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ شاعری کو مصوری کی قبیل میں شمار کرتے ہیں، وہ تمثال سازی کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک شاعری ایک غنائی صنف ہے، وہ لفظوں کے اصوات کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں کہ توجہ معانی کے بجائے صرف اصوات پر رہے۔ دونوں صورتوں میں مقصود شعری آرٹ کے خالص پن یعنی تجریدیت کا حصول ہوتا ہے، مگر اس کے حصول کی راہ میں اصل رکاوٹ شاعری کا اصل میڈیم یعنی الفاظ ہیں، جن کا معنی و مدلول کے بغیر تصور ہی محال ہے۔ تمثالیں اور صوتی آہنگ میں شعر اور مصرعے الفاظ ہی

ں ہوتے ہیں۔ مثلاً اخبار رنگ میں ان کی نظمیں ’کرن‘، ’بیری‘، ’ان آرٹ‘ سنگ میں بھی
کہانی آنکھ، ترنم، مجید امجد کی نظم ’کوئے تنگ‘ کے مصرعے عمدہ تمثالوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ہر
چند اولین قرأت میں ان کا تاثر ’تصویرِ ذہنی‘ کا ہے، مگر یہ ’تصویرِ ذہنی‘ جلد ہی معنی قائم کرنے کے
لیے اکساتی ہے۔ یہی صورت ’پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے/ جانے نہ جانے گل ہی نہ
جانے، باغ تو سارا جانے ہے‘، جیسے مترنم اشعار کی ہوتی ہے۔ ان کا مترنم آہنگ بھی معنی خیزی کے
عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ شعری آرٹ، مصوری و موسیقی کے مانند
تجریدیت کے حصول کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود ان کی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا، ان کی مثل
اپنے میڈیم کے حدود سے ماورا نہیں ہو سکتا، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شاعری نے عظمت
و تجریدیت کے حصول کا خود ایک اپنا راستہ دریافت نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری جب
دوسرے فنون کے ذرائع اور راستوں کے انتخاب کو حتمی آپشن قرار دیتی ہے تو اس راستے سے بھٹک
جاتی ہے جو اس کے اپنے اندر مستور ہے۔ غور کیجیے: شاعری کا تصور لفظ کے بغیر اور لفظ کا تصور معنی
کے بغیر نہیں اور ہر معنی سیاق کا پابند ہے۔ اب تجریدیت و عظمت حاصل کرنے کے لیے شاعری
کے پاس واحد راستہ یہ ہے کہ وہ خود کو، یعنی متن کو اپنا سیاق بنائے۔ شعری متن کی تشکیل ایک ایسے
انداز میں ہو کہ متن اپنے معانی کے لیے، خود میں مضمر و رواں سیاق کی طرف توجہ مبذول کروائے۔
دوسرے لفظوں میں کسی شاعر کے لیے ممکن نہیں کہ وہ لفظ کے ماسبق معنوی سیاق کو یکسر ختم کر
دے اور اسے بالکل نیا سیاق مہیا کر دے۔ اپنی غیر معمولی خلاقی کے باوجود شاعر کسی لفظ کے اس
معنوی سیاق کو سراسر زائل نہیں کر سکتا، جسے اجتماعی ثقافتی عمل وجود میں لاتا ہے۔ ہاں، اس کے لیے
یہ ضرور ممکن ہے کہ وہ متن میں نئے سیاق کی نمود کرے، جو ماسبق سیاق کی کارفرمائی کو معطل،
بے دخل یا بے اثر کر دے، اس کی ’موجودگی‘ کا زور ٹوٹ جائے اور اس کا ’غیاب‘ لَو دینے لگے۔
اسی بات کو ممکن بنانا ہی ظفر اقبال کی شاعری کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ جب کہتے ہیں:

کاغذ پر اک باغ بنایا کرتا ہوں
اُلٹے سیدھے پھول کھلایا کرتا ہوں
جو معلوم نہیں اُس کی دیتا ہوں خبر
جو دیکھا ہی نہیں، دکھلایا کرتا ہوں

تو اپنے سب سے بڑے ’شعری کنسرن‘ کا انکشاف کرتے ہیں۔ کاغذ پر باغ بنانا
دراصل اپنے شعری آرٹ کو اس بیساکھی اور سہارے سے الگ کرنا ہے جو شاعری کو فقط نمایندگی
میں بدل دیتے ہیں اور اس کی اصل و تجرید کو ممکن بناتا ہے۔ کاغذ پر بنا باغ، باغ کے روزمرہ اور عمومی
استعاراتی معنوی سیاق کو معطل کر رہا ہے، یہ ایک ایسے فردوس کو لسانی طور پر وجود میں لا رہا ہے، جو
پہلے کا دیکھا بھالا نہیں، جو شعری متن کی تخلیق کے ساتھ ہی وجود میں آیا ہے۔ پھولوں کے اُلٹے
سیدھے ہونے کا تصور بھی اسی انوکھے فردوس میں ممکن ہے۔ نامعلوم کو شعری طور پر معلوم بنانے
کا عمل بھی ہے .... یہی نہیں، کاغذ پر اک باغ، زمین پر اک باغ کا غیاب ہے۔ یہ غیاب
اسی وقت ’موجود‘ ہو سکتا ہے، جب زمین پر اک باغ کی موجودگی کو معرضِ التوا میں رکھا جائے۔ ظفر
اقبال کے یہاں سیاق و معنی اور ان کی موجودگی کو معرضِ التوا میں رکھنے کی مسلسل کوشش ملتی ہے۔

ظفر اقبال کے شعری تخیل میں غیر معمولی فعالیت، شدید اضطراب اور کناروں سے چھلک
چھلک جانے کی جو کیفیت ملتی ہے، وہ شعری آرٹ کی عظمت و تجریدیت تک رسائی کا مدعا رکھتی
ہے۔ ظفر اقبال کسی نظامِ فکر کی تعمیر کے لیے فکرمند اور خواہاں نظر آتے ہیں نہ شاعری کے ذریعے کوئی
سماجی انقلاب برپا کرنے کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ’’نفسِ شاعری‘‘ کسی
بھی نظامِ فکر یا سماجی انقلاب سے کہیں برتر اور ممتاز ہے۔ بنا بریں ظفر اقبال کے لیے شاعری ایک
سعیِ پیہم ہے، شاعری کے راستے سے ’’نفسِ شاعری‘‘ تک پہنچنے یا شعری آرٹ کی اُس تجریدیت
تک رسائی کی، جہاں یہ آرٹ تمام سہاروں سے آزاد یا ہر طرح کے ’غیر‘ سے نجات پا لیتا اور اپنی
اصل کے انکشاف میں کسی مزاحمت سے دوچار نہیں ہوتا۔ ظفر اقبال کے یہاں یہ بات ایک واضح
تنقیدی تصور کے طور پر کم ہی ظاہر ہوئی ہے، تاہم ان کی شاعری کے پس پشت یہ ایک نقش گر قوت
کے طور پر برابر کارفرما نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ انھیں مسلسل اُس پیرایے کی تلاش ہے جو صحیح
معنوں میں شاعری کے شایانِ شان ہو۔ اسی تلاش میں وہ موجود و رائج شعری پیرایوں کا مضحکہ
اڑاتے، اُن سے انحراف کرتے، اُن میں ترمیم کرتے ہیں۔ گویا اُن کی تلاش انہدام و تشکیل کے
دوگونہ اور متناقضانہ عمل سے عبارت ہے۔ وہ جب ایک پیرایہ وضع اور اختیار کرتے ہیں تو اس کے
مجاور بن کر نہیں بیٹھتے، جلد ہی اُسے منہدم اور منسوخ کر ڈالتے ہیں۔ یہ محض اُن کی اخلاقی جرأت
مندی کا اظہار نہیں کہ وہ خود اپنے پیرایے پر، خود اپنے ایک دوسرے پیرایے کی مدد سے خطِ تنسیخ
پھیر ڈالتے ہیں، بل کہ یہ نفسِ شاعری کے معلوم و نامعلوم کو کھوجنے کی اُن کے اندر غیر معمولی تڑپ
ہے ...... اسی وجہ سے یہ کہنا محال ہے کہ ظفر اقبال کا پیرایۂ سخن کیا ہے؟ اگر نئے نئے پیرایوں کا تجربہ

کرنا اور اس تجربے کو شعری آرٹ کی روح کی دریافت سے مشروط کرنا اور ہر تجربے کے بعد ملن مزید کی پیاس سے بے حال ہو جانا...... پیرایۂ سخن کہلا سکتا ہے تو یہی ظفر اقبال کا پیرایۂ سخن اور اسلوب شعر ہے۔

ظفر اقبال کے یہاں پیرایہ سازی کے جس سنگ میل کا زیادہ چرچا ہوا ہے، وہ لسانی تشکیلات ہے۔ یہاں ظفر اقبال نے زبان کی رائج نحوی ساخت کا انہدام کیا ہے۔ یہ عمل شاعری کی ایک خاص لسانی تعریف' کے تابع ہے۔ اصولاً اس کے نتائج کم یا زیادہ وہی ہیں جو شاعری کو مصوری یا موسیقی کی قبیل کی ایک شے قرار دینے کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں۔ اس لیے راقم کا خیال ہے کہ یہاں ظفر اقبال اپنے سارے تخلیقی وفور، قدرت کلام اور ہر طرح کے الفاظ کو شعری متن میں کھپانے کی بے مثال صلاحیت کے محدود اظہار کے علاوہ شعری آرٹ کی خالص ترین صورت، تجریدیت یا صحیح معنوں میں شاعری کے شایان شان' پیرایے تک پہنچنے کے منشا میں بھی کامیاب ہیں۔ جو حضرات ان کی اس وضع کی شاعری کو ان کے سفرِ شعر کا ایک پڑاؤ قرار دینے کے بجائے، ظفر اقبال کے لیے اور اردو شاعری کے لیے مثالی قرار دیتے ہیں، انھیں اپنے تنقیدی موقف کا بھرم رکھنے سے تو دلچسپی ہو سکتی ہے، خود ظفر اقبال کے شعری رفعت تک پہنچنے کے انکشاف سے کوئی سروکار نظر نہیں آتا۔

شعریات ظفر کی بہترین کارفرمائی ان اشعار میں نمایاں نظر آتی ہے جہاں یہ اشعار ہی اپنا سیاق ہیں۔ شعری متن کو خود اپنا سیاق مہیا کرنے یا متن کی معنی خیزی کے عمل کو جاری کرنے کے لیے، خود متن ہی کی Referentiality پر انحصار کی چند صورتیں، ظفر اقبال کے یہاں نمایاں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ شعر میں لفظ کے ماسبق سیاق کے پہلو ہی سے نئے معنوی سیاق تخلیق کیے جائیں۔ ایسی صورت میں پرانے معنی کی موجودگی کے وہ غیاب نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں، جن کا مشاہدہ یا ادراک ہم اس متن سے باہر اور پہلے نہیں کر سکتے تھے یا جن کی توقع ہمارے لیے محال تھی۔ یہاں متن روشنی کے ایک ایسے سرچشمے میں بدل جاتا ہے جو زبان کے عمومی نظام معانی کی ایک سر نئی تہوں کا کشف کرتا ہے، الفاظ کے بنیادی معنی کی گچھ اس طور توسیع کرتا ہے کہ ہم خلاف توقع نئے جلوہ ہائے معانی کے انکشاف پر انگشت بدنداں حیرت میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ اصلاً یہ عمل لفظ کو اس معنیاتی تکرار اور جبر سے آزادی دلانے کا ہے، جس کا شکار عام اور شعری زبان وقت کے ساتھ ہو جایا کرتی ہے۔ یہاں شاعر نئے لفظ، نئی تراکیب وضع کرتا ہے نہ روایتی مفہوم میں استعارہ سازی کرتا ہے، وہ عام فہم، روزمرہ و الفاظ کے سیاق کو وسعت عطا کرتا اور ایک ایسی تازہ و ذکی، نور افشاں معنیاتی کیفیت کو وجود میں لاتا ہے جسے تنقید کی زبان میں دہرانا (Reproduce) مشکل ہی نہیں، بعض صورتوں میں مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ اس امر کی ایک عمدہ ترین مثال ظفر اقبال کے 'وہم و گماں'' کی 'ایک طرف ہے' کی ردیف اور 'اطراف' کی چاروں طرف کی ردیف والی غزلیں ہیں۔ انھیں ظفر کے ایسے متون قرار دیا جا سکتا ہے، جن میں وہ اپنے شعری آرٹ کے اصل منشا کی تکمیل میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

تنکا سا کوئی ایک پڑا ایک طرف ہے
اور سارے زمانے کی ہوا ایک طرف ہے

اطراف ہیں اتنی کہ پتا ہی نہیں چلتا
کچھ بھی نہ سمجھنے کی سزا ایک طرف ہے

میں دیکھتا ہوں اور نظر کچھ نہیں آتا
کہنے کو مرا دیکھا ہوا ایک طرف ہے

اس ایک طرف میں ابھی کتنی ہیں کئی اور
ہر سمت کی اپنی ہی جدا ایک طرف ہے

لفظ پتوں کی طرح اڑنے لگے چاروں طرف
کیا ہوا چلتی رہی آج مرے چاروں طرف

ہیں بھی ایسے کہ فقط مجھ کو نظر آتے ہیں
ایک ہی دوسرے میں الجھے ہوئے چاروں طرف

آپ تو ایک طرف بیٹھ گیا وہ آ کر
اور پھر ایک طرف اس نے کیے چاروں طرف

آسماں پر کوئی تصویر بناتا ہوں ، ظفر
کہ رہے ایک طرف اور لگے چاروں طرف

....

یہ اشعار اس امر کی کلاسیک مثال ہیں کہ شعریات ظفر میں لفظ کے نئے معنوی سیاق کی تلاش وتشکیل کس جدت سے اور کتنے بڑے پیمانے پر کی گئی ہے۔ ہر لفظ کا معنوی سیاق ایک 'موجودگی'، اتھارٹی ہے، چوں کہ اتھارٹی ہے اس لیے اپنی اقتداری حیثیت قائم اور افشا کرنے کے لیے کوئی ہدف بھی منتخب یا تخلیق کرتی ہے، اُسے اپنے مقابل اس لیے رکھتی ہے کہ اُسے مسلسل Repress کرتی رہے اور اُسے غیاب میں دھکیلتی رہے۔ لفظ طرف، کا معنوی سیاق ''کنارہ، جانب، پاس لحاظ'' ہے۔ یہ 'موجودگی' ممکن ہی اُسی وقت ہے جب ''بے سمتی، بے جہتی، غیر جانب داری'' مسلسل نشانے پر اور غیاب میں رہے۔ مومن جب کہتے ہیں: نہ کوئی کرے گا کسی کی طرف/ وہ جس کی طرف، حق اُسی کی طرف...... تو 'طرف' کے معنوی سیاق کو فقط قائم رکھتے اور یوں اُس کی موجودگی کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ یہاں 'طرف' کا غیاب: غیر جانب داری مُسلسل ہدف پر ہے اور برابر غیاب میں ہے۔ مگر جب غالب یہ کہتے ہیں: ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں...... تو وہ 'طرفدار' کے غیاب کو، ایک نئی تعبیر کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ یہیں مومن اور غالب کا فرق بھی نمایاں ہوتا ہے...... ظفر اقبال نے مندرجہ بالا اشعار میں 'طرف' کی موجودگی وغیاب کو جس غیر معمولی طریقے سے اجاگر کیا ہے، وہ زبان وشاعری میں معانی کی اقتداری حیثیتوں سے ظفر اقبال کی مبارزت کا کھلا ثبوت تو ہے ہی، 'موجودگی وغیاب' کو اُلٹنے پلٹنے اور نئے جلوہ ہائے معانی کی آفرینش کا قابل رشک نمونہ بھی ہے۔

کسی متن کے اپنی کلیت، تجریدیت یا عظمت تک پہنچنے، یعنی نمائندگی وترجمانی کے بجائے خود اپنی اصل کا اظہار وانکشاف کرنے...... کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ متن دُنیا سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُس کا تعلق دُنیا سے بدل گیا ہے۔ جو متن نمائندگی کرتا ہے، وہ اپنی اصل سے انحراف کا مرتکب ہوتا ہے: وہ طفیلیہ ہے، جس کی نمائندگی کرتا ہے، اُس کا دست نگر ہے۔ وہ نمائندگی کے ذریعے اُس سب کو قائم رکھتا اور مستحکم کرتا ہے، جسے نمائندگی کا موضوع بناتا ہے۔ نمائندگی ایک ایسی دیوار ثابت ہوتی ہے جس سے آگے، جس کے باہر اور جس سے پرے وہ متن کچھ نہیں دیکھتا۔ خود اپنی طرف بھی نہیں دیکھتا کہ اس کا 'خود'، اس کا عکس یا موت ہو چکا ہوتا ہے یا بھسم ہو چکا ہوتا ہے۔ جب کہ اپنے 'نفس حقیقی' سے آگاہ اور اُس سے جڑا اور اُس سرچشمۂ نور سے برابر فیض یاب ہونے والا متن موجود دنیا، اُس کے تصورات، اُس کی آئیڈیالوجی سے پرے اور ماورا دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ نمائندگی سے عبارت متن صرف پانو رکھتا اور اُس پر موضوع نمائندگی کے سہارے کھڑا ہوتا ہے، جب کہ اپنی اصل سے وابستہ متن پر پرواز رکھتا ہے...... یہاں یہ اہم نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ کوئی متن (خواہ وہ نمائندگی وترجمانی کرتا ہو یا خود کی ریفر تحلیلی پر انحصار کرتا ہو) بند نظام (Closed System) نہیں ہوتا، وہ دُنیا، زبان کے نظام معانی سے الگ تھلگ نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا دونوں قسم کے متون میں بس فرق یہ ہوتا ہے کہ نمائندگی آشنا متن دُنیا وزبان کے نظام معانی سے سیراب ہوتا ہے، وہ برابر اس نظام معانی کے بہاو کو اپنی سمت کھینچنے کے لیے کوشاں اور سرگرم رہتا ہے، جب کہ دوسری قسم کا متن، دُنیا وزبان کے نظام معانی کو سیراب کرتا اور اپنے معانی کے بہاو کا رُخ دُنیا وزبان کی طرف کرتا ہے...... ظفر اقبال کے یہاں اس نوع کے شعری متون خاصی بڑی تعداد میں ہیں اور اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اُن کی شاعری کا بڑا حصہ دُنیا وزبان کے پہلے سے موجود نظام معانی میں قابل قدر اضافے سے عبارت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ظفر اقبال کی شاعری کسی سنجیدہ وتنقیدی مطالعے کا موضوع ہی نہ بنتی اور شعریات ظفر نام کی کوئی چیز اُردو تنقید میں اپنا جواز پیش کرنے سے قاصر ہوتی۔ لہٰذا یہ بات زیر بحث آنی چاہیے کہ مذکورہ اضافے کی نوعیت کیا ہے؟ ظفر اقبال نے موجودگی واتھارٹی کی کن کن شکلوں کو معطل، بے اثر اور بے دخل کیا اور اس کے نتیجے میں جمالیات کی کیا نئی ہیئتیں متعارف کروائیں اور اس سے بڑھ کر ہمارے مجموعی تصوّر کائنات اور ہمارے تصوّر ذات کی کن غائب وپنہاں سطحوں کو روشن کیا، دوسرے تخلیقی اذہان نے جن کی پہلے نشان دہی نہیں کی تھی؟ راقم کے نزدیک اس بحث کے نتیجے ہی میں ظفر اقبال کے دوسرے اُردو شعرا سے امتیاز اور اُردو شاعری میں اُن کی عطا کا تعیّن کیا جا سکتا ہے۔

ناصر عباس نیر

-☆-

ڈاکٹر ضیاءالحسن کے نام

عین ممکن ہے چراغوں کو وہ خاطر میں نہ لائے
گھر کا گھر ہم نے اٹھا راہگذر پر رکھا

جمال احسانی

خواب میں خاک اُڑانے کی طرف جانا ہے
میں نے اب اپنے زمانے کی طرف جانا ہے

انتظار اور طرح کا بھی ہے درپیش ، مگر
ابھی میں نے تیرے آنے کی طرف جانا ہے

کسی ناکردہ بیانی کی طرف سے ہو کر
کسی ناگفتہ فسانے کی طرف جانا ہے

اک چراغ اور جلانے کی طرف جاتے ہوئے
اک چراغاں کو بجھانے کی طرف جانا ہے

عمر گذری ہے یونہی ، اور ، یونہی گذرے گی
کبھی رونے ، کبھی گانے کی طرف جانا ہے

دل کا پتھر ہے مرے ہاتھ میں پھر سے ، گویا
پھر کسی آئنہ خانے کی طرف جانا ہے

اس شک و شبہ کے پیچیدہ سفر میں ہم نے
کیا کہیں ملنے ملانے کی طرف جانا ہے

مختصر سی ہے محبت کی یہ چادر جس کو
اوڑھنے ، اور ، بچھانے کی طرف جانا ہے

زندگی کا یہ سفر جاری و ساری ہے ، ظفرؔ
اور ، ابھی جان سے جانے کی طرف جانا ہے

☆

ہو کے یکسو جو بکھرنے کی طرف جانا تھا
اپنے ہی گھاٹ اُترنے کی طرف جانا تھا

بے نتیجہ ہی رہی کاہش ہستی ، ورنہ
کہیں کرنے ، کہیں بھرنے کی طرف جانا تھا

پیاس بجھتی کہاں ، دل کا یہ کنُواں تھا خالی
کسی چشمے ، کسی جھرنے کی طرف جانا تھا

احتیاط اتنی بھی کیا کرنی تھی اس کے آگے
کچھ نڈر ہو کے ہی ڈرنے کی طرف جانا تھا

دیکھ لیتا وہ ہمارے بھی کبھی عیب و ہنر
اس کے آگے سے گذرنے کی طرف جانا تھا

رہ گئے ہیں وہی کرنے کی طرف جا جا کر
ہم نے جو کام نہ کرنے کی طرف جانا تھا

کوئی تاثیر ہی پانی کی تھی ایسی کہ ہمیں
ڈوبنا تھا نہ اُبھرنے کی طرف جانا تھا

کیا سفر تھا ، ہمیں خود بھی نہیں معلوم اب تک
وہ بگڑنے کہ سنورنے کی طرف جانا تھا

آئے دُنیا میں تو جلدی رہی جانے کی ، ظفرؔ
چار دن ورنہ ٹھہرنے کی طرف جانا تھا

☆

اپنے اپنے ہی ستارے کی طرف جائیں گے
لوگ میرے نہ تمہارے کی طرف جائیں گے

کشتیاں ڈوب گئیں جن کی بھنور سے باہر
اب وہ کس منہ سے کنارے کی طرف جائیں گے

ہم نے دیوار گرا دی ہے خود اپنے ہاتھوں
اب کسی اور سہارے کی طرف جائیں گے

ہے یہی اپنی محبت کا منافع یکسر
ہم گئے بھی تو خسارے کی طرف جائیں گے

بہتے پانی سے پلٹ جائیں گے تنگ آ کر ہم
اور ، مخالف کسی دھارے کی طرف جائیں گے

ایک دن اور اگر ہم سے بسر ہو نہ سکا
ایک رات اور گزارے کی طرف جائیں گے

آزمانا ہے ابھی اور بھی کچھ دن اُس کو
ابھی اور اُس کے اشارے کی طرف جائیں گے

کہیں تھوڑے پہ قناعت نہیں کرنے والے
کبھی جائیں گے تو سارے کی طرف جائیں گے

اہلِ دنیا کے جو پلّے نہیں پڑنے کا ، ظفر
کس لیے شعر ہمارے کی طرف جائیں گے

☆

داغ دھبے کوئی دھونے کی طرف جاتے ہوئے
وہی ہونے سے نہ ہونے کی طرف جاتے ہوئے

کیفیت اب تو ہماری ہے کچھ ایسی کہ ہمیں
ہنسی آ جاتی ہے رونے کی طرف جاتے ہوئے

پڑا رہ جائے کہ اچھا نہیں لگتا اب تو
بوجھ باتوں کا یہ ڈھونے کی طرف جاتے ہوئے

کم ہی دونوں کو یہ اتنا ہے کہ شرم آتی ہے
اس محبت کے بچھونے کی طرف جاتے ہوئے

خواب الگ بھی کوئی کر دیتا ہوں اُلجھے سُلجھے
احتیاطاً کبھی سونے کی طرف جاتے ہوئے

شور سنتے ہوئے ہر آن ترے دریا کا
کسی دن ہونٹ بھگونے کی طرف جاتے ہوئے

ساتھ رہتی ہے کسی ساحلِ سرسبز کی یاد
کشتیاں اپنی ڈبونے کی طرف جاتے ہوئے

جستجو اپنی چلی ہے اسی ڈھب سے اب تک
کہیں پانا کسی کھونے کی طرف جاتے ہوئے

کام سمجھو تو ملاوٹ کا ہے سارا ، کہ ظفر
کچھ کسی شے میں سمونے کی طرف جاتے ہوئے

☆

یوں تو ہے زیرِ نظر ہر ماجرا دیکھا ہوا
پھر نہیں دیکھا ہے وہ رنگِ ہوا دیکھا ہوا

وہ ترا طرزِ تغافل، یہ ترا بیگانہ پن
وہ الگ دیکھا ہوا ہے، یہ جدا دیکھا ہوا

دیکھتے تھے جس کو پہلی بار حیرانی سے ہم
اصل میں پہلے ہمارا وہ بھی تھا دیکھا ہوا

توڑ کر ہی آرزو پہنچی کہیں پایانِ کار
گھپ اندھیرے میں کوئی بندِ قبا دیکھا ہوا

دیکھنا پڑتا ہے، کیا بتلائیں، پھر کیوں بار بار
وہ جو منظر تھا ہمارا بارہا دیکھا ہوا

فرق ہی دونوں میں کچھ باقی نہیں اب تو کوئی
کیا نہیں دیکھا ہوا ہے اور کیا دیکھا ہوا

اجنبی میرے لیے پھر بھی ہے کیوں میرا وجود
دربدر ڈھونڈا ہوا اور جا بجا دیکھا ہوا

یہ جو ان دیکھی گزرگاہوں پہ ہیں میرے قدم
شاید ان میں بھی ہے کوئی راستا دیکھا ہوا

جو نئی طرز و روش مجھ کو دکھاتے ہو، ظفر
یہ تو میری جان، سب کچھ ہے مرا دیکھا ہوا

☆

جو زمیں برتی ہوئی تھی، آسماں دیکھا ہوا
چھوڑ آئے ہیں کہیں اپنا جہاں دیکھا ہوا

شہر تو موجود ہے، لیکن، کہیں غائب ہیں اب
وہ کہیں دیکھے ہوئے سے، وہ مکاں دیکھا ہوا

ایک منظر یاد سے جو محو ہوتا ہی نہیں
یہ نہیں معلوم، لیکن، ہے کہاں دیکھا ہوا

کون ہیں جو اجنبی سے چل رہے ہیں ساتھ ساتھ
کیا ہوا آخر وہ اپنا کارواں دیکھا ہوا

یاد رہ جاتی ہے اک پرچھائیں سی ہر چیز کی
بھول جاتا ہوں یہاں کا ہر نشاں دیکھا ہوا

اک بلائے ناگہاں بھی کہ نہیں سکتے اسے
بجلیوں نے تھا ہمارا آشیاں دیکھا ہوا

دیکھنے میں اک رکاوٹ سی بھی آ پڑتی ہے بیچ
اصل تو رہتا ہے باقی بعد ازاں دیکھا ہوا

دل سے باہر بود و باش اس کی نہ پھر ممکن ہوئی
جس کسی نے بھی ہے یہ کنجِ اماں دیکھا ہوا

قابلِ دید اب ہمارے درمیاں کیا ہے، ظفر
کچھ یہاں دیکھا ہوا ہے، کچھ وہاں دیکھا ہوا

☆

اب جو پہلا سا نہیں ہے سربسر دیکھا ہوا
اور کا ہے اور ہی بارِ دگر دیکھا ہوا

رہ گئی ہے اُس کو پورا دیکھنے کی آرزو
یعنی ہے وہ یوں تو اپنا مختصر دیکھا ہوا

بن بُلائے ہی بھلا کس طرح جا دھمکیں وہاں
دیکھنے کو ہم نے بھی ہے اُس کا گھر دیکھا ہوا

کام سب کا چل رہا ہے، اور کسی نے بھی نہیں
کاروبارِ خواب کا نفع و ضرر دیکھا ہوا

فالتو کیا کچھ بندھا ہے، اور، ضروری کس قدر
دیکھتے ہیں کھول کر رختِ سفر دیکھا ہوا

ایک دو دن میں تو اُس کو دیکھ سکتے ہی نہیں
ہے تو وہ دیکھا ہوا، لیکن کدھر دیکھا ہوا

کچھ تعارف، کچھ سفارش بھی ضروری ہے ابھی
یوں تو ہے اُس نے مرا عیب و ہنر دیکھا ہوا

پار لگ جائیں گے دل میں ڈوب کر بھی بیش و کم
ہے ہمیشہ کا ہمارا یہ بھنور دیکھا ہوا

شہر کو اک دن دوبارہ دیکھیے جا کر، ظفر
اس سے پہلے بھی ہے یہ بے شک اگر دیکھا ہوا

☆

ہو بھی سکتا ہے وہ، لیکن ہوبہو دیکھا نہیں
کچھ دنوں سے میں نے اپنے چارسُو دیکھا نہیں

جاگزیں دل میں ہوا ایسا کہ میں نے اُس کے بعد
ایک پل بھی اُس کو اپنے رُوبرو دیکھا نہیں

سارا ہنگامہ یہ اہلِ سیر کے ہونے سے ہے
باغ میں پہلے تو ایسا رنگ و بُو دیکھا نہیں

ہر کسی پر ہے تری خاموش طبعی کا اثر
اور کسی نے تجھ کو گرمِ گفتگو دیکھا نہیں

وصل کے دوران خرمستی کرے جو بھی یہ دل
اوّلِ کار اس کو ہم نے بے وضو دیکھا نہیں

ہوش اپنا بھی نہیں، جاری تلاش اُس کی بھی ہے
اس طرح کا ہم نے جذبِ جستجو دیکھا نہیں

کچھ دنوں سے یہ کوئی بے رونقی سی ہے عجب
آئنوں میں رنگ، سڑکوں پر لہو دیکھا نہیں

وحشتِ دل میں خاک بھی اُڑتی نہیں ہے، آج کل
آرزو کیسی، غبارِ آرزو دیکھا نہیں

خود ہی یہ غارت گرِ خوابِ تعلق ہے، ظفر
زندگی میں دوستی جیسا عدو دیکھا نہیں

☆

پیغام اُس کا ٹھکرانا ہے یا نہیں
کیا معلوم وہاں جانا ہے یا نہیں

یہ بھی کُچھ نہیں کہہ سکتے ہیں اب کی بار
سامنے اُس کے گھبرانا ہے یا نہیں

طور اطوار سے ہی اُس کے کُھل جائے گا
بات ہماری وہ مانا ہے یا نہیں

سردی بڑھتی جاتی ہے، کیا حُکم ہے
محفل کو اب گرمانا ہے یا نہیں

پہلے ہی یہ فیصلہ ہونا چاہیے
کام وہ کر کے پچھتانا ہے یا نہیں

ایک بار ہی بیٹھ کے طے کر لیں ابھی
مِل کر رونا اور گانا ہے یا نہیں

ابھی نہیں کہہ سکتے، دیکھ رہے ہیں سب
شہر پہ یہ بادل چھانا ہے یا نہیں

صبح نکلتے وقت کوئی نہیں جانتا
شام کو واپس گھر آنا ہے یا نہیں

ایک خواب ہے، دیکھیں گے، اُس میں ظفر
ساتھ اُس کو بھی اُلجھانا ہے یا نہیں

***

کسی طرف میں جو آنے جانے پہ جا رہا تھا
تو اپنے ہی مُستقل ٹھکانے پہ جا رہا تھا

وہیں سے مِلنا تھی کوئی میٹھی مُراد مُجھ کو
جو تیز تیز اپنے آستانے پہ جا رہا تھا

ہوا کو میں چیرتا ہُوا بڑھ رہا تھا آگے
کہ تیر تھا اُس کا، اور، نشانے پہ جا رہا تھا

مجھے حفاظت بھی اُس کی مطلوب تھی، سو، پھر سے
میں اپنے چھوڑے ہُوئے خزانے پہ جا رہا تھا

نظر بھی صاف آ رہا تھا اُس وقت جال، پھر بھی
میں فاقہ مستی میں آب و دانے پہ جا رہا تھا

جگہ ہی رونے کی تھی نہ مُجھ کو کہیں میسّر
سو، میں بظاہر تو ناچ گانے پہ جا رہا تھا

کوئی وہاں میرا مُنتظر بھی نہیں تھا، لیکن
میں شام سے پہلے آشیانے پہ جا رہا تھا

مِرا سفر ختم ہونے والا تھا کوئی دم میں
کہ میں سیہ غار کے دہانے پہ جا رہا تھا

کوئی شکایت نہ تھی، ظفر، اہلِ شہر سے تو
یہاں سے میں صرف اُس کے طعنے پہ جا رہا تھا

***

کسی نئی طرح کی روانی میں جا رہا تھا
چراغ تھا کوئی ، اور ، پانی میں جا رہا تھا

رُکا ہُوا تھا وہ قافلہ تو ، مگر ، ابھی تک
غبار اپنی ہی بے کرانی میں جا رہا تھا

مجھے خبر تھی وہ کیا کرے گا سلوک مجھ سے
سو ، میں بظاہر تو خوش گمانی میں جا رہا تھا

میں تنگیِ دل سے خوش نہیں تھا ، اسی سبب سے
مکاں سے باہر کی لامکانی میں جا رہا تھا

تم اپنی مستی میں آن ٹکرائے مجھ سے یکدم
اِدھر سے میں بھی تو بے دھیانی میں جا رہا تھا

تری رُکاوٹ سے بھی مرے پانو کیسے رُکتے
کہ میں کسی اور سرگرانی میں جا رہا تھا

مرے لیے اجنبی تھا سیلابِ خواب میں وہ
جو لفظ چپ چاپ موجِ معنی میں جا رہا تھا

سخن سے بیزار کیوں نہ ہوتا میں آخر اپنے
کہ لطف سارا تو خوش بیانی میں جا رہا تھا

ظفر ، مرے خواب وقتِ آخر بھی تازہ دم تھے
یہ ، لگ رہا تھا کہ میں جوانی میں جا رہا تھا

☆

جو ایک مدت سے وارداتوں میں آ رہا تھا
سو ، اب وہی زہر میری باتوں میں آ رہا تھا

فقط اصولوں پہ چاہیے تھی نمود جس کی
وہ ضابطہ رفتہ رفتہ ذاتوں میں آ رہا تھا

لطیفہ یہ ہے ، بدن شرابور ہے اُسی کا
جو سب سے آگے تھا ، اور ، چھاتوں میں آ رہا تھا

سمجھ سے باہر تھی دُھند پھیلی ہوئی دنوں پر
عجیب اُلجھاؤ ایک راتوں میں آ رہا تھا

اُتر رہا تھا سیاہ غاروں میں رفتہ رفتہ
طباق بھر بھر کے جو قناتوں میں آ رہا تھا

جو آج دیکھا تو یاد آیا ہے جانے کیا کچھ
کہ نام تیرا بھی میرے کھاتوں میں آ رہا تھا

الگ الگ تھا کئی طرح سے نہ جانے کیوں کر
وہ ایک ہی ذائقہ جو ساتوں میں آ رہا تھا

پڑا ہو جیسے کہیں کسی اور کھیل میں وہ
جو میری جیتوں میں اور نہ ماتوں میں آ رہا تھا

ظفر ، ہمیشہ کی طرح پھر سے نکل گیا ہے
ابھی جو مچھلی سا میرے ہاتھوں میں آ رہا تھا

☆

ہوا کے جھونکے سے رہگزاروں میں آ رہے تھے
ابھی تو پیغام سب اشاروں میں آ رہے تھے

مری ہوائیں تری فضاؤں کو چومتی تھیں
ترے ستارے مرے ستاروں میں آ رہے تھے

وہ شام تھی ، اور ، آسماں جیسے ڈھک گیا تھا
کہ ہم پرندے تھے ، اور ، ہزاروں میں آ رہے تھے

ہوا سے ہلکے تھے ہم ، رکاوٹ بھی کچھ نہیں تھی
کہ ابرزادے تھے ، کوہساروں میں آ رہے تھے

ہمارے پیروں تلے کوئی راستا نہیں تھا
کہ ہم بظاہر تو رہگزاروں میں آ رہے تھے

ابھی چھلکنے لگے ہیں اپنی حدوں سے باہر
ابھی تو چپ چاپ سے کناروں میں آ رہے تھے

وہاں فرشتوں کے بھی کبھی ہمرکاب تھے ہم
کبھی ہم اُس کے گناہگاروں میں آ رہے تھے

بچھڑ رہے تھے ہم اپنے پیاروں سے جب زمیں پر
تو آسماں پر بھی اپنے پیاروں میں آ رہے تھے

ظفر ، بچا تھا ہمارے اندر ہر ایک موسم
خزاؤں سے ہو کے جو بہاروں میں آ رہے تھے

☆

کوئی نفاست نئی نشانوں میں آ رہی تھی
ہوا پرانی نئے زمانوں میں آ رہی تھی

فضا میں پتوں کی سرسراہٹ تھی ، اور ، پرندے
زمین سی کوئی آسمانوں میں آ رہی تھی

وہی سمندر میں اجنبی پانیوں کی شورش
ہوا کوئی اور بادبانوں میں آ رہی تھی

ملا جلا ہی تھا اس دفعہ نغمۂ محبت
فغاں کی آواز شادیانوں میں آ رہی تھی

بدل رہا تھا مزاج بھی خواب زندگی کا
کوئی حقیقت بھی داستانوں میں آ رہی تھی

یہ جام کس طرح کے مہیا کیے گئے تھے
شراب کیسی خمارخانوں میں آ رہی تھی

نہ تھی کسی حال پر وہ اگلی سی اب توجہ
کمی کوئی جیسے مہربانوں میں آ رہی تھی

ابھی کہیں اور تھا مکینوں کا آب و دانہ
ابھی فقط روشنی مکانوں میں آ رہی تھی

یقین ہی کیوں نہ آ رہا تھا ، ظفر ، کسی کو
کوئی وضاحت سی کیوں بیانوں میں آ رہی تھی

☆

بندھی ہے بھینس کھونٹے سے نہ کوئی گائے رکھتے ہیں
مگر ہم دودھ کے بارے میں اپنی رائے رکھتے ہیں

بہارِ بوسہ اب کے وہ بھی ساتھ اپنے نہیں لایا
سو، ہم بھی اُس کے آگے آج خالی چائے رکھتے ہیں

نمٹ سکتی نہیں اس عمر میں تو عاشقی ہم سے
ذرا سا کام ہے جس کو بہت پھیلائے رکھتے ہیں

ہمارے دل میں خود رونق ہماری ہے، جدھر دیکھو
ہم اس محفل کو اپنے آپ ہی گرمائے رکھتے ہیں

نتیجہ تو کوئی اس کا ابھی نکلا نہیں، لیکن
یہ ملبوسِ ملاقات اُس کو ہم پہنائے رکھتے ہیں

محبت کا کوئی اچھا زمانہ آنے والا ہے
ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کے بھی بہلائے رکھتے ہیں

جھلسنا اور ستانا ہمارا ہے جدا سب سے
ہماری دھوپ ہے اپنی، ہم اپنے سائے رکھتے ہیں

خیال آ جائے جانے کب نئی تعمیر کا ہم کو
سخن کی یہ حویلی احتیاطاً ڈھائے رکھتے ہیں

گداگر بھی، ظفر، دن رات ہیں اُس کی محبت کے
سرا ہے مگر کشکول بھی اوندھائے رکھتے ہیں

☆

بہت سلجھی ہوئی باتوں کو بھی الجھائے رکھتے ہیں
جو ہے کام آج کا، کل تک اُسے لٹکائے رکھتے ہیں

تغافل سا روا رکھتے ہیں اُس کے سامنے کیا کیا
مگر اندر ہی اندر طبع کو للچائے رکھتے ہیں

ہماری جستجو سے دورتر ہے منزلِ معنی
اسی کو کھوئے رکھنا ہے جسے ہم پائے رکھتے ہیں

ہماری آرزو اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی
یہ جامہ اس طرح کا ہے جسے اُلٹائے رکھتے ہیں

ہوائیں بھول کر بھی اس طرف کا رخ نہیں کرتیں
سو، یہ شاخِ تماشا آپ ہی تھرائے رکھتے ہیں

اسی سے روشنی ہے، اور، اسی میں بھسم ہونا ہے
یہ شعلہ شام کا جو رات بھر بھڑکائے رکھتے ہیں

ہم اتنی روشنی میں دیکھ بھی سکتے نہیں اس کو
سو، اپنے آپ ہی اس چاند کو گہنائے رکھتے ہیں

نشیبِ شاعری میں ہے ہماری ذات سے رونق
یہی پتھر ہے جس کو رات دن لڑھکائے رکھتے ہیں

یہ گھر جس کا ہے اُس نے واپس آنا ہے، ظفر اس میں
اسی خاطر در و دیوار کو مہکائے رکھتے ہیں

سفر میں کچھ نئے ، رفتار کے پیرائے رکھتے ہیں
الف بھی جو نہ رکھتے تھے کبھی ، اب یائے رکھتے ہیں

جو پاکستان میں کرتے تھے بے انصافیاں ہم سے
وہ بھارت جا کے بھی ہم سے وہی اپنائے رکھتے ہیں

تموّل شہر میں ہے اور بھی کافی بہت ، لیکن
یہاں پر آپ تو کچھ اور ہی سرمائے رکھتے ہیں

بہت ہی بے مزے ہوں گے کچھ اپنے طور پر ، لیکن
محبت گیت ہے ایسا جسے ہم گائے رکھتے ہیں

وہ اپنے پرس میں رکھ کر بہت سی کام کی چیزیں
ضروری ساز و ساماں ساتھ اپنے لائے رکھتے ہیں

ہماری جان کو خطرہ اگر ہے تو اُنہی سے ہے
کہ ہم اک عمر سے ہمسایے بھی ماں جائے رکھتے ہیں

ہمارے صبر کا پھل اس لیے میٹھا نہیں ہوتا
کہ ہم پیمانۂ صبر آپ ہی چھلکائے رکھتے ہیں

نجانے کس جگہ ، اور ، کس گھڑی کیا ہونے والا ہے
کہ گھبرائے ہُوئے ہیں ، اور ، اُسے گھبرائے رکھتے ہیں

یہی وہ خطۂ خواب تماشا ہے ، ظفرؔ ، جس کو
کبھی دریائے رکھتے ہیں کبھی صحرائے رکھتے ہیں

-☆-

یہ کیسے لوگ ہیں ، یعنی یہ ہائے وائے رکھتے ہیں
وگرنہ آپ کی محفل میں ہم بھی آئے رکھتے ہیں

ستم یہ ہے کہ نوکر بھی نہیں گردانتے ہم کو
وہ سارے کام بھی ہم سے ، مگر ، کروائے رکھتے ہیں

کہیں یکسو ہی کرنے شاید آ نکلے کسی دن وہ
اسی خاطر ہم اپنے آپ کو بکھرائے رکھتے ہیں

یہ دل کی رات اندھیری بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے
لبوں کا پھول وہ بھی ہر گھڑی دمکائے رکھتے ہیں

ہوا کے ساتھ جاتی بھی ہے خوشبو دور تک اُڑ کر
سو ، وہ باغ بدن کو اور بھی مہکائے رکھتے ہیں

مُسلسل رابطے میں ہیں کسی کے ساتھ ہر صورت
جو باتیں آپ کہہ سکتے نہیں کہلائے رکھتے ہیں

بہُت مدّت سے تُم خود ہی کہیں نایاب ہو ، ورنہ
سبھی اشیا تو ہم بازار سے منگوائے رکھتے ہیں

کسی لمحے یہ دھڑکن ہی نہ دل کو مُنہدم کر دے
اسے ہم اس کی ہی آواز سے دہلائے رکھتے ہیں

ظفر صاحب ! یہ کیسی شاعری اب کیوں نہیں ہوتی
کہ اس موضوع پر کچھ آپ بھی فرمائے رکھتے ہیں

-☆-

کس خیال تیرے نشاں کے علاوہ ہے
یہ روشنی ہمارے مکاں کے علاوہ ہے

رونق اک اور بھی ہے کہیں پر لگی ہوئی
اک شور اور ہے جو یہاں کے علاوہ ہے

کب سے بُلا رہا ہے وہ اپنی طرف ہمیں
جو شہر تیرے میرے جہاں کے علاوہ ہے

دیتا ہے کھیتوں کو جو رنگت نئی نئی
پانی سا ایک آبِ رواں کے علاوہ ہے

رکھتے نہیں مرے سے حساب و کتابِ دل
یہ کاروبار سُود و زیاں کے علاوہ ہے

اُس کو میں کوئی نام بھی دے سک نہیں رہا
اُلجھن جو ایک خوابِ گراں کے علاوہ ہے

سرحد ہے ایک ہونے نہ ہونے کی ، اور ، ہم
ہستی ہماری وہم و گماں کے علاوہ ہے

دریائے شاعری سے ہے باہر بھی ایک موج
اک لفظ ابھی زبان و بیاں کے علاوہ ہے

بیٹھے ہیں دیکھنے کے بھی منتظر ، ظفر
کچھ آپ کے جو رنگِ بیاں کے علاوہ ہے

☆

اپنی رسائی خواب و خبر کے علاوہ ہے
جو ربط شاخ سے ہے ، شجر کے علاوہ ہے

اپنی نظر اُسی پہ ہے اس کاروبار میں
اک فائدہ جو نفع و ضرر کے علاوہ ہے

اُس کی خبر جہاں سے پہنچتی ہے میرے پاس
وہ راستہ دریچہ و در کے علاوہ ہے

جا کر کبھی سنو تو سہی ، اُس کی بات میں
جو آب و تاب ہے وہ اثر کے علاوہ ہے

چلنے سے پیشتر جو ضروری تھا اس قدر
بوسہ وہ ایک زادِ سفر کے علاوہ ہے

رہتے نہیں ہیں اُس میں تو یہ بات ہے الگ
گھر ایک اور بھی کوئی گھر کے علاوہ ہے

کشتی ہماری ڈوبنے والی تو ہے ، مگر
خطرہ جو ہے اسے وہ بھنور کے علاوہ ہے

ہم بیٹھے سے ہی سوچتے رہتے ہیں رات دن
خواب و خیال جو بھی ہے ہُنر کے علاوہ ہے

یہ رنگ بازیاں ہیں فقط ، ورنہ ، اے ظفر
عرضِ ہُنر بھی عرضِ ہُنر کے علاوہ ہے

☆

یہ تازگی فضا میں ہوا کے علاوہ ہے
میرا سکوت میری صدا کے علاوہ ہے

آنے لگا ہے پیش ہمیں اُس کی بزم میں
اک مسئلہ جو تنگیِ جا کے علاوہ ہے

انکار ایک حیلہ و حجت سے ہے الگ
اک ردّ و قدح ناز و ادا کے علاوہ ہے

جو شام ہی سے رفع نہیں ہو رہی کہیں
پیچیدگی وہ بندِ قبا کے علاوہ ہے

ہم جو بھٹک رہے ہیں یہاں ایک عُمر سے
وہ سوز و ساز جُرم و سزا کے علاوہ ہے

یہ جو پڑے ہُوئے ہیں غلط راستے پہ ہم
سو بھی ہماری لغزشِ پا کے علاوہ ہے

اُلجھے ہُوئے جو رہتے ہیں اک دُوسرے سے لوگ
یہ اک نیا فساد خُدا کے علاوہ ہے

اک فاصلے سے دیکھیں اگر کائنات کو
رونق تو اصل ما و شما کے علاوہ ہے

اب تک تو اپنی ساری کلیمی یہاں، ظفرؔ
اک مُعجزہ ہے، اور، عصا کے علاوہ ہے

☆

رونے کا اختیار جو غم کے علاوہ ہے
سو بھی سہولیات بہم کے علاوہ ہے

گالی گلوچ میں جو کمی آئی ہے، سو، یہ
اُس کے تکلّفاتِ کرم کے علاوہ ہے

خدمت بھی کر رہے ہیں خُوشامد کے ساتھ ساتھ
یہ انتظام دام و درم کے علاوہ ہے

دل کو اُمید سی جو بندھائی ہے اُس نے ساتھ
یہ ظلم اُس کے جور و ستم کے علاوہ ہے

اب کیا مُطالبات محبت کا ہو شمار
تعداد یہ زیادہ و کم کے علاوہ ہے

بوسہ جو رکھ لیا ہے ضمانت کے طور پر
اُس شوخ کے یہ قول و قسم کے علاوہ ہے

سینے میں چل رہی ہے جو تلوار سی کہیں
ہر سانس ایک جُرعۂ سم کے علاوہ ہے

اک شور سا ہُوں پھیلا ہُوا شامِ شہر میں
ہونا مرا وُجود و عدم کے علاوہ ہے

ہم اُس کی بندگی سے بھی غافل نہیں، ظفرؔ
اپنا خُدا ہے، اور، صنم کے علاوہ ہے

☆

ویسے تو ہم بھیجتے ہیں اُس کو دن رات سلام
چڑیوں ہاتھ سندیسے ہیں اور کاگوں ہاتھ سلام

ہم تو نہیں سلام و پیام سے کوتاہی کر سکتے
دین اپنا تسلیم و رضا ہے ، اپنی ذات سلام

عرض نیاز سے باہر تو ہم کبھی نہیں جا سکتے
اپنا بیت سلامی والا ، اپنی بات سلام

سرِراہ بھی ہم یہ موقع ضائع نہیں کرتے ہیں
وہ جو نہیں لیتے ہیں ، لیتا ہے فٹ پاتھ سلام

اور اپنے پلّے ہی کیا ہے جو اُس تک پہنچائیں
اپنا تحفہ آنسو ہیں ، اپنی سوغات سلام

مقصد بس اتنا ہے کہ اُس کو یاد رکھا کرتے ہیں
کیک بھلا سا بھجوایا ہے ، اُس کے ساتھ سلام

کان لپیٹ کے اُسے جواب میں کہتا ہے وہ
دین محمد کو کرتا ہے ویناناتھ سلام

منت زاری سے ہی کام اپنا نکلے تو نکلے
ویسے بھی اب رہ گئی ہے اپنی اوقات سلام

مان لیا جس نے ہم کو کیا کہیے اُسے ، ظفرؔ
جو تسلیم نہیں کرتے ہیں اُن کو سات سلام

سچی بات کہیں ، اپنا تو گیا بے کار سلام
جس دن ہم نے کیا ہے اُس کو پہلی بار سلام

آگے کیا تحریر کریں ، پنسل پکڑے بیٹھے ہیں
ڈرتے ڈرتے لکھا ہے القاب ، اور ، پیار سلام

جُرم اقبال ہے بس اتنا سا ہی اُس کے بارے میں
کچھ گمنام خطوط ہیں اپنے ، اور ، دو چار سلام

تھوڑا موڈ بھی دیکھنا تھا ، اور ، رنگ ڈھنگ بھی اُس کے
یعنی ابھی نہیں کرنا تھا ملتے سار سلام

گرم جوش بھی ہو کر دیکھ لیا اُس کے آگے ، اب
چوم چاٹ کر رکھ لیں اُس کا ٹھنڈا ٹھار سلام

پلّے تو کچھ پڑا نہیں ، اب اندازہ ہی لگائیں
یہ اقرار سلام تھا اُس کا ، یا انکار سلام

جو ہو گا ، دیکھا جائے گا ، تھوڑی ہمت باندھیں
ڈال دیں آگے بڑھ کر اُس کے گلے میں ہار سلام

بات آگے کیا بڑھتی ، کوئی رستا ہی نہیں ملتا
بنا کھڑا ہے اپنے رستے کی دیوار سلام

پھر یہ موقع نہیں ملے گا ، سُستی چھوڑ ، ظفرؔ
محفل سے نکلا جاتا ہے ، اُس کو مار سلام

سارا سارا دن ہم ہیں ، اور ، یہ پرنام سلام
اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا ، اپنا کام سلام

ہم سے واقف تم جو نہیں ہو ، کوئی بات نہیں
اپنی گوت ہے جھکنے والی ، اپنا نام سلام

ہر چیز اپنے وقت پہ ہی اچھی لگتی ہے ، بھائی !
حال بتائیں گے پھر اپنا ، پہلے تمام سلام

اپنی مستی اور ہے ، اپنا نشہ اور طرح کا
پہلے دن سے پی رکھا ہے ہم نے جام سلام

خو اُس کی جیسی بھی ہے ، اُس کو معلوم ہے سب
لیکن ، پھر بھی ہم نے اُس پر کیا حرام سلام

جس نے ہمیں برباد کیا ، گاتے ہیں اُس کے گُن
صبح دعائیں دیتے ہیں کرتے ہیں شام سلام

ہمیں دیکھتے ہی پڑ گئے اُس کے ماتھے پر بل
اور ، ہمارے مُنہ سے نکلا صرف سلام سلام

ہم اپنی چادر سے باہر نکلے نہیں کبھی
صورت خاص تھی ، اُس کی ، لیکن اپنا عام سلام

سدا سلامت رہے ہمارے دشمن بھی ، ظفر
آخر تک اوقات ہماری رہی تمام سلام

☆

اپنی تو اب رہتی ہے سب سے ہی دعا سلام
جس نے ہمیں گالی دی ، اُسے بھی ہم نے کیا سلام

دے گا نہیں کبھی بھی ہماری بات کا کوئی جواب
لے گا نہیں کسی صورت بھی وہ بے حیا سلام

یہ بھی اچھا ہُوا کہ اُس نے بنڈل ہی نہیں کھولا
اوروں کی عرضیاں الگ تھیں ، اپنا جدا سلام

ہوتے ہوتے ہُوا اشارہ اپنا ہَوا میں گم
غیر کا اُس نے خوب دبوچا اُڑتا ہُوا سلام

پھول تھے اُس کے سامنے اوروں کے بھیجے ہوئے سب
موم بتیاں بن کر کوئی جلتا رہا سلام

حُسن ہی ایسا تھا ، سارے مبہوت رہ گئے لوگ
دہشت ہی اتنی تھی ، میرے ہاتھ سے گرا سلام

شاید یاد دلاتا ہو کچھ اُس کے آتے جاتے
بالکل سامنے والی پرچھتی پر پڑا سلام

تھوڑی بچت بھی شاید اُس دن اسی لیے ہو گئی
میں پہنچا تھا بعد میں ، مجھ سے پہلے گیا سلام

رائیگاں گئے پہلے تو سارے ہی سلام ، ظفر
ایک بار کر کے دیکھیں گے کوئی نیا سلام

☆

جہاں پہ تھا ہی نہیں، پھر وہاں سے غائب ہے
مرا ستارہ ترے آسماں سے غائب ہے

ضرور تھا مرا کردار بھی کوئی اس میں
جو میرا ذکر تری داستاں سے غائب ہے

وہ لگ رہا ہے بظاہر تو ہر جگہ موجود
مگر، پتا نہیں چلتا کہاں سے غائب ہے

جو ایک پھول کسی شاخ پر ہے ناموجود
تو اک پرندہ کسی آشیاں سے غائب ہے

اسی حساب سے پانی نہیں سمندر میں
کہ جس طرح سے ہوا بادباں سے غائب ہے

تلاش پھر بھی ہے جاری رکھی ہوئی میں نے
سراغ اس کا مرے ہر نشاں سے غائب ہے

ملی تو ہے کوئی محفوظ تر جگہ باہر
مکیں جو سوچ سمجھ کر مکاں سے غائب ہے

کہیں ہواؤں میں ہونے لگی ہے شکل پذیر
وہ شاعری جو زبان و بیاں سے غائب ہے

کہ آنے والے زمانوں میں جا کے ظاہر ہو
ظفرؔ اسی لیے شاید یہاں سے غائب ہے

☆

مجھے یقیں ہے، سراسر یقیں سے غائب ہے
جو آسمان کا ٹکڑا زمیں سے غائب ہے

ہے ایک بار ہمیں پھر اُس آستاں کی تلاش
نشانِ سجدہ جو اپنی جبیں سے غائب ہے

میں دیکھتا ہوں بلندی سے، اور، صورتِ شہر
کہیں کہیں پہ ہویدا، کہیں سے غائب ہے

یہ ایک رات میں آیا ہے انقلاب عجب
جہاں پہ تھی مری دُنیا وہیں سے غائب ہے

یہ راز کیا ہے کہ ہر رنگ و رونقِ ہستی
فقط ہمیں سے ہے ظاہر، ہمیں سے غائب ہے

ہے اجنبی وہ رہائش پذیر ہو کر بھی
یہ حال ہے کہ مکاں ہی مکیں سے غائب ہے

رہا ہے اپنا گزارہ سا رات دن جس پر
سو، وہ مہک بھی تو نانِ جویں سے غائب ہے

کہیں اثر ہے کسی اور کی حضوری کا
کہ اپنا آپ ہی اپنے تئیں سے غائب ہے

میں دل کا دودھ پلاتا رہا ہوں جس کو، ظفرؔ
کہیں وہ سانپ مری آستیں سے غائب ہے

☆

ترے [illegible] نہ میری دُعا سے غائب ہے
بلائے شہر خُود اپنی رضا سے غائب ہے

ہماری عرض تمنّا عبث نہ ہو کیوں کر
کہ اصل بات ہی جب مُدعا سے غائب ہے

فضا میں دیر سے خالی پڑا ہے خانۂ خواب
کہیں خیال کی خُوشبو ہوا سے غائب ہے

کچھ آرزو کے اندھیرے ہیں آشیانے میں
کچھ آب و تاب کی بجلی گھٹا سے غائب ہے

یہ شہر، شہر ہی لگتا نہیں ہے اُس کے بغیر
کوئی بتائے بغیر اس طرح سے غائب ہے

رُکاوٹ اس سے بڑی کیجیے، اور کیا ہو گی
کہ اب تو رنگ بدن ہی قبا سے غائب ہے

پڑھے گا کون یہاں عرضی و عبارت وصل
کہ تُجلک بھی ہے، اور، جا بجا سے غائب ہے

کسی بھی پل مُجھے آرام جو نہیں پڑتا
کوئی تو چیز تُمھاری دوا سے غائب ہے

پُکارتا بھی ہُوں اُس کو شبانہ روز، ظفرؔ
اور، اُس کا نام بھی میری صدا سے غائب ہے

٭٭٭

گلاب سا کہیں جیسے چمن سے غائب ہے
کوئی چراغ تری انجمن سے غائب ہے

ہم اہلِ خاک بھلا روئیں گے کہاں جا کر
کہ اب تو خاک بھی اپنی وطن سے غائب ہے

کوئی تو شے مری دیوانگی میں ہے حائل
کوئی تو چیز ترے بانکپن سے غائب ہے

ہے کوئی راز جو پوشیدہ ہے ابھی مُجھ سے
تو کوئی رنگ بہار بدن سے غائب ہے

کچھ اور چاہیے تدبیر اس اندھیرے کی
کہ اب تو چاند ہی سارا گہن سے غائب ہے

رہِ نیاز سے دُکھتے ہیں لوگ سر، ورنہ
اثر تو آج بھی سارے سُخن سے غائب ہے

کمی نہیں ہے کوئی اور تو یہاں بے شک
بس ایک فن ہے جو اربابِ فن سے غائب ہے

کچھ اور ہی کوئی اس کا جواز لائیے گا
کہ اب تو طرز بھی طرزِ کہن سے غائب ہے

درخت کرتے ہیں دن رات سائیں سائیں، ظفرؔ
وہ ایک مور جو باقی تھا، بَن سے غائب ہے

٭٭٭

چڑھاؤ پر جو ندی سی ، اترنے والی ہے
خیال کر ، کہ یہ رُت بھی گذرنے والی ہے

یہیں سے راہ پہ رُکنے کو ہے تھکا ہُوا وقت
کہ چلتے چلتے گھڑی اب ٹھہرنے والی ہے

یہ شام ڈوبنے والی ہے ماہِ سُرخ کے ساتھ
یہ رات اپنی ہواؤں سے بھرنے والی ہے

بُجھی ہے کیا مرے اندر کی آگ دم بھر میں
قریب و دُور کی ہر شے ٹھٹھرنے والی ہے

خُوشی کی لہر اچانک ہی آ گئی ہے جو آج
مجھے کچھ اور پریشان کرنے والی ہے

یہ دشتِ سادہ بدلنے کو ہے لباس اپنا
سراب سے کوئی صُورت اُبھرنے والی ہے

کیا تھا جمع جسے پار کر کے عرصۂ عُمر
ہماری خاک دوبارہ بکھرنے والی ہے

جو زندہ رکھے ہُوئے تھی جہاں تہاں مُجھ کو
وہ آرزو مرے اندر ہی مرنے والی ہے

یہ کہکشائیں اگر واپس آ رہی ہیں ، ظفر
تو کائنات بھی یہ کھیل ہرنے والی ہے

☆

مجھے ہی گھورتا رہتا ہے ، تھکنے والا ہے
نہ سانپ کوئی پلک ہی جھپکنے والا ہے

گھٹا میں کوندنے والی ہے نرم رَو بجلی
یہ آشیاں کسی لمحے چمکنے والا ہے

جو پھول باغ میں بے چین ہے دھڑکنے کو
تو میرے سینے میں دل بھی مہکنے والا ہے

اسی ہوا سے بکھرنے کو ہے یہ ابرِ خزاں
وہ ماہِ سبز دوبارہ دمکنے والا ہے

لرز رہے ہیں ستارے جو میری آنکھوں میں
تو آسمان سے آنسو ٹپکنے والا ہے

کسی کو بھی کوئی پھر یاد رکھ نہیں سکتا
یہ دل تجھے بھی اگر بھول سکنے والا ہے

وہاں کسی کی بھلا کیا ہو ملکیت کہ جہاں
کسی کی چیز کوئی اور اُچکنے والا ہے

یہ ایک پل کی چکاچوند بھی غنیمت جان
چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکنے والا ہے

کہانی کس نے سُنائی ہے دن کے وقت ، ظفر
جو راستے سے مُسافر بھٹکنے والا ہے

☆

کوئی خبر ہی نہیں ، کس زمانے والے ہیں
یہ جانے والے ہیں ، یا لوگ آنے والے ہیں

بُرا نہ مان کہ ہم تیرے آسماں پہ یہاں
گھڑی ہی بھر کے لیے جھلملانے والے ہیں

ہمیں زیادہ ترے دشت سے نہیں سروکار
کہ ہم تو اپنی ہی مٹی اُڑانے والے ہیں

کسی فضا کی طرح جگمگائے لگتے ہوئے
کسی ہوا کی طرح سرسرانے والے ہیں

کسی اناج کی خوشبو اُڑے گی چاروں طرف
ہو کھیتیاں سی کہیں لہلہانے والے ہیں

کوئی چمن ہے جسے یاد رکھ نہیں سکتے
کوئی بدن ہے جسے بھول جانے والے ہیں

قیاس کر نہیں سکتا کوئی ابھی اتنا
کہ رونے والے ہیں یا مُسکرانے والے ہیں

ہیں آپ اپنی ہی چوکھٹ پہ سر جھکائے ہوئے
کسی سے کم بھی نہیں ، آستانے والے ہیں

ہم اپنے عیب تو منوا چکے ہیں سب سے ، ظفر
اب ایک آدھ ہنر آزمانے والے ہیں

☆

ہمیں غرض نہیں مرنے کہ جینے والے ہو
یہی بہت ہے کہ اپنے قرینے والے ہو

مہک سنبھال کے رکھتے ہو یا نہیں اپنی
ہوا ہے تیزی بہت ، اور ، پسینے والے ہو

وطیرا جو کرتے ہو دن رات باہر اندر تُم
تمھیں خبر نہیں کیسے خزینے والے ہو

سوال بوسہ بھلایا نہیں گیا تُم سے
کہ تنگ دل ہو بہت ، اور ، کینے والے ہو

وطیرا نہیں ہے جہاں پانو بھول کر بھی کبھی
کچھ اس طرح کی محبت کے زینے والے ہو

ہمارے کام الگ ہیں ، مگر ، زیادہ نہیں
کہ ہم اُدھیڑنے ، اور ، آپ سینے والے ہو

جہانِ سنگ سے بے وجہ ڈر رہے ہو کہ تُم
ہماری طرح کوئی آبگینے والے ہو

ظفر ، بجا ہے کہ دیوار خستہ ہو ، لیکن
یہ شُبہ ہے ، کسی نُخیہ دفینے والے ہو

ظفر ، تمھارے لیے ڈوبنا ہے کیا مُشکل
خُدا کے فضل سے تُم تو سفینے والے ہو

☆

نہیں رکھنے ، کسی میں سمونے والا ہوں
جہاں نہیں ہوں ، وہیں آج ہونے والا ہوں

ڈھلی ہے شام ، ترے خواب دیکھنے کے لیے
لگا ہُوا ہوں ترے ساتھ ، سونے والا ہوں

میں اپنے آپ کو ، ایک آبشار کے نیچے
بہُت ہی میلا کچیلا ہوں ، دھونے والا ہوں

تلاش کیجیے گا مجھ کو شہر سے باہر
اگرچہ شہر کے اندر ہی کھونے والا ہوں

بھلا اُسے کوئی زحمت ابھی میں کیا دوں گا
ابھی تو وصل کے آدھے بچھونے والا ہوں

میں تاب لا نہیں سکتا ہوں تیز بارش کی
ابھی تو اک ذرا کپڑے بھگونے والا ہوں

اگر تمھارے زر و سیم تک پہنچ ہے مری
تو چاندی والا ہوں میں اور سونے والا ہوں

زیادہ فرق نہیں دونوں حالتوں میں کوئی
کہ ہنسنے والا ہوں میں یا کہ رونے والا ہوں

ظفر ، یہ خاک تو کچھ اس قدر نہیں زرخیز
مگر ، یہاں میں کوئی بیج بونے والا ہوں

☆

وہیں پہ رہ گیا فقرہ جو کہنے والی تھی
ہنسی نہیں تھی ابھی ، اور ، پھنسنے والی تھی

اُسے تو چھوڑیے ، اُس کی تو بات ہی کیا ہے
یہ طبع اپنے لیے بھی ترسنے والی تھی

ہمیں ہی پیش تھی عُجلت کوئی ، کہ وہ انجیر
ابھی کچھ اور ، بہُت اور رسنے والی تھی

ہے سُرخرو مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر
شروع میں وہی ناگن جو ڈسنے والی تھی

فلک سے ایک فلک اور ابھی نکلنا تھا
زمیں زمین کے اندر ہی دھنسنے والی تھی

جہاں کھنڈر سے نظر آ رہے تھے چاروں طرف
وہیں کہیں کوئی بستی سی بسنے والی تھی

یہ لوگ دیر سے بارش کے انتظار میں تھے
جب آسمان سے مٹی برسنے والی تھی

کہاں کا جلوۂ گُل ، اور ، کدھر کی سیرِ چمن
وہاں تو بادِ صبا ہی جھُلسنے والی تھی

میں رو پڑا تھا جو بے اختیار ، سُن کے ، ظفر
دراصل بات کوئی خاص ہنسنے والی تھی

☆

میں روکتا نہیں آگے نکلنے والوں کو
نہ ٹوکتا ہوں کبھی ساتھ چلنے والوں کو

وہ خود کہے گا کہ گرنا ہی ان کا بہتر تھا
جو دیکھے آن کے اپنے سنبھلنے والوں کو

میں سوچتا رہا دل سب کا اپنا اپنا ہے
میں دیکھتا رہا رستہ بدلنے والوں کو

کچھ اور ہی کسی سانچے میں ڈھالنا ہے مجھے
کچھ اور ہی کسی سانچے میں ڈھلنے والوں کو

زمین سے بھی کوئی رابطہ ضروری ہے
بتاؤ باغِ ہوا میں ٹہلنے والوں کو

اب اور ہی کوئی ترغیبِ تازہ ہے درکار
بیانِ بوسۂ لب سے بہلنے والوں کو

کہ فی زمانہ پشیماں بھی کون ہوتا ہے
بُرا کہو نہ بہُت ہاتھ ملنے والوں کو

خرامِ موجِ صبا سے بھی فرق پڑتا کیا
یہاں خود اپنے ہی اندر اُبلنے والوں کو

میں حاسدوں کی بدولت ہی جی رہا ہوں، ظفر
خدا اماں میں رکھے اپنی، جلنے والوں کو

☆

اپنی محنت، اپنے خون پسینے والی
کہاں گئی وہ صرف مرنڈا پینے والی

دل میں بھی ہر عکس جھلک جاتا ہے کم کم
خصلت ایک اس میں بھی ہے آئینے والی

پتھر کا پیکر تھا وہ سارا ہی، لیکن
کہیں کہیں تھی کیفیت پشمینے والی

تھی چٹخارے دار امی کی چٹنی جیسے
اور، اوپر سے خوشبو وہ پودینے والی

سامنے سے ہی کوئی آ کر ٹکرایا تھا
اور یہ سیدھی چوٹ لگی تھی سینے والی

ڈوب کے ہی مرنا ٹھہرا تو آ سکتی ہے
ساحل میں بھی کوئی بات سفینے والی

جیسے تیسے اک دھکّے کی مار ہے اب تو
دل کی یہ کہنہ دیوار دفینے والی

دنیا میں آ کر جیتے تو سب ہیں، لیکن
بات بھی ہونی چاہیے کوئی جینے والی

گھر میں اب تو ہے درکار، ظفر، مدت سے
کوئی اُدھیڑنے والی، کوئی سینے والی

☆

ایک اُداسی گلشن میں پھیلانے والا
پھول یہ کھلنے سے پہلے مُرجھانے والا

روکیں گے تو شاید رُک بھی جائے آخر
پہلے آ تو چکے وہ جلدی جانے والا

ہمیں کہیں موجود ہے، آ نکلے گا اک دن
سیب کھلا کر کوسا دُودھ پلانے والا

کہاں سے آئی تھی، کس نے پھیلائی آخر
بے خبرا تھا آپ خبر پھیلانے والا

جس کے استقبال کو بیٹھا ہُوا ہُوں کب سے
شاید آ بھی چکا ہو شاعر آنے والا

میرا دھیان تھا اور کسی جانب، اتنے میں
خود ہی بہک گیا مُجھ کو بہکانے والا

ایک چیز پہ بے ایمان ہو گیا ہے، دیکھو
مُجھے مری ساری اشیا لوٹانے والا

اچھی نہیں ہے اس پہ اتنی حال دُہائی
واپس بھی تو آ سکتا ہے جانے والا

مُجھے، ظفر، انعام کا لالچ بھی تھا، لیکن
لگا ہے اچھا کام یہی جُرمانے والا

☆

ڈوبنے والے تھے یا پار اُترنے والے
الگ الگ تھے جینے والے، مرنے والے

نیکی بھی کر کے دریا میں پڑی ڈالنی
اچھے رہ گئے کوئی کام نہ کرنے والے

نیند کے نئے مُسافر کہاں سے آ نکلے تھے
کون تھے وہ، اور، کس کے پاس ٹھہرنے والے

کب سے دیکھ رہے ہیں کسی ہوا کا رستا
سُوکھے پتے ہیں، اور، کہیں بکھرنے والے

آسمان کی حالت یُوں ہی رہے گی کچھ دن
اور، زمیں کے زخم نہیں ہیں بھرنے والے

سامنے سے بھی گذرا کریں گے رفتہ رفتہ
میرے گھر کے پچھواڑے سے گذرنے والے

کبھی نڈر لوگوں کو بھی مُشکل لگتا ہے
کام یہاں جو کر جاتے ہیں ڈرنے والے

رات ہے، اور، کئی راتوں میں ڈوبنے والی
رنگ ہیں، اور، کسی منظر سے اُبھرنے والے

کام، ظفر، اپنے بھی عجب ہیں، دیکھتے رہنا
ایک ہی ساتھ بگڑنے، اور، سنورنے والے

☆

خود بھی موجود ہیں، امکاں بھی کسی اور کا ہے
کیا مُسافر ہیں کہ ساماں بھی کسی اور کا ہے

اپنا کردار جہاں ڈھونڈ رہا ہُوں، یہ تو
داستاں ہی نہیں، عُنواں بھی کسی اور کا ہے

زندگی کی یہ ضرورت بھی نہیں تھی میری
مر رہا ہُوں تو یہ احساں بھی کسی اور کا ہے

سیر کرتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں، مگر
باغ بھی، اور، بیاباں بھی کسی اور کا ہے

نام لیتا وہاں کیا کوئی ہمارا کہ جہاں
کام دیکھو تو نمایاں بھی کسی اور کا ہے

فکر ہے خاطر و خدمت کی ہمیں کیوں اُس کی
رات کی رات جو مہماں بھی کسی اور کا ہے

صرف پانی ہی پرایا نہیں اپنا اب کے
اپنے دریا میں یہ طوفاں بھی کسی اور کا ہے

ہم نے دعوے تو بہُت باندھ رکھے ہیں، لیکن
دل بھی اپنا نہیں، ارماں بھی کسی اور کا ہے

چھپتے پھرتے ہیں زمانے کی نگاہوں سے، ظفر
جیسے یہ پردۂ عُریاں بھی کسی اور کا ہے

-☆-

ابھی میں ہی نہیں، گھر بھی کسی اور کا ہے
اور، یہ بوریا بستر بھی کسی اور کا ہے

میرا اپنا تو یہاں کُچھ بھی نہیں ہے شاید
صرف سودا ہی نہیں، سر بھی کسی اور کا ہے

میں یہ کپڑے جو کسی اور کے پہنے ہُوئے ہُوں
ایسے لگتا ہے کہ پیکر بھی کسی اور کا ہے

سانس لینے کو ہوا بھی نہیں اپنی، کہ یہاں
ڈوبنا ہو تو سمندر بھی کسی اور کا ہے

صرف آنکھیں مری اپنی ہیں ابھی تک، ورنہ
خواب اس خواب سے باہر بھی کسی اور کا ہے

ایک بار اور کسی کا ہے یہ سارا کُچھ تو
یاد رکھنا کہ مکرّر بھی کسی اور کا ہے

ہے کسی اور کی رونق مرے باہر کی طرف
شور برپا مرے اندر بھی کسی اور کا ہے

کھا رہا ہُوں میں زمانوں سے کسی اور کا رزق
میرے حصّے کا مقدّر بھی کسی اور کا ہے

اپنے احوال پہ یہ سوچ کے خُوش ہُوں کہ ظفر
یہ جو نکلا ہے کچُومر بھی کسی اور کا ہے

-☆-

خون میں خواب ہمارے، تیرے
یہ فسادات ہیں سارے تیرے

دل کی بے رنگ فضا میں دن بھر
اُڑتے رہتے ہیں غبارے تیرے

میرے تاریک فلک پر کس رات
جھلملائیں گے ستارے تیرے

یاد رکھتا ہوں ارادہ اپنا
بھول جاتا ہوں اشارے تیرے

کیا بیاباں ہوا تھا جس میں
راستے ہم نے گزارے تیرے

کبھی واجب تھے ہمیں پر دراصل
ہم نے جو قرض اُتارے تیرے

بدگمانی ہوئی پانی سے ذرا
اور، الگ ہو گئے دھارے تیرے

ڈوبتا ہے یہیں آ کر اک دن
چوم لیتا ہوں کنارے تیرے

وہی پکڑا گیا، جلسے میں، ظفر
جو لگاتا رہا نعرے تیرے

☆

رنگ تھوڑا سا ہے کالا تیرا
اور، زیادہ ہے اُجالا تیرا

اک ہوا ہی نہیں اُونچی تیری
کام بھی ہے بہت اعلیٰ تیرا

دُور رہتا ہے جو خود بھی تجھ سے
ہے کوئی چاہنے والا تیرا

پاس چابی نہیں اپنے، اور، ہم
توڑ سکتے نہیں تالا تیرا

لوٹ آنے کے سوا کیا کرتے
بہت اُونچا تھا ہمالہ تیرا

بات کوئی بھی، کسی کی بھی ہو
آ ہی جاتا تھا حوالہ تیرا

تھے تو بے چارہ و مجبور، مگر
حکم ہم نے نہیں ٹالا تیرا

دل میں رہتی تھی چبھن سی ہر دم
ہم نے کانٹا ہی نکالا تیرا

تھے تو جیسے بھی، ترے بعد، ظفر
کام ہم نے ہی سنبھالا تیرا

☆

غنیمت اس کو سمجھ لو کہ رات آخری ہے
تمھاری اور مری ملاقات آخری ہے

کچھ اس پہ غور اگر کر سکو کسی صورت
کہ بات پہلی نہیں ہے، یہ بات آخری ہے

تمھارے طرزِ تغافل کا خاتمہ ہے کہیں
نہ اب یہ سلسلۂ التفات آخری ہے

اخیر ہونے ہی والا ہے یہ سفر اس بار
کسی کے ہاتھ میں اپنا یہ ہاتھ آخری ہے

ہمارے ساتھ ہی جائے گا شورِ شہر کہ یہ
ہوائے ہمہمۂ حادثات آخری ہے

یہ سنسنی کسی اُلجھن سے دور تھی پہلے
یہ تھرتھری کسی آہٹ کے ساتھ آخری ہے

کسے خبر ہے کہ اب سرحدِ تماشا پہ
رُکی ہوئی یہ مری ایک ذات آخری ہے

مجھے تو خود بھی کئی بار یہ ہوا محسوس
کہ اب یہ میری حدِ ممکنات آخری ہے

کوئی خلافِ توقع تھا میرا قتل، ظفر
نہ اس نواح میں یہ واردات آخری ہے

☆

بہار آخری ہے، انتظار آخری ہے
وہ معتبر ہے، مگر، اعتبار آخری ہے

ہم اپنے ہاتھ سے جیسے نکلنے والے ہیں
ہمارا خود پہ یہی اختیار آخری ہے

یہ آبِ خواب ہے مہمان اب کوئی دن کا
یہ بے کنار ہے یا ہمکنار، آخری ہے

بس اپنا کام دکھانے کو ہے کہیں، کہ یہ دل
بدن کے خانۂ خس میں شرار آخری ہے

اب آگے اس سے بہت باغ و راغ ہیں ہر سمت
کہ زندگی کا یہی ریگ زار آخری ہے

ابھی تو رہنا ہے دریا کے درمیاں یہ سفر
کہ آر آخری ہے اور نہ پار آخری ہے

ہوئے ہیں فارغ ابھی آخری محبت سے
جو ایک بار نہیں، بار بار آخری ہے

معاملہ مرا جس سے بھی ہو، یہ لگتا ہے
کہ آدمی یہی ایماندار آخری ہے

ہمارے دل میں یہ رونق ابھی رہے گی، ظفر
کہ اضطراب نہ یہ اضطرار آخری ہے

☆

خیال آخری ہے یا گمان آخری ہے
جو لکھ سکو تو ہمارا بیان آخری ہے

اب اس کے بعد نظر آئے گا کنارۂ عرش
ہمارے سامنے یہ آسمان آخری ہے

پروں کو جیسے زمیں پر ہی چھوڑ آیا ہوں
کہ وقت کم تھا بہت ، اور اُڑان آخری ہے

کئی دنوں سے توجہ ہے موت کی مجھ پر
سو ، لگ رہا ہے کہ یہ مہربان آخری ہے

پہاڑ کاٹ لیے ہم نے بے وفائی کے
ہمارے راستے کی یہ چٹان آخری ہے

جو اہلِ وضع ہیں سورج کی راہ مت روکیں
کہ اپنے سَر پہ یہی سائبان آخری ہے

اب آئے یا نہ کوئی بندۂ خدا آئے
یہ دشتِ خواب میں اپنی اذان آخری ہے

بجا ہے میں کبھی اس تک اگر پہنچ نہ سکوں
کہ ہے تو بس یہی اُس کا نشان آخری ہے

حصارِ اہلِ زباں میں گھرا ہُوا ہے ظفر
اور اُن کے بیچ میں یہ بے زبان آخری ہے

☆

اُمید آخری ہے ، احتمال آخری ہے
کسی کے آگے ہمارا سوال آخری ہے

مرے حساب سے باہر ہے ٹوٹنا دل کا
تری طرف سے بھی یہ دیکھ بھال آخری ہے

اب اس کے بعد میں ہو جاؤں گا غبار میں گم
مرے لیے یہ عروج و زوال آخری ہے

کوئی تو سال ہو عمرِ عزیز کا ایسا
میں کہہ سکوں جسے خود بھی ، یہ سال آخری ہے

ہماری موت کا غم تازہ ہے ابھی ، ورنہ
کسی کے چہرے پہ رنگِ ملال آخری ہے

ہے اُس کے پاس بھی موقع یہ بچ نکلنے کا
خلاف اُس کے ہماری بھی چال آخری ہے

اسے کبھی نظرانداز کر نہیں سکتا
وہ جانتا ہے کہ یہ عرضِ حال آخری ہے

اب اس کے بعد کوئی سوچ ہے نہ کوئی سمجھ
یہ خواب آخری ہے ، یہ خیال آخری ہے

جو کر رہا ہوں کسی اور کا ہے کام ، ظفر
عجیب تر ہی نہیں ، یہ مثال آخری ہے

☆

مقام آخری ہے، اور، قیام آخری ہے
سب انتظار میں ہیں، انتظام آخری ہے

پھر اُس کے بعد مرے اُس کے راستے ہیں جدا
پڑا ہُوا ہے جو اُس سے وہ کام آخری ہے

کسی ذریعے سے پہنچا سکیں اگر اُس کو
پیام آخری ہے، یہ سلام آخری ہے

جو داغ بوسہ پہ خُود ہی نہیں ہُوا آزاد
وہ شہر بھر میں تُمھارا غُلام آخری ہے

زمیں رُکی ہُوئی ہے، اور، پھٹا ہُوا ہے فلک
دن اور سمت میں ڈوبا ہے، شام آخری ہے

کچھ اب کے شہر میں ترتیب ہی نہیں رہی وہ
کہ سب سے پہلے جو آتا تھا نام، آخری ہے

بچا کُھچا ہے یہی گنجِ گُہر ہی مرے پاس
اُٹھا سکو تو یہ فیضانِ عام آخری ہے

چلے گی اب تو نئی ہی کوئی ہوائے سخن
روایتی سا یہ طرزِ کلام آخری ہے

کھلی ہی رکھتا ہوں آنکھیں، یہ جانتا ہوں، ظفر
کہ رنگِ باغ تماشا تمام آخری ہے

☆

رُکا ہُوا ہی سہی، انقلاب آخری ہے
یہ میری شاخِ نظر پر گُلاب آخری ہے

جو یہ نہ ہو تو کوئی راستا نہیں باقی
کہ بند ہوتا ہُوا بابِ خواب آخری ہے

کوئی شگون سفر بھی ہے منتظر اس کا
کہ موجِ دل میں جو ہے پیچ و تاب، آخری ہے

ہوائے تازہ اُٹھانے کو ہے کبھی پردے
یہ لگ رہا ہے کسی کا حجاب آخری ہے

یہ انتظار قیامت سے کم نہیں، لیکن
بھٹک ہی جائے گا دل، یہ عذاب آخری ہے

دکانِ شوق بڑھانے سے پیشتر کر لیں
کہ یہ ہمارا تُمھارا حساب آخری ہے

سوال کرنے سے اب روک بھی دیا ہے مجھے
یہی نہیں ہے کہ اس کا جواب آخری ہے

مکمل اب ہُوا لاشاعری کا دین، سو، اب
کچھ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب آخری ہے

پھر اس کے بعد اندھیرے ہیں، اور، ہم ہیں، ظفر
ہمارے سر پہ کوئی آفتاب آخری ہے

☆

یوں بھی ہوتا ہے کہ یک دم کوئی اچھا لگ جائے
بات کچھ بھی نہ ہو، اور، دل میں تماشا لگ جائے

ہم سوالات کا حل سوچ رہے ہوں ابھی تک
اور، ماتھے پہ محبت کا نتیجہ لگ جائے

ابھی دیوار اٹھائی بھی نہ ہو دل کی طرف
لیکن اس میں کوئی در، کوئی دریچہ لگ جائے

کیا ستم ہے کہ وہی دور رہا ہو تم سے
اور، اُسی شخص پہ الزام تمھارا لگ جائے

پوری آواز سے اک روز پکاروں تجھ کو
اور، پھر میری زباں پر ترا تالا لگ جائے

اور تو اس کے سوا کچھ نہیں امکان کہ اب
میرے دریا میں کہیں تیرا کنارہ لگ جائے

میں نے اور دل نے اسی باب میں سوچا ہے کہ ہم
کام کچھ بھی نہ کریں، کوئی وظیفہ لگ جائے

کیا تماشا ہے کہ باقی ہو سمندر کا سفر
اور ساحل سے کسی روز سفینہ لگ جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ اس کارگہِ دل میں، ظفر
کام کوئی کرے، اور، نام کسی کا لگ جائے

☆

ہم اپنے پاس بیٹھیں یا تمھارے ساتھ جائیں
یہ وہ دریا نہیں جس کے کنارے ساتھ جائیں

ہمارے سامنے بھی ہے سفر لاحاصلی کا
نہیں جانا کہیں جن کو، ہمارے ساتھ جائیں

محبت کی مسافت ہے، پگھل جانے کا ڈر بھی
جو ایسی دھوپ میں کچھ برف پارے ساتھ جائیں

ہوائیں کر رہی ہوں پانیوں کی پاسبانی
سفینے جس طرف نکلیں، ستارے ساتھ جائیں

تماشا تو کچھ ایسا دیکھنے والا نہ ہو گا
مگر، بہتر ہے یہ سارے کے سارے ساتھ جائیں

جو کاٹی ہیں پریشانی کی راتیں پاس رہ کر
تو خوش وقتی کے یہ دن بھی گزارے ساتھ جائیں

حسابِ خواب ہم نے بھی لگانا ہے پہنچ کر
سو، ہر صورت ہمارے گوشوارے ساتھ جائیں

یہ دیواریں یہیں پہ چھوڑ کر جانا ہے آخر
کہ یہ ممکن نہیں ہوتا سہارے ساتھ جائیں

ظفر، تنہا وہ جاتا ہے تو جائے، کیا ابھی تک
ضروری ہے کہ ہم بھی مارے مارے ساتھ جائیں

☆

وصل کا رنگ جمایا نہیں جاتا مجھ سے
یہ وہ کھانا ہے جو کھایا نہیں جاتا مجھ سے

لیے پھرتی ہے مجھے کاٹ کے ٹکڑوں میں ہوا
میں وہ بادل ہوں کہ چھایا نہیں جاتا مجھ سے

آ گئی ہے مری خصلت میں کمی سی کوئی
کبھی رویا، کبھی گایا نہیں جاتا مجھ سے

عذر معقول سہی اُس کے نہ آ سکنے کا
پھر بھی، چل کر وہاں جایا نہیں جاتا مجھ سے

میں کسی اور کا دمساز ہوں گا کیوں کر
بوجھ اپنا ہی اُٹھایا نہیں جاتا مجھ سے

اب ہوں دشمن کے ہی میں رحم و کرم پر آخر
اب کوئی وار بچایا نہیں جاتا مجھ سے

جانتا ہوں، اسی باعث مری گمنامی ہے
ایک پردہ جو ہٹایا نہیں جاتا مجھ سے

پھر، اسی طرح سے بے دخل مجھے کر دیں گے
اب نیا شہر بسایا نہیں جاتا مجھ سے

شعر کہنا بھی عجب ایک مصیبت ہے، ظفر
اور، کہہ لوں تو سنایا نہیں جاتا مجھ سے

-☆-

ہاتھ اُس شوخ پہ ڈالا نہیں جاتا مجھ سے
کام اپنا بھی نکالا نہیں جاتا مجھ سے

درد کو جوش تو دیتا ہوں میں، لیکن، اس کو
دودھ کی طرح اُبالا نہیں جاتا مجھ سے

خوش دلی میری مرے ساتھ ہی رہتی ہے، مگر
رنگ وہ روٹھنے والا نہیں جاتا مجھ سے

اپنی صحت کا رکھوں اور بھی کچھ خاص خیال
روگ اب اور یہ پالا نہیں جاتا مجھ سے

اپنی اوقات بھی معلوم ہے مجھ کو، لیکن
حکم بھی آپ کا ٹالا نہیں جاتا مجھ سے

بات وہ ہے کہ ہوئی اپنی حدوں سے باہر
کام وہ ہے کہ سنبھالا نہیں جاتا مجھ سے

زور کرتے ہیں اندھیرے تو ہر اک جانب سے
رات بھر تیرا اُجالا نہیں جاتا مجھ سے

اپنی ہستی کی ہواؤں سے لرزتا ہوں ابھی
یہ نہ ہونے کا حوالہ نہیں جاتا مجھ سے

یوں تو پانی پہ تسلط مرا قائم ہے، ظفر
لہر کو اور اُچھالا نہیں جاتا مجھ سے

-☆-

بوجھ اُٹھا کر یہ سدھارا نہیں جاتا مجھ سے
اور، سر سے بھی اُتارا نہیں جاتا مجھ سے

پاس تھا وہ تو اُسے چوم نہیں سکتا تھا
دُور ہے اب، تو پکارا نہیں جاتا مجھ سے

اُس کے ہونے سے بھرا رہتا ہوں دن رات اگر
جائے بھی وہ تو دوبارہ نہیں جاتا مجھ سے

ایک وہ عُمر کہ میں جس کو گزار آیا ہوں
ایک یہ دن کہ گزارا نہیں جاتا مجھ سے

چھوڑتے جاتے ہیں یُوں تو مجھے سب فکر و خیال
ایک یہ خواب تمھارا نہیں جاتا مجھ سے

گرد کی طرح پڑا رہتا ہوں تصویر پہ میں
نقش کوئی بھی نکھارا نہیں جاتا مجھ سے

شام سے ٹوٹنے لگتے ہیں ستارے مجھ میں
رات بھر ایک نظارہ نہیں جاتا مجھ سے

بے دلی پہلے ہی لوگوں میں ہے کچھ، اور، اُن کو
کچھ بغاوت پہ اُبھارا نہیں جاتا مجھ سے

کہیں جاتا ہی نہیں شوقِ ملاقات، ظفر
اور، جائے بھی تو سارا نہیں جاتا مجھ سے

☆

کیا کروں، شورِ شیشہ نہیں جاتا مجھ سے
موت کے بعد بھی جینا نہیں جاتا مجھ سے

دُوسروں کے ہی تصرّف میں رہے گا مرا حق
آگے بڑھ کر جو یہ چھینا نہیں جاتا مُجھ سے

ایک مدّت سے محبت ہُوئی مقصود، مگر
ابھی اُس کا یہ قرینہ نہیں جاتا مُجھ سے

پانو دھرتا ہے کوئی جس پہ بڑے ناز کے ساتھ
دِل کے اندر کا یہ زینہ نہیں جاتا مُجھ سے

دو گھڑی کی ہے محبت کی مشقت، لیکن
کیوں کئی روز پسینا نہیں جاتا مُجھ سے

دم تو بھرتا ہُوں بہت اُس کی محبت کا، مگر
پھر بھی، اُس کے لیے کینہ نہیں جاتا مُجھ سے

یُوں تو درویش خدا مست ہُوں، لیکن، پھر بھی
کبھی کھانا، کبھی پینا نہیں جاتا مُجھ سے

خوابِ ہستی سے جو کُھلتی نہیں آنکھیں میری
نیند کا نرم خزینہ نہیں جاتا مُجھ سے

ہے، ظفر، ایک یہی میری حفاظت کا حصار
ہالۂ ماہِ مدینہ نہیں جاتا مُجھ سے

☆

کفر ایسا ہے کہ تولا نہیں جاتا مجھ سے
بولنا چاہوں تو بولا نہیں جاتا مجھ سے

بات سنتا ہے نہ کرتا ہے کبھی مطلب کی
بند اتنا ہے وہ، کھولا نہیں جاتا مجھ سے

گم ہوا ہے مرے اندر کے اندھیروں میں کہیں
اس طرح سے کہ ٹٹولا نہیں جاتا مجھ سے

پتیاں ریشمی، اور، نرم کنارے اُس کے
نازک ایسا ہے، مدھولا نہیں جاتا مجھ سے

یہ تغافل ہے مجھے لطف و کرم سے بھی عزیز
شہد اس زہر میں گھولا نہیں جاتا مجھ سے

ابر کی طرح برستی ہیں یہ آنکھیں لیکن
مسکراہٹ کا یہ شعلہ نہیں جاتا مجھ سے

ہیں خزینے تو کئی اور بھی پوشیدہ، مگر
پس ملبوس پھرولا نہیں جاتا مجھ سے

متزلزل نہیں کرتی مجھے شہوت کی ہوا
قائم ایسا ہوں کہ ڈولا نہیں جاتا مجھ سے

کس طرح کھاؤں، ظفر، اس کی تمنا کا فریب
یہ چھوہارا جو پپولا نہیں جاتا مجھ سے

☆

یوں تو جینے کا جھمیلا نہیں جاتا مجھ سے
کھیل اب اور یہ کھیلا نہیں جاتا مجھ سے

مجھ کو بھی ساتھ ہی لے جائے گا، جب جائے گا
رنگِ رسوائی اکیلا نہیں جاتا مجھ سے

دل کے میدان میں اک بھیڑ لگی رہتی ہے
یہ تمناؤں کا میلا نہیں جاتا مجھ سے

خواہشِ وصل پہ قابو نہیں چلتا میرا
اونٹ یہ آج نکیلا نہیں جاتا مجھ سے

اب تو پانی بھی زیادہ نہیں گہرا اس کا
پھر بھی ٹٹو یہاں ٹھیلا نہیں جاتا مجھ سے

چار و ناچار یہاں تک اسے لے آیا ہوں
وقت کو اور دھکیلا نہیں جاتا مجھ سے

میری توفیق ہے پیچھے تو ہدف ہے آگے
دُور یہ اور غلیلہ نہیں جاتا مجھ سے

فالتو ہی سہی اس جسم کی بوتل میں لہو
یہ سڑک پر بھی انڈیلا نہیں جاتا مجھ سے

سبھی رخصت ہوئے جو خواب پرانے تھے، ظفر
یہ نیا اور نویلا نہیں جاتا مجھ سے

☆

اس کو گلاب رُوپ ہو یا شراب رنگ
دیکھو جو غور سے تو یہ دُنیا ہے خواب رنگ

ہر شے میں ہے ملی ہُوئی ایک اور چیز بھی
شامل ہے ہر خوشی میں کوئی اضطراب رنگ

ہیں کُچھ دنوں سے شام کے اطوار ہی کُچھ اور
اور دُھوپ بھی رہی نہیں وہ آفتاب رنگ

مٹی میں بھی ملے گی نہ پہلی سی وہ چمک
پانی بھی ہونے والا ہے سارا سراب رنگ

ہستی کا اعتبار بھی ہے ، اور ، نہیں بھی ہے
ہے سانس پر مدار ، سو ، وہ بھی حباب رنگ

نیّت کا ، اور ، نظر کا ہے سارا مُعاملہ
اچھا ہے اس جہاں میں نہ کوئی خراب رنگ

دُنیا کے اور سارے سبق بھول جائیں گے
پڑھیے اگر کبھی کوئی چہرہ کتاب رنگ

اب تو دُکانداریاں ہیں اپنے ہر طرف
ہے رفتہ رفتہ حُسن بھی کوئی حساب رنگ

تھا اس دفعہ تو اُس کی مُلاقات پر ، ظفر
چھایا ہُوا کُچھ اور طرح کا حجاب رنگ

☆

حسیں   کئی دنوں سے جو ہیں میری شام رنگ
کیا جانے کِس طرف کو گئے ہیں تمام رنگ

آنا تھا جن کو ، آ نہ سکے ، اور ، دُور تک
پھیلا ہُوا تھا چاروں طرف انتظام رنگ

اب جس قدر بھی طائرِ دل ہوشیار ہو
کیا بچ سکے کوئی جہاں دانہ ہو دام رنگ

انجام تو خبر نہیں کیا ہو ، مگر ، یہاں
آغازِ کار ہی میں ہے ایک اختتام رنگ

یہ کیا کہ اُس سے اپنی مُلاقات بھی ہُوئی
اور ، دل سے دُور تر ہی رہا شاد کام رنگ

کِس سمت سے چڑھا ہے ، مُجھے کُچھ خبر نہیں
جس چاند نے دیے ہیں یہ دیوار و بام رنگ

اچھا ہُوا کہ پہلی ہی بارش میں ڈھل گیا
دل پر چڑھا ہُوا تھا کِسی کا جو خام رنگ

بیکار بیٹھنا بھی مشقت سے کم نہیں
اپنے لیے تو ہے یہ فراغت بھی کام رنگ

اُلجھے ہُوئے جو خاص طریقوں میں ہیں ، ظفر
وہ کیا ہُوا جو آپ کا ہوتا تھا عام رنگ

☆

اُسے خیال ہو میرا، مرا خیال نہیں
کہ بڑھ کے اس سے کوئی بے تکا خیال نہیں

یہ خواب سا جو بدن سے گزرتا رہتا ہے
کچھ اس خیال سے اپنا جدا خیال نہیں

جو سوچیے تو کئی رنگ سے بکھرنے لگیں
کہ اس طرح کا کوئی دوسرا خیال نہیں

ملا جُلا تو کرو، پاس اگر نہیں رہتے
کہ یوں بھی ٹھیک ہے، یہ بھی بُرا خیال نہیں

یہ دونوں اپنی روانی میں چلتے رہتے ہیں
نہیں خیال ہُوا، اور ہُوا خیال نہیں

وہ ایک پھول جو دل میں مہکتا رہتا ہے
ہو شاید اور ہی کچھ، آپ کا خیال نہیں

کٹے گا سارا سفر کاٹنے سے ہی اب تو
ہے اور ہی کوئی شے، راستا خیال نہیں

یہ باندھنے سے کم و بیش ہو تو ہو، ورنہ
کچھ اپنی ذات میں کوئی بڑا خیال نہیں

اسی خیال کی شکلیں ہیں بے شمار، ظفر
وگرنہ یہ کوئی بدلا ہُوا خیال نہیں

☆

میں سانس لیتا ہوں، لیکن، ہوا بھی ہے کچھ کیا
یہ شہر روشنیوں کے ہوا بھی ہے کچھ کیا

کہیں پہنچ ہی نہ پاؤں تو کیا تعجب ہے
میں چل رہا ہوں، مگر، راستا بھی ہے کچھ کیا

خلا ہے، اور، ستارے جھلکتے پھرتے ہیں
سکوت ہے جو یہاں پر، صدا بھی ہے کچھ کیا

یہ حال اور ابھی کتنا خراب ہونا ہے
وہ جانتا ہے، مگر، سوچتا بھی ہے کچھ کیا

دعا سے کام چلائیں گے عشق میں کب تک
کسی سے پوچھیے، اس کی دوا بھی ہے کچھ کیا

تمام رنگ بدن ہی تو ہو نہیں سکتا
کہ شامل اس میں یہ رنگِ قبا بھی ہے کچھ کیا

یہاں تو ایک اشارے سے بات بنتی ہے
روا تو ہے ہی، مگر، ناروا بھی ہے کچھ کیا

ظفر، تلاش ہے فرض، اور، تم ہو فرض شناس
سو، کب سے ڈھونڈ رہے ہو، ملا بھی ہے کچھ کیا

رہا ہے شور تو اس شہر میں، ظفر، اب تک
مگر، جناب نے آخر کیا بھی ہے کچھ کیا

☆

اتنا مجبور ہے دل، اُس کو بتانا ہی پڑا
اپنی اوقات پہ آخر مجھے آنا ہی پڑا

اُس سے آگے تو کہیں کچھ بھی نہیں تھا، لیکن
اور کچھ دُور اُسی راہ پہ جانا ہی پڑا

تھے تو خوش باش بہت ہم، مگر، ایسے میں کہیں
کوئی ہم کو بھی یہاں رنج اُٹھانا ہی پڑا

دل نے روشن تو رکھی شامِ ملاقات، مگر
یہ چراغ اُس کے تقاضے پہ بجھانا ہی پڑا

ہم جو ہر حال میں تھے اُس کی رضا کے طالب
حرفِ انکار بھی آنکھوں سے لگانا ہی پڑا

حالتِ دل کا بیاں ایک حقیقت تھی، مگر
اس میں بھی تھوڑا بہت جھوٹ مِلانا ہی پڑا

یاد کرنا ہی پڑا بھولنے والے کو بہت
جس کو ہم یاد رہے، اُس کو بھلانا ہی پڑا

سوچ پہ کوئی نئی سوچ جو غالب آئی
اپنے لکھے ہوئے کو آپ مٹانا ہی پڑا

اتنا بے رنگ تھا ہنگامۂ ہستی، کہ ظفر
چار و ناچار اُسے ڈھونڈ کے لانا ہی پڑا

☆

ہوا کے آئینے میں عکسِ آرزو کوئی تھا
وگرنہ میں ہی کہیں تھا یہاں نہ تُو کوئی تھا

مرا وجود بھی ہوتا گیا تھا خود روشن
کہ میرے سامنے اس رات شمع رُو کوئی تھا

کسی طرف سے نکلنے کی راہ تھی نہ کوئی
میں درمیان میں، اور، میرے چار سُو کوئی تھا

جو اب نہیں تو کبھی بھی نہیں کہ شام بہ شام
اسی نواح میں اپنا بھی ہم سبُو کوئی تھا

وہ جا چکا تھا جہاں سے وہاں پہ کیوں اب تک
رُکا رُکا ہُوا طوفانِ رنگ و بُو کوئی تھا

انہی چھلکتے ہوئے ساحلوں کے بیچ کہیں
بھرا پُرا کبھی دریائے نرم خُو کوئی تھا

نہیں ملا تو ہے یہ اور بات، ورنہ یہاں
تمام عُمر وہی میری جستجو کوئی تھا

نہیں بھی تھا تو رہے جا بجا نشاں اُس کے
اگر وہ تھا تو سمجھ لو کہ ہُو بہُو کوئی تھا

ظفر کی یاد بس اتنی ہی رہ گئی باقی
کہ شہر میں کبھی موضوعِ گفتگو کوئی تھا

☆

کھپت ہوتی ہے ویسی مال کی جیسی ضرورت ہو
محبت اب وہاں ہو گی جہاں اس کی ضرورت ہو

میں چادر سے زیادہ پانو پھیلایا نہیں کرتا
وسائل سے نہیں بڑھتی ، مری جتنی ضرورت ہو

ضروری ہی نہ تھی میرے لیے جو اب کسی صورت
میں خود حیرت زدہ ہوں ، وہ مری اب بھی ضرورت ہو

روابط کچھ نہیں ، اور ، کام پڑ جانا بھی ہے اُس سے
کبھی ایسی ضرورت ہو ، کبھی ویسی ضرورت ہو

زیادہ بوجھ بھی بننا نہیں چاہیں گے ہم اُس پر
پڑیں ساری کے پیچھے کیا اگر آدھی ضرورت ہو

کبھی تو اس قدر مجبور بھی ہونا پڑا ہم کو
کہ سوچا ، جس طرح بھی ہو سکے ، پوری ضرورت ہو

اندھیرا ہو ہمارے چار سُو ، اور ، اُس اندھیرے میں
اندھیرا اور بھی کوئی ہو ، اور ، اندھی ضرورت ہو

چلے ہی آئے ہیں جب ہم تو پھر کیا فرق پڑتا ہے
کوئی سچا تقاضا ہو ، کوئی جھوٹی ضرورت ہو

ظفر ، طبع رواں رکھتی ہے مجھ کو تنگ بھی ، یعنی
وہاں مضموں نکلتا ہے جہاں معنی ضرورت ہو

☆

پلکوں پہ چھلکتا ہوا آنسو ہی بہت ہے
اتنی سی محبت کی یہ خوشبو ہی بہت ہے

کھینچا تو کھنچا آئے گا دل ساتھ ہی اس کے
یہ تیرِ تغافل کہ ترازو ہی بہت ہے

قائم ہے محبت کا گماں جس کی بدولت
ہر لحظہ بدلتی یہ تری خُو ہی بہت ہے

اک دھوپ ترے چہرے کی درکار ہے مجھ کو
اوروں کو ترا سایۂ گیسو ہی بہت ہے

میں کیسے نکل سکتا ہوں اس خواب سے باہر
پھیلا ہوا اطراف میں جادو ہی بہت ہے

تعمیر کیا دل کو بھرے شہر نے مل کر
اور ، خانہ خرابی کے لیے تُو ہی بہت ہے

جاتے ہوئے دیکھا تو ہے آج اُس نے پلٹ کر
حالات میں یہ فرق سرِ مو ہی بہت ہے

اب اس کے بکھرنے میں بھی کچھ وقت لگے گا
کچھ دن سے طبیعت مری یکسو ہی بہت ہے

خود سے ہوں ، ظفر ، برسرِ پیکار شب و روز
اور ، مجھ کو مری قوتِ بازو ہی بہت ہے

☆

آمد و رفت کو دشوار بھی کر سکتا ہوں
یہ جو در ہے، اسے دیوار بھی کر سکتا ہوں

یہ سڑک بیچ میں پڑتی ہے جو تیرے میرے
تُو جو چاہے تو اسے پار بھی کر سکتا ہوں

جان قُربان بھی کر سکتا ہوں تجھ پہ اپنی
اور ترے عشق سے انکار بھی کر سکتا ہوں

خُوئے تسلیم تو ہے میرے لہُو میں، لیکن
میں کسی بات پہ اصرار بھی کر سکتا ہوں

نہیں کُچھ میرے لیے کارِ محبت مُشکل
کام کے ساتھ یہ بیگار بھی کر سکتا ہوں

جس میں کرنا نہ پڑے کُچھ بھی کسی صُورت میں
کام ایسا تو لگاتار بھی کر سکتا ہوں

سب نے مل کر جو کیا ہے بڑی مُشکل سے یہاں
میں اکیلا یہ کئی بار بھی کر سکتا ہوں

کام پر بھیج کے چوروں کو، اسی اثناء میں
اہلِ خانہ کو خبردار بھی کر سکتا ہوں

آپ جو کرتے ہیں چھپ کر پسِ دیوار، ظفر
میں یہ سب کُچھ سرِ بازار بھی کر سکتا ہوں

☆

میرے احوال پہ جو حُزن و ملال آپ کا ہے
یہ خبر آپ کی ہے، اور، خیال آپ کا ہے

دیر سے مائلِ پرواز ہُوں میں اپنے تئیں
اور، اطراف میں پھیلا ہُوا جال آپ کا ہے

اس اشارے سے تو یہ بھی نہیں ہوتا معلوم
یہ جواب آپ کا ہے یا کہ سوال آپ کا ہے

دیکھ سکنے کا بھی امکاں نہیں اتنا اب تو
ہم کو معلوم ہے ملنا تو محال آپ کا ہے

ہم کسی اور زمانے کے لیے تھے شاید
یہ صدی وہ ہے کہ ہر سال ہی سال آپ کا ہے

ہے مرے پانو میں زنجیر کسی اور کی بھی
اور، دن رات مرے سر پہ وبال آپ کا ہے

خرچ کرنے سے کسی طرح بھی ہو گا نہیں کم
کُچھ اسی طرح کا یہ مال و منال آپ کا ہے

کُچھ مرے پانو ہے پکڑے ہُوئے یہ خاکِ سفر
کُچھ مرے چاروں طرف جاہ و جلال آپ کا ہے

آپ جو اپنے کمالات پہ نازاں ہیں، ظفر
یہ بھی لکھ لیں کہ یہی عہدِ زوال آپ کا ہے

☆

کچھ خدا نے بھی ہے ان حالات میں رکھا ہوا
فرق ہے کچھ آپ نے بھی بات میں رکھا ہوا

آنسوؤں کے زور میں بھی شعلۂ دل ہے بلند
جل رہا ہے یہ دیا برسات میں رکھا ہوا

خود بھی میں چادر سے باہر پانو پھیلاتا نہیں
کچھ مجھے اس نے بھی ہے اوقات میں رکھا ہوا

دھوپ سی اس کے کناروں سے چھلکتی ہے ابھی
کوئی دن بھی ہے ہماری رات میں رکھا ہوا

اندر اندر ہے کوئی بے برکتی بھی موجزن
قحط سا بھی ہے اسی بہتات میں رکھا ہوا

دیکھنے کی چیز ہے، لیکن، چھپانے کی بھی ہے
ہے جو اک منظر ترے باغات میں رکھا ہوا

دیکھ لیتا ہے محبت سے تو ہے کیا یہ بھی کم
ورنہ کیا باقی ہے اپنی ذات میں رکھا ہوا

میری ہو سکتی ہے اس کے ساتھ یہ نسبت، کہ وہ
ایک سورج ہے مرے ذرات میں رکھا ہوا

آپ بھی اپنے تئیں کوشش تو کرتے ہیں، ظفر
اس نے بھی سب کچھ ہے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا

☆

میں سوچتا ہوں کہیں تیرے پاس آ سکتا
یہ عشق ٹھیک نہیں ہے، تجھے بتا سکتا

زمانہ اپنے لیے سازگار ہونا ہے
میں تیری خام خیالی پہ مسکرا سکتا

ترا وجود کہیں ہے، یہ دیکھنے کے لیے
کسی بہانے تجھے میں گلے لگا سکتا

رواں ہوئی ہے جو موج اس کو روک سکتا میں
رکی ہوئی ہے جو، اس بات کو چلا سکتا

مجھے رہائی نہ ملتی پھر اس کے بعد کہیں
بس ایک بار تجھے خواب میں بلا سکتا

کچھ اس طرح سے مری زندگی گزر جاتی
تجھے بھی ساتھ میں اپنے ہنسا رلا سکتا

وہاں سے کچھ بھی نہ ملتا مجھے، مگر، اک بار
جہاں سے روک رہے تھے مجھے، میں جا سکتا

مرے لیے بھی کہیں لوگ جمع ہو سکتے
کہ میں بھی اپنا تماشا کبھی دکھا سکتا

یہ زہر پھیل کے رہتا مرے لہو میں، ظفر
میں چاہتا بھی تو خود کو کہاں بچا سکتا

☆

کرتا نہیں تھا رُخ جو زمانہ مری طرف
آنے لگا ہے کر کے بہانہ مری طرف

میں نے بھی ڈال رکھی ہے عرضی تُمھارے پاس
پلٹو کبھی اُدھر سے تو آنا مری طرف

جتنے بھی سنگ ہیں وہ تُمھاری طرف ہیں ، اور
سارے کا سارا آئنہ خانہ مری طرف

اب اور کون آ کے سکونت پذیر ہو
اپنا بھی اب نہیں ہے ٹھکانا مری طرف

اپنی تو زد پہ تھا ہی ، مگر کُچھ دنوں سے اب
اُس نے بھی لے رکھا ہے نشانہ مری طرف

چلتا نہیں ہے کام اشاروں سے ، اس لیے
آواز دے کے اُس کو بُلانا مری طرف

مرضی سے اپنی آئے تو پھر اور بات ہے
یُوں گھیر کر اُسے نہیں لانا مری طرف

شاید مجھے بھی کوئی خبر شہر کی ملے
ایک آدھ اشتہار لگانا مری طرف

پُو پھُوٹتی ہے روز کُچھ اس طرح سے ، ظفرؔ
ہوتا ہے جیسے کوئی روانہ مری طرف

☆

یہ بھی مجھ کو ہی پہ انداز دگر چاہتے ہو
ٹوٹ کر اور کسی کو تُم اگر چاہتے ہو

دل میں گُل پھُول ہمارے بھی ہیں ، لیکن ، شاید
تُم کسی اور ہی گُلشن سے گُذر چاہتے ہو

اس تجارت کا بہُت شوق تو رکھتے ہو ، مگر
کُچھ زیاں چاہتے ہو ، اور ، نہ ضرر چاہتے ہو

عیب ظاہر تو ہُوئے سارے ہمارے تُم پر
اور کیا اس کے سوا عرض ہُنر چاہتے ہو

تُم نے رہنا ہی نہیں ہے اگر اس میں کُچھ دن
چھوڑ جانا ہے تو پھر کس لیے گھر چاہتے ہو

کبھی اس خیمۂ خواہش سے نکلتے بھی نہیں
آپ مُنہ سے نہیں کہتے ہو ، مگر ، چاہتے ہو

خُود ہی یہ دھوپ سی پھیلائی ہُوئی ہے تُم نے
اب اسی دھوپ سے بچنے کو شجر چاہتے ہو

سادگی اس سے زیادہ بھی کوئی کیا ہو گی
دُور رہتے ہو سمُندر سے ، گُہر چاہتے ہو

اس زمانے پہ ، ظفرؔ ، آپ ہُوئے ہو ظاہر
اب کسی اور زمانے کا سفر چاہتے ہو

☆

اس پہ کوئی دعویٰ تو ہمارا بھی نہیں تھا
وہ ایک اشارہ جو اشارہ بھی نہیں تھا

وہ سامنے بیٹھا ہُوا غائب تھا نظر سے
دیکھا جو دوبارہ تو دوبارہ بھی نہیں تھا

تھے اجنبی ، اور ، بزم سے اُٹھتے بھی نہیں تھے
اور ، اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا

اب سوچتے ہیں ، رکھتے وہ جاری ہی کسی طور
ہم کو وہ رویّہ جو گوارا بھی نہیں تھا

عُجلت کوئی ہم کو ہی بڑی تھی کہیں اُس شام
کُچھ اس میں قصور ایسا تُمھارا بھی نہیں تھا

منجدھار تھا پانی کے تھپیڑوں کے پس و پیش
دریا بھی نہ تھا ، اور ، کنارہ بھی نہیں تھا

وہ ایک سفینہ کہ سمندر سے رہا دُور
وہ ایک سفر جس میں ستارہ بھی نہیں تھا

خُود چھوڑ دیا ہم نے سروکارِ محبت
حالاں کہ بہت اس میں خسارہ بھی نہیں تھا

خاطر میں ہی لائے نہ کبھی اُس کو ، ظفرؔ ، ہم
اور ، اُس کے بغیر اپنا گزارہ بھی نہیں تھا

☆

میں آگ بھیجتا ہُوں ، اور ، دُھواں پلٹتا ہے
کہاں سے جا کے مرا کارواں پلٹتا ہے

روانہ ہوتے ہیں دونوں سفر پہ ساتھ ، مگر
مرے بغیر ہی میرا گُماں پلٹتا ہے

خیال اُس کا مُسافر ہے دُوسروں سے الگ
کہاں سے جاتا ہے ، لیکن ، کہاں پلٹتا ہے

کٹا پھٹا ہے زیادہ جہاں پہ ساحلِ جسم
اُسی نشیب سے دریائے جاں پلٹتا ہے

مکیں تو جا کے پلٹتا ہے خُود مکاں کی طرف
کبھی مکیں کی طرف بھی مکاں پلٹتا ہے

ملے نہ دُور تک اُس کا سُراغ ہی یکسر
تو راستے ہی سے خوابِ رواں پلٹتا ہے

وہ کم نُما کبھی کرتا بھی ہے ظہُور کہیں
تو اُس کے دیکھنے کو اک جہاں پلٹتا ہے

ہم اُس کی بات کا آخر جواب کیوں کر دیں
یہاں تو روز ہی اُس کا بیاں پلٹتا ہے

اسی طرح کے ستارے ہیں اُس طرف بھی ظفرؔ
جو میرے آگے رُخِ آسماں پلٹتا ہے

☆

وہی ہے رات دن کی یہ مصیبت ، اور ، ہم دونوں
اکٹھا رہ نہیں سکتے محبت ، اور ، ہم دونوں

یہ کیا اندازِ اُلفت ہے ، قریب آنے کی خواہش میں
بڑھا لیتے ہیں آپس کی مسافت اور ہم دونوں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ منظر کس طرح کا ہے
ہمارے چار سُو پھیلی یہ حیرت ، اور ، ہم دونوں

بہت کچھ ہو تو سکتا ہے ، مگر ہو گا نہیں کچھ بھی
کہ ہے پابندیٔ شرم و شرافت ، اور ، ہم دونوں

یہی اُمید سوتے جاگتے پھرتی ہے آنکھوں میں
کہیں مل جائیں گے خواب اور حقیقت ، اور ، ہم دونوں

تقاضا صُورتِ حالات کا کچھ اور ہوتا ہے
بنا رکھتے ہیں ، لیکن اپنی حالت اور ہم دونوں

وہ ملنے کو ترسنا اور بیگانے بنے رہنا
وہی اِک دُوسرے کے ساتھ غفلت ، اور ، ہم دونوں

جہاں تک آ گئے ہیں ، اس سے آگے جا نہیں سکتے
نہیں ہے کوئی بھی اب رُو رعایت ، اور ، ہم دونوں

ظفر ، نزدیک ہے کتنی مُلاقات آج بھی ، لیکن
بہت دُوری پہ ہے ملنے کی مُہلت ، اور ، ہم دونوں

☆

ویسا نہیں ممکن ہے تو ایسا ہی مزہ لیں
یہ ہجر مُقدر ہے تو اس کا ہی مزہ لیں

پھیلائیے چادر کو یہاں دیکھ کے ہی پانو
جتنے کی اجازت ہے ، سو ، اُتنا ہی مزہ لیں

کڑوا ہو کہ میٹھا ، نہیں کوئی غرض اس سے
جیسا ہے مُیسّر یہاں ، ویسا ہی مزہ لیں

ہر بات کا بہتر بھی نکل سکتا ہے مطلب
صحرا بھی ہو درپیش تو دریا ہی مزہ لیں

یہ ذائقہ مانا کہ پسند اتنا نہیں تھا
وہ وقت بھی آئے گا کہ اچھا ہی مزہ لیں

بولے گا بھی مُنھ سے کبھی ، فی الحال تو کچھ دن
اُلٹا بھی اشارہ ہو تو سیدھا ہی مزہ لیں

ہو کر پھر اُسی دامِ تمنا میں گرفتار
اس ترکِ محبت کا دوبارہ ہی مزہ لیں

یاد اُس کو یہ اندازِ دِگر کرنا پڑے گا
وہ سب سے الگ ہے تو علیحدہ ہی مزہ لیں

اس شہر میں ہونا ہی بہت ہے ، ظفر ، اُس کا
یہ جی ہے کہ بھرتا نہیں ، کتنا ہی مزہ لیں

☆

مری طبع کو کیا رواں کر دیا
مجھے اور بھی بے نشاں کر دیا

فنا کر دیا میں نے کوئی ہنر
کسی عیب کو جاوداں کر دیا

جو پُھوما غلط سی جگہ پر اُسے
کہاں کام تھا ، اور ، کہاں کر دیا

تو کہنے کو باقی رہے گا نہ کُچھ
سبھی کُچھ اگر یوں بیاں کر دیا

کسی در پہ رکھا فسانے کا خواب
دریچہ کوئی داستاں کر دیا

ہمیں تو غرض کام کرنے سے تھی
یہاں کر دیا ، یا وہاں کر دیا

بدل کر شب و روز شیون کا شور
کوئی اور طرزِ فغاں کر دیا

گئے تھے نکل درمیاں سے جو لوگ
دوبارہ اُنھیں درمیاں کر دیا

اُتارا فلک سے ستارہ کوئی
زمیں کو ، ظفر ، آسماں کر دیا

☆

عشق یہ کیا ہے کہ زحمت نہیں کرنی آتی
دشت میں رہ کے بھی وحشت نہیں کرنی آتی

کہیں سیکھا نہیں کُچھ اس نے بھی دلجوئی کا فن
اور ، مُجھ کو بھی محبت نہیں کرنی آتی

کہہ دیا ہم نے جو کہنا تھا ، وہی کافی ہے
اور اب ہم کو وضاحت نہیں کرنی آتی

عاقبت کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ تُمھیں
ہم فقیروں کی بھی خدمت نہیں کرنی آتی

محترم ، اور ، مُعزز ہیں بہت شہر میں آپ
ایک بس آپ کو عزت نہیں کرنی آتی

آپ کے ساتھ ہمارا ہے تعلُّق ہی کُچھ اور
ورنہ کیا ہم کو سیاست نہیں کرنی آتی

ہم نے یہ کام کسی کل پہ اکٹھا رکھا ہے
یہ غلط ہے کہ شرارت نہیں کرنی آتی

کام کیا خاک نکالو گے کہ تُم کو تو ، ظفر
رُوٹھنا آتا ہے ، مِنّت نہیں کرنی آتی

نام تو آپ کا لکھا ہے وکیلوں میں ، ظفر
آپ کو صرف وکالت نہیں کرنی آتی

☆

جرس تبدیل کر دی ، قافلہ تو نے بدل ڈالا
سو، منزل کیوں نہ ملتی ، راستہ تو نے بدل ڈالا

نئے الفاظ میں تو نے نئی تاثیر پیدا کی
کہ مضمونِ محبت جا بجا تو نے بدل ڈالا

کچھ اس انداز سے بنیاد رکھی تازہ کاری کی
کہ سب پیرایۂ نشو و نما تو نے بدل ڈالا

رواں کر کے سماعت کا سفینہ موجِ معنی پر
سراسر منظرِ صوت و صدا تو نے بدل ڈالا

وہ خواب ایسا تھا جس کے ساتھ ہی تعبیر بھی آئی
جہانِ آرزو کا سلسلہ تو نے بدل ڈالا

سفر تھا ، اور ، سامانِ سفر سے بے نیازی بھی
کچھ ایسے موسمِ دشتِ وفا تو نے بدل ڈالا

گل و بلبل میں ایسے رابطے پیدا کیے آخر
چمن میں نقشۂ آب و ہوا تو نے بدل ڈالا

زمانے سے غرض کیا ہو تجھے ، تو خود زمانہ ہے
یہاں لمحوں میں سارا ماجرا تو نے بدل ڈالا

ظفر ، اقبال نے تو ایک دنیا ہی بدل دی تھی
میں تب مانوں گا جب خود کو ذرا تو نے بدل ڈالا

☆

مدعا زور سے منوا بھی کہاں سکتا ہوں
اُسے معلوم ہے ، میں جا بھی کہاں سکتا ہوں

میرے بھی پانو میں زنجیرِ زمانہ ہے کوئی
تو بلائے بھی تو میں آ بھی کہاں سکتا ہوں

میرے ہاتھوں میں اگر ہو بھی محبت کا علَم
میں سرِ عام اسے لہرا بھی کہاں سکتا ہوں

مجھے اوّل تو میسّر ہی نہیں جامۂ خواب
اور ، پھر میں تجھے پہنا بھی کہاں سکتا ہوں

تازہ رکھتی ہے مجھے تیرے تغافل کی ہوا
میں جو چاہوں بھی تو مُرجھا بھی کہاں سکتا ہوں

بندشیں ایک سے اک بڑھ کے ہیں مُجھ پر دن رات
رونے دیتے نہیں ، اور ، گا بھی کہاں سکتا ہوں

شرم آتی تو بہت ہے ، مگر ، اب تم ہی کہو
ایسے حالات میں شرما بھی کہاں سکتا ہوں

نیند آتی ہی نہیں ، اور ، اگر آ بھی جائے
تاب اُس خواب کی میں لا بھی کہاں سکتا ہوں

میں تو خود رہتا ہوں غیروں کی طرح اس میں ، ظفر
اپنے گھر میں اُسے ٹھہرا بھی کہاں سکتا ہوں

☆

ابھی آنکھوں میں بسایا بھی نہیں تھا ہم نے
کھو دیا ہے جسے پایا بھی نہیں تھا ہم نے

دل کا احوال سُنایا تو نہ ہو گا جا کر
اس قدر اُس سے چھپایا بھی نہیں تھا ہم نے

کسی رُسوائی نے زحمت بھی نہیں کی تھی ابھی
کوئی الزام اُٹھایا بھی نہیں تھا ہم نے

اُس سے کیا چاہتے ہیں اتنے بڑے شہر میں ہم
اُس نے پُوچھا تو بتایا بھی نہیں تھا ہم نے

ڈالے رکھا بھی محبت نے بہت مُشکل میں
بوجھ یہ سر سے گرایا بھی نہیں تھا ہم نے

ٹھیک ہے یاد بھی رکھا نہیں اُس کو، لیکن
یہ بھی سچ ہے کہ بھلایا بھی نہیں تھا ہم نے

دل کے سجدوں کی الگ بات ہے، ورنہ، اب تک
سر وہاں جا کے جُھکایا بھی نہیں تھا ہم نے

نیا منظر کوئی بنتا بھی تو کیسے کہ ابھی
خواب میں خواب مِلایا بھی نہیں تھا ہم نے

ہم سے جا بیٹھا ہے کیوں اور بھی وہ دُور، ظفرؔ
پاس تو اُس کو بُلایا بھی نہیں تھا ہم نے

☆

بہت بُری طرح ڈرتے ڈرتے بچ لیا ہوں
کسی کے دامِ فریب سے جو نِکل گیا ہوں

بہت ہے دُنیا پہ ایک احسان یہ بھی میرا
کوئی قیامت ہوں، آتے آتے جو ٹل گیا ہوں

نِکل تو آیا تھا ایک سانچے سے زور کر کے
مگر، کسی اور ایک سانچے میں ڈھل گیا ہوں

بچی ہے اُس دُھوپ سے مری ایک سمت، ورنہ
میں اک طرف سے تو پُورا پُورا ہی جل گیا ہوں

وہ نفسانفسی تھی آج بازار میں کہ آخر
میں کھوٹا سِکہ تھا لیکن اس بار چل گیا ہوں

بُلا رکھے تھے کُچھ اور ہی لوگ اُس نے گھر میں
وہاں گیا بھی ہوں میں تو کیا بے محل گیا ہوں

کُچھ اور تو مُجھ سے عُمر بھر ہو نہیں سکا ہے
کہ حبس تھا، اور، ہوا کی پنکھی سی جھل گیا ہوں

بہت زیادہ نہیں ہوں اپنے وجُود سے میں
تو کیوں ابھی پھر چھلک اُٹھا ہوں، اُچھل گیا ہوں

زمانہ اب رہ نہیں گیا ہے وہ پہلے والا
کہ میں، ظفرؔ، آپ رفتہ رفتہ بدل گیا ہوں

☆

شور کرنا تو ہوا ، دھوم مچانا تو ہوا
اپنے لوگوں میں ترا لوٹ کے آنا تو ہوا

دل کا جو حال ہے ، اس کی سمجھ آئی تو نہیں
ہم نے کہنا تو ہوا ، اُس کو بتانا تو ہوا

دُور ہی دُور جو رہتے ہیں کئی دن تجھ سے
پاس آنے کا ترے ایک بہانہ تو ہوا

کچھ کریں بھی نہیں ، اور ، تیرے جہاں سے اُٹھ جائیں
نقش جھوٹا ہی سہی ، ہم نے دکھانا تو ہوا

لوگ ، اور ، لفظ بہت یاد تو آئیں گے ، مگر
آ گئے ہیں جو ، یہاں سے کبھی جانا تو ہوا

کچھ ضروری تو نہیں تیری محبت سے بچاؤ
ان بلاؤں سے ، مگر ، خود کو بچانا تو ہوا

یُوں تو بستی میں وہ پوشیدہ ولی ہے ، لیکن
اپنا آپ اُس نے بھی دُنیا کو دکھانا تو ہوا

اس بھرے شہر میں چُپ بھی نہیں رہ سکتے ہم
کبھی رونا تو ہوا ، اور ، کبھی گانا تو ہوا

مجھ میں اور اُس میں جو یہ ایک رُکاوٹ ہے ، ظفر
دل کی دیوار کو رستے سے ہٹانا تو ہوا

-☆-

نہ ہمارا نہ تمھارا ہی رہے
سب کی آنکھوں کا وہ تارا ہی رہے

نہیں آتا ہے ، نہ آئے بے شک
اُس کے آنے کا اشارہ ہی رہے

کام کرتا ہے کچھ اُس سے مل کر
چاہے نقصان ہمارا ہی رہے

کچھ زیادہ بھی نہیں چاہتے ہم
وقت کٹ جائے ، گزارہ ہی رہے

آج کل یہ بھی غنیمت ہے بہت
جھوٹا سچا وہ سہارا ہی رہے

کان پڑتی رہے آواز تو کچھ
کوئی آنکھوں میں نظارہ ہی رہے

پھر سے ناکام بھی ہو جائیں تو کیا
آزمایش وہ دوبارہ ہی رہے

جلتا بجھتا سہی ، جیسا بھی ہے وہ
میری قسمت کا ستارہ ہی رہے

کہیں پانی تو نظر آئے ، ظفر
یعنی میٹھا نہیں ، کھارا ہی رہے

-☆-

ہوں ابھی پار کہ اِدھر آیا ہوں
عُمر ساری تو گزار آیا ہوں

پیاس ہی اور طرح کی ہے جو آپ
تیرے دریاؤں کے پار آیا ہوں

میرے بس میں یہ کہاں تھا ، کوئی
لہر تھی جس پہ سوار آیا ہوں

ہے یہ دیکھی ہُوئی ہر شے ، جیسے
میں یہاں دُوسری بار آیا ہوں

وہ کہیں تھا کہ نہیں تھا موجُود
ہر جگہ اس کو پکار آیا ہوں

جیت اور اس سے بڑی کیا ہو گی
اپنا سب کُچھ اُسے ہار آیا ہوں

بیٹھ جاؤں گا ، ابھی دم بھر میں
شہر پہ مثلِ غُبار آیا ہوں

دوست ہیں میرے مقابل اب کے
اپنے دُشمن کو تو مار آیا ہوں

ظفرؔ ، اعلانِ محبت کر کے
بوجھ اِک سَر سے اُتار آیا ہوں

-☆-

ہر گھڑی خواب نظر سامنے ہے
میں جہاں ہُوں ترا گھر سامنے ہے

خُود نہ گذروں تو نہ گذروں بے شک
ورنہ دیوار میں در سامنے ہے

کیوں دِکھائی نہیں دیتا مُجھ کو
وہ کہاں اور کدھر سامنے ہے

راستہ اُس کے لیے چھوڑتا ہُوں
وہ گذر جائے اگر سامنے ہے

جس سے کترا کے نِکل آیا تھا
پھر وہی راہگذر سامنے ہے

راہ میں بیٹھ گیا ہُوں تھک کر
اور ، ابھی سارا سفر سامنے ہے

فیصلہ کیوں نہیں کرتے ، اب تو
سب مرا عیب و ہُنر سامنے ہے

کوئی آندھی ہی اُکھاڑے اِس کو
یہ جو شُہرت کا شجر سامنے ہے

زیست سے بھاگتا پھرتا ہُوں ، ظفرؔ
اور یہ شام و سَحر سامنے ہے

-☆-

موسم ہے عجب ، اب وہ ہوا اور ہی کچھ ہے
یک طرفہ محبت کا مزہ اور ہی کُچھ ہے

اُس نے تو کبھی مُجھ کو کیا اور ہی کُچھ تھا
لیکن ، مُجھے اب آ کے ہُوا اور ہی کُچھ ہے

ہیں اور طرح رنگِ تغافل کے قرینے
اور ، زاویۂ بندِ قبا اور ہی کُچھ ہے

ہے باغ تو پہلے مرا دیکھا ہُوا ، لیکن
گُل اور طرح کے ہیں ، صبا اور ہی کُچھ ہے

مَیں گرتا سنبھلتا تو رہا ہُوں بہُت اب تک
اس بار مری لغزشِ پا اور ہی کُچھ ہے

ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُسے اور طرف کو
اور ، اُس کی رہایش کا پتا اور ہی کُچھ ہے

بارش کوئی ہونے کو ہے کُچھ اور طرح کی
اس شہر پہ یہ ابر اُٹھا اور ہی کُچھ ہے

کُچھ اور لگا تھا مُجھے وہ پہلی نظر میں
دیکھا ہے دوبارہ تو لگا اور ہی کُچھ ہے

مہماں تو ، ظفر ، آتے ہی رہتے ہیں کم و بیش
اس گھر میں ، مگر ، تنگیِ جا اور ہی کُچھ ہے

☆

جیسا بھی رہ گیا ہُوں ، جتنا بھی رہ گیا ہُوں
بے شک بُرا ہُوں ، لیکن اچھا بھی رہ گیا ہُوں

کوئی نہیں کرے گا گو اعتبار میرا
دریا بھی سامنے ہے ، پیاسا بھی رہ گیا ہُوں

گذرا ہُوں زندگی میں کُچھ ایسے مرحلوں سے
دُگنا بھی ہو گیا ہُوں ، آدھا بھی رہ گیا ہُوں

رونق لگی ہُوئی ہے کیا میرے چار جانب
اک بھیڑ سی ہے جس میں تنہا بھی رہ گیا ہُوں

گُمراہ سب ہُوئے ہیں مُجھ بے خبر کے ہاتھوں
میرا کہا نہ کرنا ، کہتا بھی رہ گیا ہُوں

کوئی نہ فرق آیا میرے گنوارپن میں
اس محفلِ ادب میں کتنا بھی رہ گیا ہُوں

مَیں گردِ کارواں میں گُم ہو گیا کئی بار
اکثر تو سب سے پیچھے ایسا بھی رہ گیا ہُوں

بدلے ہیں رنگ میری اس کیفیت نے کیا کیا
دریا بھی ہو گیا ہُوں ، صحرا بھی رہ گیا ہُوں

یہ بھی ، ظفر ، غنیمت سمجھو کہ آج تک مَیں
اس شہرِ کُشت و خُوں میں زندہ بھی رہ گیا ہُوں

☆

آر کی ہے نہ کوئی پار کی بیماری ہے
ہوں وہ دریا جسے منجدھار کی بیماری ہے

اپنی ہی شامتِ اعمال ہیں بھونچال ، کہ یہ
نہ زمیں کی نہ ہی کہسار کی بیماری ہے

ہم اسی سے نہیں رکھتے ہیں غرض کوئی یہاں
جس کے ساتھ ایک سروکار کی بیماری ہے

عشق پھیلا ہوا ہے ایک وبا کی صورت
یہ نہیں ہے کہ یہ دو چار کی بیماری ہے

یہ دعا ہے کہ خدا جلد اسے صحت بخشے
مدتوں سے جسے انکار کی بیماری ہے

مبتلا جس میں چلا آتا ہوں اک عمر سے میں
یہ کسی اور ہی بیمار کی بیماری ہے

کبھی ہو سکتا نہیں ہے کوئی جاں بر اس سے
کہ یہ فن ہی کسی فنکار کی بیماری ہے

روز کے روز غزل جو ہوئی جاتی ہے نڈھال
اسے پیرایۂ اظہار کی بیماری ہے

سوکھتا جاتا ہے رس جو مری شاخوں سے ، ظفر
ہو نہ ہو ، یہ کوئی اشجار کی بیماری ہے

-☆-

صبح کی ہے نہ مجھے شام کی بیماری ہے
اور ہی یہ کسی ہنگام کی بیماری ہے

تپشِ خواب تماشا ہے کبھی آنکھوں میں
کبھی سودائے لبِ بام کی بیماری ہے

عمر گذری ہے کہ اپنے رگ و ریشے میں وہی
جھوٹے سچے ترے الزام کی بیماری ہے

اصل تو وہ ہے جو پھرتی ہے ابھی دل کے قریب
یہ تو جیسی بھی ہے بس نام کی بیماری ہے

اور تو پختہ و بیہودہ ہر اک طرح سے ہوں
صرف مجھ کو ہوسِ خام کی بیماری ہے

اب کوئی اور بہانہ ہی تراشو ، ورنہ
دردِ سر ہے نہ ہی ایام کی بیماری ہے

پائی ہے کام سے تو میں نے بہرحال شفا
اب اگر ہے تو بس آرام کی بیماری ہے

اس کے حملے سے کسی طور بچا میں بھی نہیں
شہر میں جو روشِ عام کی بیماری ہے

کرتے پھرتے ہو ، ظفر ، کیا مرضِ غم کا علاج
جانِ من ! یہ تو بڑے کام کی بیماری ہے

-☆-

یہ بظاہر تو کوئی حال کی بیماری ہے
بے دلی سی جو کئی سال کی بیماری ہے

اس کی تشخیص وہ اپنا ہی کرے گا کہ مجھے
اجنبی سے کسی احوال کی بیماری ہے

چھینا جھپٹی جو لگی رہتی ہے دن بھر سر بزم
آپ ہی کے یہ زر و مال کی بیماری ہے

عارضہ اور مقامات کا لاحق ہے کہ اب
چشم و لب کی نہ خد و خال کی بیماری ہے

مبتلا ہوں کسی تفصیلِ طلب میں کیا کیا
اور، اس شوخ کو اجمال کی بیماری ہے

ایسی نیچی ہوئی جاتی ہے جو پروازِ خیال
عاقبت یہ بھی پر و بال کی بیماری ہے

اس کی جانب سے تقاضائے سلامت ہے وہی
اور، مجھ کو وہی اشکال کی بیماری ہے

طبع اتنی جو رواں اہلِ غزل کی ہے یہاں
یہ بھی اک طرح سے اسہال کی بیماری ہے

ان فضاؤں میں جراثیم تو تھے نوع بہ نوع
پھر بھی ہر سو ظفراقبال کی بیماری ہے

-☆-

دن چڑھے تک بھی وہی رات کی بیماری ہے
یہ جو اک خوابِ ملاقات کی بیماری ہے

سو ہیں بیمار تو ہے ان کے لیے ایک انار
غور کیجے تو اسی بات کی بیماری ہے

تو وہ سورج ہے کہ تجھ کو یہی معلوم نہیں
کس طرح کی ترے ذرات کی بیماری ہے

سیرگاہیں تو یہاں شہر میں کچھ اور بھی ہیں
صرف ہم کو ترے باغات کی بیماری ہے

وہ کہیں اور سے اب اپنا کراتا ہے علاج
ورنہ اس کو بھی مرے ساتھ کی بیماری ہے

ہم نے کشکول ہی تھک ہار کے جب توڑ دیا
تب سے اس شوخ کو خیرات کی بیماری ہے

کوئی اس سے میرا پیچھا ہی چھڑا دے آ کر
مجھے لاحق جو مری ذات کی بیماری ہے

لوگ مرتے ہیں زیادہ بھی یہاں کھانے سے
کچھ علاقوں میں یہ بہتات کی بیماری ہے

نرم خو ایک دن اس نے بھی ہونا ہے، ظفر
عارضی سختیِ حالات کی بیماری ہے

-☆-

آنے والے نئے موسموں کے لیے چھوڑ دوں
گفتگو کچھ نہ کچھ دوسروں کے لیے چھوڑ دوں

چلتے چلتے کسی موڑ پر بیٹھ جاؤں کہیں
اور ، باقی سفر راستوں کے لیے چھوڑ دوں

سائباں کھول کر اپنا لے جاؤں شاید کبھی
دھوپ جتنی بھی ہے بادلوں کے لیے چھوڑ دوں

کوئی سمجھے تو اتنا ہی کافی ہے میرے لیے
دشمنی کو اگر دوستوں کے لیے چھوڑ دوں

کوئی تخریب سی میری تعمیر میں ہے اگر
ایک پتھر یہاں آندھیوں کے لیے چھوڑ دوں

جانتا ہوں کہ اس میں بہت میرا نقصان ہے
یہ سمندر اگر ساحلوں کے لیے چھوڑ دوں

خرچ کرنا ہے ، لیکن ، سلامت بھی رہ جاؤں میں
اس لیے کچھ نہ کچھ رہزنوں کے لیے چھوڑ دوں

کب تک اپنے ہی اندر یہ گرتے رہیں گے بھلا
دامن خاک ہی آنسوؤں کے لیے چھوڑ دوں

کیا مزہ ہو ، چراغِ تماشا بجھا کر ، ظفر
یہ اندھیرے اگر جگنوؤں کے لیے چھوڑ دوں

☆

آشنا ہے جسے اجنبی کے لیے چھوڑ دوں
یوں نہ ہو ، پھر کسی کو کسی کے لیے چھوڑ دوں

یہ دھندلکا ہی تو اصل میں میری پہچان ہے
کس لیے میں اسے روشنی کے لیے چھوڑ دوں

خود سے مغرور ہو جاؤں اپنی عداوت میں ، اور
آپ کو آپ کی دوستی کے لیے چھوڑ دوں

اپنی اصلاح کرنے پہ آ جاؤں تو سر بسر
ایک عادت کسی دوسری کے لیے چھوڑ دوں

یہ بھی ممکن ہے یوں ہی مرے جی میں آئے تو میں
مستقل کو کبھی عارضی کے لیے چھوڑ دوں

اور ، آخر سکوت و سخن جیسی یکجائی کو
ایک پھیلی ہوئی سنسنی کے لیے چھوڑ دوں

ایک ایسی ضرورت بھی درپیش ہوتی ہے ، جب
سو اضافے میں اپنی کمی کے لیے چھوڑ دوں

طے کیا ہے یہی آخرِ کار میں نے کہ میں
موت کا ذائقہ زندگی کے لیے چھوڑ دوں

کیا خبر ، آنے والا اگر کارگر ہو ، ظفر
آخر اپنی جگہ میں اسی کے لیے چھوڑ دوں

☆

عزم ہے ، لیکن اس کو مل کے لیے چھوڑ دوں
آج کا کام پھر آج ، کل کے لیے چھوڑ دوں

وہ ہوائیں نہ وہ چھاؤں ہی مل سکے گی کہیں
اُس کے باغات کیوں پھول پھل کے لیے چھوڑ دوں

منظر ایک اس طرح کا ہے جو مُجھ سے پیوستہ ہے
مسئلہ کوئی ہے جس کو حل کے لیے چھوڑ دوں

اور تو میرے بس میں نہیں کوئی شے بھی یہاں
اپنی ہی ذات زد و بدل کے لیے چھوڑ دوں

ایک اخفائے احوال رہنے دوں اپنے لیے
اور اظہار اہلِ غزل کے لیے چھوڑ دوں

اُس کے ہونٹوں کے پھولوں سے اپنا سروکار ہے
وہ وجود ایک اُس ہم بغل کے لیے چھوڑ دوں

پہلے چھوڑا تو یوں جیسے اب اُس سے ملنا نہ ہو
اب ملے ہیں تو مُشکل ہے پل کے لیے چھوڑ دوں

اک ہوا اپنے خواب و خبر کے لیے ہے بہت
اک فضا اپنے دشت و جبل کے لیے چھوڑ دوں

صلح کل ہوں ، مگر ، ایک ایسا بھی رُخ ہے ، ظفر
شہر میں جس کو جنگ و جدل کے لیے چھوڑ دوں

☆

کس طرح یہ جہاں اُس جہاں کے لیے چھوڑ دوں
اور ، اپنی زمیں آسماں کے لیے چھوڑ دوں

سخت مُشکل ہے جس میں مرا ذکر ہی کُچھ نہ ہو
اپنا کردار اُس داستاں کے لیے چھوڑ دوں

کوئی تو زہر اس زندگی کے لیے رہ بھی جائے
کوئی تو ذائقہ اس زباں کے لیے چھوڑ دوں

ایک تردید کی کوئی صورت بھی باقی رہے
اک وضاحت بھی اپنے بیاں کے لیے چھوڑ دوں

کوئی راتوں میں کُچھ روشنی تو رہے گی یہاں
پارۂ برق اگر آشیاں کے لیے چھوڑ دوں

ہے ضروری کہ نقشہ مکاں کا بناتے ہُوئے
ایک جانب جگہ کُچھ دُکاں کے لیے چھوڑ دوں

سوچتا ہُوں کہ واپس جہاں مَیں نے آنا نہیں
اپنے آثار ہی کُچھ وہاں کے لیے چھوڑ دوں

نیچے اُوپر بھی رکھوں توجہ دلِ زار کی
اور ، باقی ہنر درمیاں کے لیے چھوڑ دوں

جو تو ہے ، اُس کا ملنا نہیں ہے نشاں تک ، ظفر
جو نہیں ہے ، مَیں اُس کو کہاں کے لیے چھوڑ دوں

☆

سوچتا ہوں کہ اپنی رضا کے لیے چھوڑ دوں
وہ جو کہتا ہے اُس کو خدا کے لیے چھوڑ دوں

چومنے کے لیے تھام رکھوں کوئی دم وہ ہاتھ
اور، وہ پانو رنگِ حنا کے لیے چھوڑ دوں

شہر کو سارے لوگوں میں تقسیم کر دوں، مگر
چند گلیاں میں اپنی صدا کے لیے چھوڑ دوں

خواہشیں تنگ ہیں دل کے اندر، اگر تم کہو
یہ کبوتر تمھاری فضا کے لیے چھوڑ دوں

کارِ مشکل تو ہے ہی، مگر، میں بھی مجبور ہوں
ابتدا کو اگر انتہا کے لیے چھوڑ دوں

میرا ہرگز بھی کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اگر
میں روا کو یہاں ناروا کے لیے چھوڑ دوں

یہ بھی ممکن ہے خود سے کسی دن گزرتے ہوئے
اپنے ٹکڑے کہیں جا بجا کے لیے چھوڑ دوں

اب یہ سوچا ہے، مٹھی میں عمر بقایا مری
جو بھی ہے، ایک دیرِ آشنا کے لیے چھوڑ دوں

خود سے باہر نکل جاؤں میں، اور، خود کو، ظفرؔ
کوئی دن جنگلوں کی ہوا کے لیے چھوڑ دوں

☆

یہ سفر بھر سے خواب سفر کے لیے چھوڑ دوں
عیب جو بھی ہے، کسی ہنر کے لیے چھوڑ دوں

میں نہیں ہوں، مجھے ڈھونڈنا محض بے کار ہے
اک سُراغ آج اپنی خبر کے لیے چھوڑ دوں

دیکھیں یہ جو میرے کسی کام کی اب نہیں
اپنے جیسے کسی دربدر کے لیے چھوڑ دوں

اک چراغِ نظر جس کو روشن کیا ہے ابھی
یہ ہوائے سرِ رہگذر کے لیے چھوڑ دوں

ڈوبنا ہے کنارے پہ بھی جا کے اس کو اگر
کیوں نہ اس ناؤ کو میں بھنور کے لیے چھوڑ دوں

زندہ رہنے کی عادت نہ پڑ جائے مُجھ کو کہیں
آج اسے مدّتِ مختصر کے لیے چھوڑ دوں

کوئی اندر نہ تھا جس کی خاطر نکلتا کہیں
کوئی باہر نہیں جس کو گھر کے لیے چھوڑ دوں

میرے بس میں نہیں اور تو کچھ بھی، لیکن، یہاں
کوئی دن ہے جسے رات بھر کے لیے چھوڑ دوں

میں نے اپنی تپش پر بھروسا کیا ہے، ظفرؔ
کیوں یہ خس خانہ اُس کے شرر کے لیے چھوڑ دوں

☆

اک حسد سے بھری گفتگو کے لیے چھوڑ دوں
کام کوئی تو اپنے عدو کے لیے چھوڑ دوں

اصل نایاب ہے تو یہ طومارِ عرضِ ہوس
چاہتا ہوں کسی ہو بہو کے لیے چھوڑ دوں

سارے شکوے شکایات خط میں نہیں لکھ رہا
کچھ ملاقات ، اور ، رُو برُو کے لیے چھوڑ دوں

روک لوں اپنی طبعِ رواں کو کسی طرح سے
جو بھی کہنا ہے ، اب گفتگو کے لیے چھوڑ دوں

تھام لوں جوشِ گریہ نمازِ سحر کے سبب
تھوڑا آنکھوں میں پانی وضو کے لیے چھوڑ دوں

اک نشاں جو مرے پاس محفوظ ہے دیر سے
کیا اُسے بھی تری جستجو کے لیے چھوڑ دوں

تشنہ لب اور بھی آنے والے ہیں اس بزم میں
کچھ شراب اور جام و سبُو کے لیے چھوڑ دوں

پُرزہ پُرزہ جو یہ خوابِ اظہار ہے ، آج سے
بھولی بسری کسی آرزو کے لیے چھوڑ دوں

سوچتا ہوں ، ان اطراف میں کھوئی تتلی ، ظفر
سمت سی کوئی میں چار سُو کے لیے چھوڑ دوں

☆

خزاؤں میں کہ بہاروں میں مارے جائیں گے
کبھی اشاروں اشاروں میں مارے جائیں گے

کہیں تو ہو گی کوئی منزلِ مُراد اپنی
یہ ہم جو راہ گزاروں میں مارے جائیں گے

گلے گھٹے ہوئے سے ہم اک ایسے دریا ہیں
جو آخر اپنے کناروں میں مارے جائیں گے

چمک دمک ہے بہت عارضی ہماری ، کہ ہم
غبار ہو کے ستاروں میں مارے جائیں گے

ہماری ہستی ناپائیدار ہے اتنی
کہ خس ہیں ، اور ، شراروں میں مارے جائیں گے

ہمارا اُن میں کوئی امتیاز کیا ہو گا
مرے تو ہم بھی ہزاروں میں مارے جائیں گے

یہ ابتلا ہے کچھ اس طرح کی کہ ہم خود بھی
کبھی کے ساتھ ہیں ، ساروں میں مارے جائیں گے

جگہ تو کوئی بھی محفوظ تر نہیں ، کہ یہاں
ہمارے لوگ حصاروں میں مارے جائیں گے

جلوس پھیلتا جائے گا رفتہ رفتہ ، ظفر
ہم اپنے نام کے نعروں میں مارے جائیں گے

☆

کسی ہوا کی روانی میں مارے جائیں گے
جو اپنے عہدِ جوانی میں مارے جائیں گے

لکھے ہوئے کا کوئی اعتبار ہی نہیں اب
اسی لیے تو زبانی میں مارے جائیں گے

بساطِ شعر پہ پھیلا دیے گئے ہوئے ہم
وہ لفظ ہیں کہ معانی میں مارے جائیں گے

بحورِ مطلعِ اول سے بچ رہیں گے جو لوگ
وفورِ مطلعِ ثانی میں مارے جائیں گے

دکانِ خواب میں پھر آ کے پھنس گئے ہیں اگر
ہم اس دفعہ بھی گرانی میں مارے جائیں گے

اخیر پر تو حقیقت میں مارے جانا ہے
ہم اس سے پہلے کہانی میں مارے جائیں گے

بلا رہا ہے تو جائیں گے ہم کبھی نہ کبھی
یہ جانتے ہیں کہ پانی میں مارے جائیں گے

جو بھول بیٹھے ہیں اتنا ضروری کام تو کیا
ذرا سی یاددہانی میں مارے جائیں گے

یہ کام وہ ہے کہ ہیں جس میں خود کفیل، ظفر
ہم اپنی شعلہ بیانی میں مارے جائیں گے

☆☆

خیال و خواب کے عالم میں مارے جائیں گے
عجیب ہی کسی موسم میں مارے جائیں گے

کچھ اور طرح کی وہ کوئی کیفیت ہو گی
کہ ہم خوشی نہ کسی غم میں مارے جائیں گے

کسی اشارۂ موہوم کو سمجھتے ہوئے
کسی کنایۂ مبہم میں مارے جائیں گے

کسی تعاقبِ تنہا سے بچ نکلتے ہوئے
کسی ارادۂ باہم میں مارے جائیں گے

پھنسیں گے حرص و ہوس کے کچھ ایسے چکر میں
زیادہ چاہیں گے، اور، کم میں مارے جائیں گے

نکل نہ پائے جو ناممکنات سے آگے
اسی قبیل کے جوکھم میں مارے جائیں گے

جو مارے جانے سے لاہور میں رہے محروم
تو شہرِ قائداعظم میں مارے جائیں گے

زیادہ دیر لگانے کے ہم نہیں قائل
جو ٹھان لی تو کوئی دم میں مارے جائیں گے

ہمیں حسینؓ کا ماتم ہی مار دے گا، ظفر
سو، اب کی بار محرم میں مارے جائیں گے

☆☆

جو زندہ ہیں ، اسی حالت میں مارے جائیں گے
کہ لوگ اپنی شرافت میں مارے جائیں گے

کوئی تو کھیت رہیں گے خوشامدی بن کر
وہ اور ہیں جو بغاوت میں مارے جائیں گے

بیان میں نظر آئی نہ کوئی گنجایش
تو اپنی اپنی وضاحت میں مارے جائیں گے

دکھائی دیتے ہیں مصروف جو تمھیں اتنے
یہ لوگ پہلی ہی فرصت میں مارے جائیں گے

کئی تو دیدہ و دانستہ مر رہیں گے یہاں
کچھ اور بھی ہیں جو غفلت میں مارے جائیں گے

کریں گے اُن کی بھلا تعزیت یہاں کس سے
جو اپنے دورِ حکومت میں مارے جائیں گے

اب اُن کے قاتلوں کا کیا کوئی لگائے گا کھوج
جو اپنے حجلۂ حیرت میں مارے جائیں گے

ہماری نعش کو کھینچے نہیں پھرے گا کوئی
کچھ اس طرح کی رعایت میں مارے جائیں گے

جو ڈاکوؤں سے ، ظفر ، بچ رہیں گے ، وہ خوش بخت
محافظوں کی حفاظت میں مارے جائیں گے

-☆-

یہیں بہانوں بہانوں میں مارے جائیں گے
ہم اپنے اپنے مکانوں میں مارے جائیں گے

یہاں پہ زندہ رہیں گے وہی حقیقت میں
کبھی کبھی جو فسانوں میں مارے جائیں گے

جو بازوؤں میں یہاں جی رہے تھے دیر سے ہم
خبر نہیں تھی کہ رانوں میں مارے جائیں گے

یہیں پہ مارے گئے ، اور ، یہ سمجھتے رہے
کہ آنے والے زمانوں میں مارے جائیں گے

ہمیشہ رکھتی ہے پرواز اسی لیے نیچی
کہ ہم بلند اُڑانوں میں مارے جائیں گے

ہمارے ساتھ کئی اور بھی ، خبر رکھنا
ہمارے آئنہ خانوں میں مارے جائیں گے

رہے سلامت اگر جاہلوں میں اب تک ہم
تو اتنے فلسفہ دانوں میں مارے جائیں گے

نہیں ہے راس کسی کو جدیدیت اپنی
نئے بھی ہیں تو پُرانوں میں مارے جائیں گے

ظفر ، وہ شیر ہمیں کچھ نہیں کہے گا ، مگر
یہ سارے لوگ مچانوں میں مارے جائیں گے

-☆-

اہلِ دنیا سہی، دنیا میں نہیں رہ سکتا
پانی ایسا ہوں کہ دریا میں نہیں رہ سکتا

یاد اس دل سے دھواں بن کے نکل جاتی ہے
یہ بگولا کسی صحرا میں نہیں رہ سکتا

قابلِ دید جو منظر ہے، وہی اب مرے ساتھ
رات بھر خواب تماشا میں نہیں رہ سکتا

خود سے باہر نکل آنا مری مجبوری ہے
میں اگر اپنے بقایا میں نہیں رہ سکتا

حال ہی سب کو اڑائے لیے پھرتا ہے، کہ اب
کوئی بھی ماضی و فردا میں نہیں رہ سکتا

ایک رونق سی لگا رکھتا ہوں خود ہی سرِ شام
اور، میں خود اسی اثنا میں نہیں رہ سکتا

کیا بتاؤں کہ نہیں ہوتا ہوں، یا ہوتا ہوں
دیر تک میں اسی دبدھا میں نہیں رہ سکتا

مجھے کچھ اور ہی ماحول ہے درکار، کہ میں
کہیں موجود و مہیا میں نہیں رہ سکتا

میں تو پہلے ہی چھلکتا ہوا پھرتا ہوں، ظفر
وہ بھی اب اپنے سراپا میں نہیں رہ سکتا

☆

لفظ جس طرح معانی میں نہیں رہ سکتا
میں وہ مچھلی ہوں کہ پانی میں نہیں رہ سکتا

مجھے ایک اور زمانے کا سفر ہے درپیش
میرا کردار کہانی میں نہیں رہ سکتا

مجھے تحریر کرو تاکہ رہوں بھی کچھ دیر
میں حکایاتِ زبانی میں نہیں رہ سکتا

زور پہلا سا روانی میں نہیں رہ سکتا
اس لیے مطلعِ ثانی میں نہیں رہ سکتا

اُس نے بھی ڈھونڈ لیے ہیں نئے گاہک شاید
میں بھی اب اتنی گرانی میں نہیں رہ سکتا

اپنے ہی ذہن پہ کرنا ہے بھروسا مجھ کو
یاد کچھ یاددہانی میں نہیں رہ سکتا

دیکھنا یہ ہے کہ اب اور بھلا میں کب تک
اپنی ہی ہستیِ فانی میں نہیں رہ سکتا

چاہے پھر آپ ہی پیچھے کہیں رہ جاؤں، کہ میں
دیر تک نقل مکانی میں نہیں رہ سکتا

خس و خاشاک تمنا تو بڑی شے ہے، ظفر
کچھ بھی اس شعلہ بیانی میں نہیں رہ سکتا

☆

ہو کوئی ایک تو اکثر میں نہیں رہ سکتا
رونق اتنی ہے کہ میں گھر میں نہیں رہ سکتا

مجھ سے آگے تو نکل سکتا ہے کوشش کر کے
جو ابھی میرے برابر میں نہیں رہ سکتا

بات کھلتی ہے تو کھل جائے، کہ میں اُس کی طرح
رات دن ایک اسی ڈر میں نہیں رہ سکتا

روز کے روز اُلجھتا ہے مرے پانو سے کیوں
ایک سودا جو مرے سر میں نہیں رہ سکتا

ایک بھولی ہوئی تصویر سے نکلوں تو کسی
یاد آئے ہوئے منظر میں نہیں رہ سکتا

ابتری کی کسی عادت میں گرفتار ہوں میں
رہنا چاہوں بھی تو بہتر میں نہیں رہ سکتا

اِک ستارہ سا چمک جاتا ہے اطراف میں، جو
اُس کے بدلے ہوئے تیور میں نہیں رہ سکتا

اک ہیولیٰ سا کسی خواب و خبر کا اِک بار
اندر آ جائے تو باہر میں نہیں رہ سکتا

ایک ٹھوکر کو ترستا ہوں سرِ راہ، ظفر
اور اب میں یہاں پتھر میں نہیں رہ سکتا

☆

یہ جو قابو نہیں لگ رہا
مجھ کو آہو نہیں لگ رہا

مدتیں ہو گئیں، اک طرف
وہ ہی بدخو نہیں لگ رہا

اب دعا ہی لگے تو لگے
کوئی دارو نہیں لگ رہا

شیوتوں پہ ہے اب انحصار
زورِ بازو نہیں لگ رہا

ناو منجدھار میں پھنس گئی
ہاتھ چپو نہیں لگ رہا

اور تو لگ رہا ہوں وہی
ایک آنسو نہیں لگ رہا

سامنے ہے مرے دیر سے
یہ، مگر، تُو نہیں لگ رہا

خار و خس ہے وہی چار سُو
مجھ سے جھاڑو نہیں لگ رہا

جس کے اطراف تھے سب ظفر
وہ بھی ہر سُو نہیں لگ رہا

☆

کوئی چارہ نہیں لگ رہا
اور دوبارہ نہیں لگ رہا

ڈوبنا چاہتا ہوں ، مگر
یہ کنارہ نہیں لگ رہا

میرے ماتھے بہت دیر سے
اک ستارہ نہیں لگ رہا

کچھ سمجھ کا ہیر پھیر ہے
یا اشارہ نہیں لگ رہا

بات پوری نہیں ہو رہی
زور سارا نہیں لگ رہا

کیسے تعمیر ہو اب نئی
اینٹ گارا نہیں لگ رہا

شعر ہوتا ہے ویسے تو ٹھیک
کچھ کرارا نہیں لگ رہا

رات بیتی نہیں لگ رہی
دن گزارا نہیں لگ رہا

خوش نہیں ہے ، اگرچہ ظفرؔ
مارا مارا نہیں لگ رہا

☆

عیب عالی نہیں لگ رہا
اور ، مثالی نہیں لگ رہا

بے مزہ ہو گئی شاعری
لفظ گالی نہیں لگ رہا

لوگ کرنے لگے اعتبار
شعر جعلی نہیں لگ رہا

آ رہا ہے اک ایسا خیال
جو خیالی نہیں لگ رہا

کر گئے لوگ ہجرت ، مگر
شہر خالی نہیں لگ رہا

ہاتھ پھیلا بھی رکھا ہے ، اور
میں سوالی نہیں لگ رہا

ایک مُدت سے اس شہر کا
کوئی والی نہیں لگ رہا

باغ اُس کے ہوا ہے سپُرد
وہ جو مالی نہیں لگ رہا

ایک مصرع ہی دکھلا ، ظفرؔ
جو بنگالی نہیں لگ رہا

☆

کوئی چارہ نہیں لگ رہا
اور دوبارہ نہیں لگ رہا

ڈوبنا چاہتا ہوں ، مگر
یہ کنارہ نہیں لگ رہا

میرے ماتھے بہت دیر سے
اک ستارہ نہیں لگ رہا

کچھ سمجھ کا ہی پھیر ہے
یا اشارہ نہیں لگ رہا

بات پوری نہیں ہو رہی
زور سارا نہیں لگ رہا

کیسے تعمیر ہو اب نئی
اینٹ گارا نہیں لگ رہا

شعر ہوتا ہے ویسے تو ٹھیک
کچھ کرارا نہیں لگ رہا

رات بیتی نہیں لگ رہی
دن گزارا نہیں لگ رہا

خوش نہیں ہے ، اگرچہ ظفر
مارا مارا نہیں لگ رہا

☆☆

عیب عالی نہیں لگ رہا
اور ، مثالی نہیں لگ رہا

بے مزہ ہو گئی شاعری
لفظ گالی نہیں لگ رہا

لوگ کرنے لگے اعتبار
شعر جعلی نہیں لگ رہا

آ رہا ہے اک ایسا خیال
جو خیالی نہیں لگ رہا

کر گئے لوگ ہجرت ، مگر
شہر خالی نہیں لگ رہا

ہاتھ پھیلا بھی رکھا ہے ، اور
میں سوالی نہیں لگ رہا

ایک مدت سے اس شہر کا
کوئی والی نہیں لگ رہا

باغ اُس کے ہوا ہے سپرد
وہ جو مالی نہیں لگ رہا

ایک مصرع ہی دکھلا ، ظفر
جو بنگالی نہیں لگ رہا

☆☆

کوئی چارہ نہیں لگ رہا
اور دوبارہ نہیں لگ رہا

ڈوبنا چاہتا ہُوں ، مگر
یہ کنارہ نہیں لگ رہا

میرے ماتھے بہت دیر سے
اک ستارہ نہیں لگ رہا

کچھ سمجھ کا ہی پھیر ہے
یا اشارہ نہیں لگ رہا

بات پُوری نہیں ہو رہی
زور سارا نہیں لگ رہا

کیسے تعمیر ہو اب نئی
اینٹ گارا نہیں لگ رہا

شعر ہوتا ہے ویسے تو ٹھیک
کچھ کرارا نہیں لگ رہا

رات بیتی نہیں لگ رہی
دن گزارا نہیں لگ رہا

خُوش نہیں ہے ، اگرچہ ظفر
مارا مارا نہیں لگ رہا

☆

عیب عالی نہیں لگ رہا
اور ، مثالی نہیں لگ رہا

بے مزہ ہو گئی شاعری
لفظ گالی نہیں لگ رہا

لوگ کرنے لگے اعتبار
شعر جعلی نہیں لگ رہا

آ رہا ہے اک ایسا خیال
جو خیالی نہیں لگ رہا

کر گئے لوگ ہجرت ، مگر
شہر خالی نہیں لگ رہا

ہاتھ پھیلا بھی رکھا ہے ، اور
مَیں سوالی نہیں لگ رہا

ایک مُدّت سے اس شہر کا
کوئی والی نہیں لگ رہا

باغ اُس کے ہوا ہے سپُرد
وہ جو مالی نہیں لگ رہا

ایک مصرع ہی دکھلا ، ظفر
جو بنگالی نہیں لگ رہا

☆

آشیانہ نہیں لگ رہا
یہ ٹھکانا نہیں لگ رہا

اور اپنا اب اس شہر میں
آب و دانہ نہیں لگ رہا

جس زمانے میں رہتے تھے ہم
وہ زمانہ نہیں لگ رہا

جس سے ملنا تھا کچھ، یہ تو وہ
آستانہ نہیں لگ رہا

نوحہ خوانی کہاں تک سنیں
وہ ترانہ نہیں لگ رہا

سعی ہر بار کرتے بھی ہیں
اور، نشانہ نہیں لگ رہا

زور اس پر ہمارا بھی کچھ
غائبانہ نہیں لگ رہا

شعر کہنے چلے ہیں، کوئی
کارخانہ نہیں لگ رہا

وہ حقیقت نہیں ہے، ظفر
جو فسانہ نہیں لگ رہا

-☆-

باہر اندر نہیں لگ رہا
گھر بھی کیوں گھر نہیں لگ رہا

آسماں تو بہت دور ہے
میں زمیں پر نہیں لگ رہا

شور محشر ہے، لیکن، مجھے
شور محشر نہیں لگ رہا

چھوڑ آیا ہوں خود کو کہیں
اب مجھے ڈر نہیں لگ رہا

اس پہ گذران ہے رات دن
جو میسر نہیں لگ رہا

مجھ سے آگے ہے، لیکن، ابھی
میرا ہمسر نہیں لگ رہا

ایک پتھر ہے اس ہاتھ میں
اور، پتھر نہیں لگ رہا

مجھ سے باغی بھی ہو کر کوئی
مجھ سے باہر نہیں لگ رہا

میرا بستر بھی اب تو، ظفر
میرا بستر نہیں لگ رہا

-☆-

میں جو حیراں نہیں لگ رہا
کیوں پریشاں نہیں لگ رہا

کام مُشکل نہیں ہے ، مگر
پھر بھی آساں نہیں لگ رہا

اصل میں ہے بیاباں ہی
جو بیاباں نہیں لگ رہا

عافیت کوش سب ہو گئے
کوئی میداں نہیں لگ رہا

اپنی ہی داستاں پر ابھی
مجھ سے عنواں نہیں لگ رہا

کون آباد ہے اس میں اب
گھر جو ویراں نہیں لگ رہا

جس قدر یہ دھکا پیل ہے
اُتنا ساماں نہیں لگ رہا

ہو بھی سکتا ہے ، لیکن ، ابھی
کوئی امکاں نہیں لگ رہا

شکر کرتا ہُوں ، سب میں ، ظفر
میں نُمایاں نہیں لگ رہا

☆

مجھ کو ایسا نہیں لگ رہا
یا تماشا نہیں لگ رہا

صرف اپنا نہیں لگ رہا
ورنہ کیا کیا نہیں لگ رہا

لگ رہا ہے یہاں جی ، مگر
کُچھ زیادہ نہیں لگ رہا

بہت اچھا تو ہے اب بھی وہ
پہلے جیسا نہیں لگ رہا

کام اُلٹا نہیں ہے ، مگر
مُجھ کو سیدھا نہیں لگ رہا

کُچھ دنوں سے تُمھارے سمیت
کُچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا

اُس کی اُونچی ہے سب سے اُڑان
جو پرندہ نہیں لگ رہا

پانی اتنا روانی میں ہے
پھر بھی دریا نہیں لگ رہا

باغِ دُنیا بھی اب تو ، ظفر
باغِ دُنیا نہیں لگ رہا

☆

تپتی ہوئی دعا کی طرح مستجاب ہو
خالی حسد میں جی نہ جلا ، کامیاب ہو

پھر پوچھنا ، کدھر ہے رُخِ منزلِ مُراد
ان راستوں کی دُھول میں کچھ دن خراب ہو

بیگانہ وار جھیل سے ہو کر گذر نہ جا
ممکن ہے کوئی پھول ابھی زیرِ آب ہو

پھر بھی گذر بسر نہیں ہوتی کسی طرح
دل میں جو ایک طرح کا ہی اضطراب ہو

کس کو خبر ہے ، خوابِ سحر کی فضاؤں میں
ایک اور آفتاب پسِ آفتاب ہو

کوئی اُدھیڑ بُن تو رہے بھی کسی قدر
کیا فائدہ ہے بات اگر بے نقاب ہو

ناقابلِ یقیں سہی ، امکان یہ بھی ہے
ایک اور بھی حُباب کے اندر حُباب ہو

کوئی بھی اور کارگزاری فضول ہے
کافی ہے یہ کہ شاخِ نظر پر گلاب ہو

خوابوں کا سلسلہ ہو بہت دور تک ، ظفر
حق تو یہ ہے کہ خواب کے باہر بھی خواب ہو

☆

چھپا ہوا جو نمودار سے نکل آیا
یہ فرق بھی ترے انکار سے نکل آیا

پلٹ پڑا جو مَیں سر پھوڑ کر محبت میں
تو راستہ اُسی دیوار سے نکل آیا

مجھے خریدنا کچھ بھی نہ تھا ، اسی خاطر
مَیں خُود کو بیچ کے بازار سے نکل آیا

ابھی تو اپنے کھنڈر ہی کی سیر تھی باقی
یہ تُو کہاں مرے آثار سے نکل آیا

بہت سے اور طلسمات منتظر ہیں مرے
اگر کبھی ترے اسرار سے نکل آیا

مجھے بھی دے رہے تھے خلعتِ وفا ، لیکن
نظر بچا کے مَیں دربار سے نکل آیا

سرے سے جو کہیں موجود ہی نہ تھا ، آخر
وہ نقص بھی مرے کردار سے نکل آیا

نئی فضا ، نئے آفاق ہیں اُسی کے لیے
جو آج اُڑتی ہوئی ڈار سے نکل آیا

اُسی کو ایک غنیمت قرار دوں گا ، ظفر
جو ایک شعر بھی طومار سے نکل آیا

☆

ہجومِ حسرت و آلام سے نکل آیا
نکل پڑا تو میں آرام سے نکل آیا

مجھے یقیں ہی نہیں آ رہا کہ اتنی جلد
پھنسا ہُوا میں ترے دام سے نکل آیا

شمار کر رہے تھے وہ جسے مری نیکی
میں اپنے آپ اُس الزام سے نکل آیا

جہاں پہ آ گیا تھا حُسنِ اتفاق سے وہ
وہیں پہ میں بھی کسی کام سے نکل آیا

غروب ہو گیا جب ایک چاند اندھیرے میں
تو ایک اور لبِ بام سے نکل آیا

کیا جو غور تو جیسے اک اور مطلب بھی
ڈھکے چھپے ترے پیغام سے نکل آیا

اک اور دن تھا مرا منتظر اُسی لمحے
اگر میں اپنی کسی شام سے نکل آیا

مجھے کفن کی طرح لگ رہا تھا سر تا سر
میں ڈر کے جامۂ احرام سے نکل آیا

پڑی مجھے روشِ خاص بھی بہت منہگی
جو میں، ظفرؔ، روشِ عام سے نکل آیا

☆

اقتدار جاوید کے نام

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں ، امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

مجید امجد

صد چاک جو کرتے سو گریبان ہی نشتے
موجود وی رہ کر کوئی ہر آن ہی نشتے

سب مورچے باندھے ہُوئے بیٹھے ہیں چھتوں پر
دروازہ ہے ٹُوٹا ہُوا ، والان ہی نشتے

بازار اُجاڑے تے اُکھاڑے ہیں کئی گھر
ظاہر کسی تعمیر دا عنوان ہی نشتے

اتنا وی نہیں جان بچانے کو لُڑھک جائیں
اس کوہ تے محفوظ تو ڈھلوان ہی نشتے

جنّات دا ڈیرا ہے جدھر جائیں ، جدھر آئیں
یُوں اپنی جگہ اپنا پرستان ہی نشتے

تڑ تڑ کا کوئی شور سا اُٹھتا ہوا ہر آن
اس درجہ کہ جنگل کوئی سُنسان ہی نشتے

صدقے کروں اُس پر ، کتے دل ہی نہیں موجود
قُربان کروں اُس پہ ، کوئی جان ہی نشتے

منظر کوئی منتا کسی آواز کا آہنگ
دیوار تماشا میں کوئی کان ہی نشتے

پھر کس سے حفاظت کی توقّع ہو ، ظفر خان
اللہ اگر اپنا نگہبان ہی نشتے

☆

نشتے : (پشتو) نہیں ہے۔

ارمان ہی نشتے ، سر و سامان ہی نشتے
جد اُس سے مُلاقات دا امکان ہی نشتے

ہر سُو گُل و گلزار ہے ، کیا خاک اُڑائیں
رستے میں جو پڑتا سی بیابان ہی نشتے

کچھ اس میں حقیقت وی ہُوئی جاتی اے شاید
ہم پر یہ ترے پیار دا الزام ہی نشتے

شک ہو تو پکڑ کر کہیں بھجوائیں گے وی اوہ
خالی کوئی جُرمانہ و تاوان ہی نشتے

اب تیرے حوالے سے ہی جانیں گے ہمیں کوئی
اپنی کوئی اس شہر میں پہچان ہی نشتے

گرمی وہ محبت کی ہُوئی ہے کہاں غائب
پہلا سا پشاور میں وہ مُلتان ہی نشتے

آنکھیں وی ہیں تنہائی دی ماری ہُوئی اپنی
محفل میں اکیلا دلِ نادان ہی نشتے

خلقت ہے کسی رنگ پشیمان وی ہُن تے
حیران ہی نشتے ، یہ پریشان ہی نشتے

ہم نے اُسے ہُن کیا سے بنا ڈالا ہے کیا کیا
باقی تو وہ پہلا سا ظفر خان ہی نشتے

☆

آغاز ای نشتے ، کتے انجام ای نشتے
ہم اوہ ہیں کہ اپنا نسب و نام ای نشتے

کجھ وچ کے جو کوئی تھے غائب ہوئے اوہ وی
مدت توں کوئی نامہ و پیغام ای نشتے

مدت توں ہمارا وہاں آنا ہے نہ جانا
اُس کوچے وچ اپنا تو کوئی کام ای نشتے

آخر نوں سرِ راہ کیا ہم نے ٹھکانا
کیا کرتے کہ دیوار و در و بام ای نشتے

تم سے تو صفائی کدی مانگی نہیں ہم نے
تم پر تو ہمارا کوئی الزام ای نشتے

تکلیف ہماری تے نہ ہو کوئی پریشان
تکلیف وہاں کیا جہاں آرام ای نشتے

دن ڈوبتے ای رات نے پھیلائی سیاہی
ایہہ شام اے کیسی کہ سرِ شام ای نشتے

مرغوب حسینوں کو نہیں سیر و تماشا
ایہہ باغ عجب ہے کہ گل اندام ای نشتے

اس میں وی ظفر، لطفِ سخن ڈھونڈتے ہیں آپ
جب شعر میں یکسر کوئی ابہام ای نشتے

☆

تقریر ای نشتے ، کوئی تحریر ای نشتے
یکسو کیے رکھتی ہو جو زنجیر ای نشتے

دل ہمہ وصل تے خوش کیوں نہیں اتنا
اور سانحۂ ہجر تے دل گیر ای نشتے

چھوڑی اے کتے بیچ میں اُمید مُلاقات
کیا دیکھنا جس خواب دی تعبیر ای نشتے

ہم اپنے ستارے توں مدد چاہتے ، لیکن
یوں ہے کہ ہماری کوئی تقدیر ای نشتے

یہ دل ، یہ گرہ کھول کے وی دیکھتے اک دن
کچھ اپنے تئیں ناخنِ تدبیر ای نشتے

کافر اے جو تلوار تے کرتا ہے بھروسا
مومن ہے اگر ہاتھ میں شمشیر ای نشتے

ہوائیے ہُن کس سے ترے وصل دا تعویذ
تیرے تے ہوا اپنا کوئی پیر ای نشتے

ایسے ہی کوئی تمغۂ رسوائی عطا ہو
اس شہر میں اپنی کوئی توقیر ای نشتے

ڈھاتے کہ بناتے کہیں یہ کہنہ عمارت
فارغ ہیں ، ظفر ، جذبۂ تعمیر ای نشتے

☆

جس جال میں پھنسنے لگے وہ جال ای نشتے
پاتال تک آئے ہیں تو پاتال ای نشتے

بدحال وی ہوتے تو کتے کرتے کجھ اظہار
اس عُمر وچ اپنا تو کوئی حال ای نشتے

پہنچا ہوں میں جب چاند ستاروں کے برابر
یاد آیا کہ اپنے تو پر و بال ای نشتے

ہے سادہ بہت خواب تُمھارے کی فسوں گاہ
اور ، اس توں زیادہ کوئی جنجال ای نشتے

آغاز میں رکھی نہیں انجام دی پروا
تفصیل کو روتے رہے ، اجمال ای نشتے

اوہ شام اُتاری تو ستارے ہُوئے غائب
اوہ شکل بنائی تو خد و خال ای نشتے

دھونے لگے کپڑے تو ہَوا ہو گیا پانی
کھانے لگے روٹی تو وہاں دال ای نشتے

کیا رکھتے حساب اپنے شباب گذراں دا
جب عُمر گُزاری تو مہ و سال ای نشتے

پلٹے جو کدی بالۂ ہستی میں تو دیکھا
موجُود نیں سارے ! ظفر اقبال ای نشتے

☆

اقرار دی خبرون میں انکار دی خبرون
حیران کیے رکھتی ہیں اخبار دی خبرون

کیا قافلے تے گذری اجے کجھ نہیں کھلتا
ملتی ہیں اجے قافلہ سالار دی خبرون

ہاں دشت وفا دا اوہ مُسافر کہ ہمیشہ
پیچھے رہیں مُجھ سے مری رفتار دی خبرون

دم بھر نوں اُٹھے گا وہاں افسوس دا اک شور
پہنچیں گی جہاں وی مرے آثار دی خبرون

توں اوہ ایں جسے یوں تو کسے نے نہیں دیکھا
چھپتی رہیں لیکن ترے دیدار دی خبرون

ہے اصل تے اوہ جو ترے آنے کا پتا دے
باقی سبھی خبرون نیں بیکار دی خبرون

گذرے نیں زمانے کہ اوہ موسم نہیں پلٹا
دیتا تھا ہَواواں نوں جو اشجار دی خبرون

بس ایک سی حالت ہے جدھر اور جہاں جاؤ
خبرون سبھی کی ہیں یہ دو چار دی خبرون

رل مل کے لگاتی ہیں ، ظفر ، طرفہ تماشا
اس پار دی خبرون میں اُس پار دی خبرون

☆

خبرون : (سندھی) خبریں

ملتی ہیں کہاں تازہ تر آفات دی خبروں
دن وچ وی جہاں چلتی رہیں رات دی خبروں

دیندے رہے تفصیل اِدھر اور اُدھر دی
سنسر ہُوئی سبھ اُس دے طلسمات دی خبروں

اُس کو تے ایہ چاند اور ستارے وی بہت نیں
سُورج کدی رکھدا نہیں ذرّات دی خبروں

غائب ہے کوئی کاٹ کے اُس دا ای تراشہ
باقی نیں اُسی طرح ترے ساتھ دی خبروں

جب صرف دی اشیا دا یہاں قحط پڑا تھا
ہر صفحے تے چھپتی رہیں بہتات دی خبروں

جب نشر و اشاعت دا یہ عالم ہے تو اکثر
رُکتی ہیں کہاں اپنی مُلاقات دی خبروں

دیکھیں گے اجے بات پہنچدی اے کہاں تک
دیتے ہیں اجے تک تے شُروعات دی خبروں

جو کُجھ وی ہو، اندر ای دبا لیتے ہیں سارا
اُڑتی نہیں کیوں پیر کرامات دی خبروں

چھاپن گے ظفر کیا کدی کُھل کر وی کسے طور
ہر سمت میں پھیلے ہُوئے خطرات دی خبروں

-☆-

آئی ہیں بہت سلسلۂ راز دی خبروں
تلوار سے ملتی نہیں پشواز دی خبروں

دیکھو تو مرے شُعبدۂ خوابِ سُخن توں
نکلیں گی سراسر کسی اعجاز دی خبروں

گھر میں آں پڑے تارِ تساہل سے بندھے، اور
اخبار میں دیتے ہیں تگ و تاز دی خبروں

اِک یہ بھی تماشا ہے کہ چھپتی ہیں اکٹھی
کنجشک فرومایہ و شہباز دی خبروں

ہوتے ہیں وقُوعے ای کسی ہور طراں دے
بکھری ہیں جو ہر سُو نئے انداز دی خبروں

ساروں نے اُچھالے مری رُسوائی دے قصّے
اور، سبھ نے چھپائیں مرے اعزاز دی خبروں

تقسیم ہیں اِس طور سے دو صاف دھڑوں میں
بعضوں کے خیالات ہیں اور بعض دی خبروں

اِس طرح رواں ہوں گے اشاروں میں کنائے
زنہار بنیں گی نہیں الفاظ دی خبروں

اوہ وقت وی آئے گا، ظفر، دیکھتے رہنا
مُونگی نکل آئیں گی زُباں ساز دی خبروں

-☆-

پھیلی ہیں جو ہر سُو روشِ عام دی خبرون
اس میں سے ای نکلیں گی کئی کام دی خبرون

ہے عرش مُعلّٰی تے سُراغ سفرِ جاں
ہیں فرش پہ بالائے لبِ بام دی خبرون

محتاط ہی رہنا کہ مِلا رکھی ہیں اُس نے
بنگال کی خبرون میں آسام دی خبرون

جیسے الگ ایک ایک جماعت ہے سیاسی
کب آئیں گی تیرے مرے ادغام دی خبرون

کس طرح دھنسی اور پھنسی رہتی ہیں ، دیکھو
آغاز دی خبرون وچ انجام دی خبرون

دو چار دن احباب میں رہتی کوئی رونق
لگتیں کدی اس بندۂ بے دام دی خبرون

ہُن میری وضاحت وی لگا دیجیے اک دن
چھاپی ہیں بہُت آپ نے الزام دی خبرون

اب خُود ہی الگ کیجیے اُن کو تو بجا ہے
کُچھ صبح دی خبرون میں ہیں شام دی خبرون

خبرون ، ظفرؔ ، باندھ کے رکھی ہیں الگ سے
اور ، ان کے علاوہ ہیں سبھی نام دی خبرون

☆

آئی ہیں مجھ ایسے کئی اصحاب دی خبرون
جس طرح کہ بھولے ہُوئے آداب دی خبرون

اچھا ہے ، کوئی مُجھ پہ بھروسا نہیں کرتا
میں بھی تو سُناتا ہُوں کسی خواب دی خبرون

افواہ سمجھ کر وی نہیں چھاپتے اُس کو
میں بھیجتا ہُوں آئنہ تاب دی خبرون

سُنتے ہیں وہ روزانہ بہُت صبر و سُکوں نال
ہوراں دی زبانی دلِ بے تاب دی خبرون

تحریر ہُوا طائرِ بے پَر دا فسانہ
پانی پہ لکھی ماہیِ بے آب دی خبرون

اعدا کے توسُّط سے نکلتی ہیں شب و روز
اُس انجمنِ ناز وچ احباب دی خبرون

لتھڑی ہُوئی لوگوں کے لہُو سے سَحَر و شام
آتی ہیں اجے گُنبد و محراب دی خبرون

ہر روز وُہی نکلے ہُوئے جوڑ کی سُرخی
ہر شب وُہی ٹُوٹے ہُوئے اعصاب دی خبرون

ہر صبح سے رَستی ہُوئی انہار کے شوشے
اور ساتھ کسی کھُلتے ہُوئے باب دی خبرون

☆

دروازہ نکالیں کہاں ، دیوار ای نشے
کیا گرمی بازار ہو ، بازار ای نشے

پہلے تھی مُصیبت کہ مُلاقات نہ تھی سہل
اور ، ہُن یہ خرابی ہے کہ دُشوار ای نشے

پیدا کیے جاتے ہیں وہی مال دھڑادھڑ
منڈی میں یہاں جس کا خریدار ای نشے

کیوں سنگ زنی ہون لگی اے سحر و شام
کوئی وی اجے تیرا گنہگار ای نشے

سو وی اے برابر کسے بھونچال دی زد پہ
اس دِل دے سِوا اپنا تو گھر بار ای نشے

اُس نوں ہی ملا تیری محبت دا خزانہ
جو تیری توجہ دا سزاوار ای نشے

سیلاب دا پانی تے گھراں میں وی گھس آیا
ایہہ شہر اجے خواب توں بیدار ای نشے

کہتے ہیں ترے شعر میں ابلاغ نہیں ہے
تسلیم کہ اپنا ایہہ سروکار ای نشے

ہوں صرف تماشائی ، ظفر ، اس توں علاوہ
اس کھیل وچ اپنا کوئی کردار ای نشے

☆

عاشق ہوں تو معشوق فقط دُور ای نشے
ملنے کا یہاں پر کوئی دستور ای نشے

کہنے کی ہے جو بات وہ مُنہ سے نہیں کہتا
کرنے کا ہے جو کام اُسے منظور ای نشے

کن لوگوں کی صُحبت میں رہایش رہی تیری
اگلا سا ترے مُنہ پہ کوئی نُور ای نشے

اوروں کا ہی چرچا ہے ترے کوچہ دِل وچ
اپنا تے وہاں پر کوئی مذکور ای نشے

موہُو میں ویسے تے رنگارنگ خواتین
محفل میں کتے دُخترِ انگور ای نشے

اُس مہر و محبت میں کمی وی نہیں ، لیکن
کیوں ہے کہ یہ دِل آپ دا مشکور ای نشے

کہنے کو تو ہے آنکھ ، مگر ، سارے بدن وچ
بہتا ہوا اس طرح دا ناسُور ای نشے

ہم کر کے سوال آپ ہی شرمندہ ہیں اور بس
ہُن اس توں زیادہ دا تے مقدور ای نشے

دیکھو ، ظفراقبال کی باتوں میں نہ آنا
کُچھ مکر وی کرتا ہے یہ ، مجبور ای نشے

☆

دُنیا وی نظر وچ تاں ایہہ اعزاز ای نِشّے
ہم پہ ترا دروازہ کدی باز ای نِشّے

ویسے تو ارادہ تھا کہ بولیں گے کسی دن
بولے ای جو بولے ہیں تے آواز ای نِشّے

نکلا جو لڑائی نُوں مولا سرِ میداں
دیکھا تو ہمارا کہیں شہباز ای نِشّے

باقی تو ہے موجود سبھی پیرہنِ ناز
پشواز کی تھی فکر سو پشواز ای نِشّے

اچھا ہے کنارہ ترے مہتاب دا لیکن
اپنی تو یہاں طاقتِ پرواز ای نِشّے

ہے عشق سو اعلان وی کر رکھا ہے اس دا
کیا کھولے گا ، اپنا کوئی راز ای نِشّے

ہونا ای نہیں کُجھ تو دل افسردہ کریں کیوں
انجام نُوں کیہہ روئیں جد آغاز ای نِشّے

کیا کیجیے ، فطرت دے نیں اپنے ای قوانین
جو سر نہ جُھکائے گا سرافراز ای نِشّے

اب کے تو ، ظفر ، ہے یہ لطیفہ کہ غزل ہم
پُوری کیے بیٹھے آں ، پس انداز ای نِشّے

-☆-

خط لکھتے اگر ہیں وی تو القاب ای نِشّے
افسوس کہ باقی ادب آداب ای نِشّے

کپڑوں کی تہوں میں جسے رکھا تھا چھپا کر
اب ڈھونڈنے بیٹھا ہُوں تو وہ خواب ای نِشّے

دِل دے وُہی افلاک ، وُہی چاند ستارے
کیوں اے کہ اوہ پہلی سی تب و تاب ای نِشّے

کشتی دا ڈبونا بھی ہُوا چارۂ ناکام
بھرپُور ہے دریا ، کہیں گرداب ای نِشّے

کافر دے شوالے توں کلس ہے کتے غائب
اسلام دی مسجد اے کہ محراب ای نِشّے

اِک وقت ہے ایسا کتے کُجھ وی نہیں ہوتا
دیکھو تو یہاں عالمِ اسباب ای نِشّے

ہوتا وی تے ایسے میں کہاں پار اُترتا
پانی اجے میرے لئی پایاب ای نِشّے

کس طور ستم کوشیِ اعدا دی خبر ہو
اندازۂ خوشنودیِ احباب ای نِشّے

کُھلتا نہیں کیا کُجھ اے ، ظفر ، دُوسری جانب
دیوارِ تماشا میں کوئی باب ای نِشّے

-☆-

ہمیں نے جس ڈوبڈو لیا طرفین ملاکھڑا
لڑتے ہوں جد دُور توں اُس وے میں ملاکھڑا

وحشیانہ مُشتی گوبڑو ہاتھاپائی سُوبسُو
ہوتا رہتا اے یہاں کیہ دن رین ملاکھڑا

سمجھ نہیں سی آ رہی جیت ہار کیا ہوئے گی
الگ الگ وی سی وہاں کجھ ماہین ملاکھڑا

لگا ہُوا ہے رات دن ، دیکھو گے کیا شوق سے
تُم جرنیل ملاکھڑا یا لفٹین ملاکھڑا

یہیں پڑا رہ جائے گا ، کہیں نہیں لے جائے گی
ایہ بے مقصد بیٹھکیں ، ایہ بے چین ملاکھڑا

دھوکے بازی دے سوا ہیرا پھیری اے وہی
دیکھا نہیں کدی یہاں جنٹلمین ملاکھڑا

کُشتی لڑنے آئے سن ، مُشت وخُوں تے آ گئے
آخر تھانے کو چلا بھر کے وین ملاکھڑا

خُون خرابہ تو ہُوا ختم اکھاڑے توں ، مگر
اوہ وی اتنا خُوش نہیں کر کے بین ملاکھڑا

بجلی چلی گئی ، ظفر ، اور ہنیرے چھا گئے
زوراں تے سی جس گھڑی گھر وچ مین ملاکھڑا

-☆-

ملاکھڑا: (سندھی) کُشتی

یہ سنگ چاہییں کتنے ، کوئی صنم روڑا
بہُت زیادہ نہیں ہیں اگر تے کم روڑا

یہاں کجھ اتنا سر عام وی نہیں ہُن تے
لپیٹ کر کسی شے وچ دغہ بم روڑا

سنبھال سکتا ہُوں گرتی ہُوئی یہ دیواریں
نکال سکتا ہُوں راہواں وے پیچ وخم روڑا

ایہ بھر وی سکدا اے رنگین رونقوں سے تری
کدی ہے خانہ خالی میں دو قدم روڑا

ایہ مارکیٹ اے ، عزت توں لے کے شُہرت تک
ہر ایک شے یہاں مل جائے گی ، رقم روڑا

ہمارا کام ہے یہ ، تُوں وی آزما سانُوں
جسے سمجھتے ہیں سب لوک غیر اہم ، روڑا

ستم گری سے تری ہم وی ہیں ڈرے ہوئے کجھ
مگر تُوں آ تے سہی ، نال ایہ ستم روڑا

ترے لبوں پہ لگا ہونا چاہیے کجھ کجھ
اوہ رنگ ہو کہ شرر ، شہد ہو کہ سم ، روڑا

ٹھہر ٹھہر کے نہ روڑا خبر خُوشی دی ، ظفر
سبھی ہیں گوش بر آواز ، ایک دم روڑا

-☆-

روڑا: (پشتو) لے آ۔ دغہ: وہ چیز

وہی پھر آپ توں بیزار سن بھلو چنگو
اوہ آپ دے جو طلبگار سن بھلو چنگو

یہ کِس نے مُجلہ ہستی میں لا کے پھینک دیا
مرے نہ ہون دے آثار سن بھلو چنگو

سب اپنے چاہنے والوں کو تُم نے چھوڑ دیا
وگرنہ اُن میں وی دو چار سن بھلو چنگو

بھرے نیں ہُن تے وہی جس ہے در دل تک
ہمارے زخم ہموار سن بھلو چنگو

کھُلے تے انج کہ پھر واشگاف سن یکسر
اگرچہ پہلے پُراسرار سن بھلو چنگو

فصیلِ خواب توں شب خُون کِس نے مار دیا
کہ اہلِ شہر تاں بیدار سن بھلو چنگو

نجانے خُود پہ ترس کھا گئے آں کیوں ، ورنہ
ہم اپنے درپئے آزار سن بھلو چنگو

ہُوئے نیں تیری مسیحائی توں بہت لاچار
کہ اس توں پہلے تے بیمار سن بھلو چنگو

ظفر کہ آج نمازی ہیں اور حاجی وی
کِسی زمانے میں مے خوار سن بھلو چنگو

☆

بھلو چنگو: (سندھی) بھلا چنگا، خیر و عافیت

ہمارے آر سی اور پار سی بھلو چنگو
تُمھارا تیر طرحدار سی بھلو چنگو

ہنسی وچ اج پھر اُسی شوخ نے اُڑا دی ہے
جس ایک بات پہ اصرار سی بھلو چنگو

اُڑا کے لے گئی پتوں کی طرح تیز ہوا
جو آرزُوؤں دا انبار سی بھلو چنگو

قمارِ عشق میں دیوالیہ ہُوا ہُن تے
ایہہ دل جو اُس دا خریدار سی بھلو چنگو

کہاں کی دھوپ اُسے پل بھر میں آ کے چاٹ گئی
یہاں پہ سایۂ اشجار سی بھلو چنگو

زُباں سے ہور ای کُجھ کہہ گئے او آخرکار
تُمھاری آنکھوں میں اقرار سی بھلو چنگو

بس ایک پانو کی ٹھوکر سے تُم نے توڑ دیا
مرا پیالۂ پندار سی بھلو چنگو

مِلا جُلا دیا ہم نے ای آ کے سارا کُجھ
کہ اس توں پہلے تے معیار سی بھلو چنگو

ظفر ، جہاں پہ اُکھاڑی ہُوئی دُکاناں نیں
یہیں کِتے کوئی بازار سی بھلو چنگو

☆

کسے خبر سی یونہی کم سے کم دروکا دیر
کھلیں گے پھول یہیں ایک دم دروکا دیر

اوہ جا کے خود تاں قدم رنجہ پہلے فرمائیں
جو سانوں حکم اے ، پہنچیں گے ہم دروکا دیر

یہی طریقہ ہے اور سبھ ای کے ہیں پابند
ستم کرن گے اجے اور کرم دروکا دیر

اجے تے پستہ و بادام پہ کریں گذران
اوہ شے وی آئے گی اے محترم دروکا دیر

اجے تے ظاہری صورت تے وارے صدقے جائیں
نکال سکتے ہیں پہلوے ذم دروکا دیر

جدھر توں آئی اے ایہہ سردمہریوں کی ہوا
وہیں سے آئیں گے ناز و نعم دروکا دیر

اک اور بھوک اٹھا لے گی آسماں سر تے
کہ بھول جاؤ گے شورِ شکم دروکا دیر

کھلا ہے دیکھ کے دل اس توں پھول دے مانند
اجے تے آنکھ میں آئے گا نم دروکا دیر

جو سچ کہوں تو کوئی وقت جا رہا ہے ، ظفر
زمین ہونے کو ہے زیر و بم دروکا دیر

☆

دروکا دیر: (بلوچی) تھوڑی دیر ہی میں

جیون دا جو ایہہ حال اے ، مر جائیں گے وڑا
کچھ کام نہ کرنے کا ای کر جائیں گے وڑا

تم سوچتے ساحل دی سجاوٹ میں رہو تم
ہم اپنے سمندر میں اتر جائیں گے وڑا

کچھ روک تاں سکدے وی آں اس تند ہوا توں
سمٹیں گے تو ہم اور بکھر جائیں گے وڑا

کچھ منتظر اپنے وی یہاں ہوں گے ، مگر ، ہم
اس راہ توں پہلے ای گذر جائیں گے وڑا

یوں نیند اجے راہ میں ہو گی کہ یہاں ہم
پہلے ای ترے خواب سے بھر جائیں گے وڑا

ہو گا تو بہت دور اجے سایۂ اشجار
ایسی ہے تری دھوپ ، ٹھہر جائیں گے وڑا

جد تک کہ نہیں ان کی حفاظت دا سہارا
اس دشت سے بےخوف و خطر جائیں گے وڑا

اوہ لہر ای ایسی اے کہ آنے کی ہے بس دیر
ڈوبے جو نہیں اوہ وی ابھر جائیں گے وڑا

اک عمر دے بگڑے ہیں ، ظفر ، پھر وی اے امید
ہن موت اے نزدیک ، سنور جائیں گے وڑا

☆

وڑا: (بلوچی) تب تک

ہوتے ہیں اور بھی کہیں ہوتے ہیں آپی
خواب و خیال سا کدی سوتے ہیں آپی

ملنا کدی ہمارے نصیبوں میں ہو نہ ہو
ہُن بیج انتظار دا بوتے ہیں آپی

کپڑے نویں ہوں یا کہ پُرانے ہوں سوچ دے
سیتے ہیں آپی کدی دھوتے ہیں آپی

ہوی یہیں کتے کوئی مچھلی مُراد کی
پانی سا پانیوں میں سموتے ہیں آپی

دریائے درد توں کہ بہت شور و شر میں ہے
خود نوں نکالتے ہیں ، ڈبوتے ہیں آپی

محتاج دوسروں دے نہیں ساں کسے وی وقت
گاتے ہیں آپی کدی روتے ہیں آپی

اپنا تو ساز و رخت ای باقی نہیں رہا
کجھ دوسروں کا بھار ای ڈھوتے ہیں آپی

اچھے دنوں کی آس میں ہیں دوسروں دے نال
اک دودھ سا ہوا میں بلوتے ہیں آپی

لیتے ہیں ایک عمر خلش دا مزہ ، ظفر
کانٹا کوئی بدن میں چبھوتے ہیں آپی

☆

آپی: (سندھی) باہمی

پُچھا جو میں نے آپ نوں ہے مجھ سے پیار چھت
بولے ، بتا کہ دل اے ترا بے قرار چھت

چل تو دیے ہیں سوچ سمجھ دے بغیر ای
دشوار ہور دیکھیے ، ہے رہگزار چھت

مشکل سہی ایہہ بوسہ، لب تک رسائی وی
ایہہ ایک بار چھت ہے اور بار بار چھت

دریائے دل دی آپ دے گہرائی چاہیے
ساری دی ساری یعنی کہ ہے آر پار چھت

کوئی خبر نہیں اے کہ سودائے عشق وچ
آخر کو نقد چھت ہے اور ہے اُدھار چھت

ایہہ اوہ سفر سی جس دا نہیں اے کوئی حساب
میں چھت رہ گیا ہاں تے گرد و غبار چھت

ہے تاں سہی چمک دی یہ تصویر خواب وچ
مٹنے لگے نیں اس دے وی نقش و نگار چھت

اشجار نوں تے چھوڑیئے ، چلتے ہیں رات دن
اپنی جگہ توں ہل گیا ہے کوہسار چھت

موسم ترا ملا اے جدھر جایئے ، ظفر
گرد و نواح چھت خزاں اے بہار چھت

☆

چھت: (بلوچی) کتنا

نظر تے آ ای رہیا سی کوئی کھلا امباز
سو، ہم جو پہنچے وہاں پر، کوئی نہ تھا امباز

پڑے ساں ہم جو پھینا پھینا ایک طرف
ہمارے واسطے کافی سی اوہ ہوا امباز

تھوڑے ہوئے ساں بہت، اس لئی قناعت کی
اگرچہ ایسے مرض دی نہیں دوا امباز

اوہ سرخرو اے بغل گیر ہو کے ای، ورنہ
کجا سپردگیِ خاص، تے کجا امباز

یہیں سے ہو کے گذردی اے ہُن سواریِ خواب
اساڈی منزلِ جاں دا اے راستہ امباز

ایہہ جھوٹ موٹ دا ملنا وی کوئی ملنا اے
کہ اوہ اے ایک طرف اور ہے جدا امباز

ہم اپنے آپ ای اپنی جگہ بناتے رہے
کدی ہمارے لئی خود وی کھولتا امباز

کسی سے کیا ہو شکایت کہ خود ہمارے لئی
ہماری اپنی وی کجھ دا نہ سی سدا امباز

ہر آن پیاس بڑھاتا ہوا دلاں دی، ظفر
کجھ اور طرح دا ای سی ایہہ سلسلہ امباز

☆

امباز: (بلوچی) آغوش

ہمارے چاروں طرف ہے ایہہ آسماں تالان
ہو جیسے فرش زمیں تے کوئی گماں تالان

نواحِ دل میں ہے کیہہ رونقِ ہجوم ہوس
پڑاو ڈالے ہوئے ہے ایہہ کارواں تالان

عبور کردا چلا آ رہا ہوں مدت توں
مرے عقب میں ہے اک دشت داستاں تالان

اجے سفینہ کسی سمت وی سفر میں نہیں
اجے تلاشِ ہوا وچ اے بادباں تالان

کتے بکھرتے ہوئے رنگ روشنی توں الگ
کتے فصیلِ بدن تے غبارِ جاں تالان

حدِ نظر توں پرے تک سیاہ موسم دا
سفید گھاس دی صورت اے اک جہاں تالان

کتے تے ہے اسے آباد کرنے والا وی
ہے انتظار مکیں وچ کوئی مکاں تالان

ایہہ خواب جند توں دوری تے سی، مگر، دیکھو
چمک رہا ہے اجے تک یہاں وہاں تالان

سمیٹتا اسے کس طرح اور کون، ظفر
کجھ ایسے چاروں طرف اے مرا بیاں تالان

☆

تالان: (بلوچی) پھیلا ہوا، بچھا ہوا

ہاسے ہاسے سوجھرو
آسے پاسے سوجھرو

تھوڑا سا ای ڈال دو
اپنے کاسے سوجھرو

بیٹھا آس ہنیر وچ
پیار پتاسے سوجھرو

ہور ذرا باریک کر
بیس خراسے سوجھرو

ملے گا ہُن ہر تول وچ
تولے ماسے سوجھرو

اندر وی اے روشنی
چڑھا ہے ناسے سوجھرو

ٹُٹیا کُٹیا پھیلدا
پکھی واسے سوجھرو

اچھے پھیلے گا کدوں
عامے خاصے سوجھرو

نہیں اساڈا ہے، ظفر
ستیاناسے سوجھرو

☆

سوجھرو: (سندھی) اُجالا

دل بےتاب دے اوڑو پاڑو
رہیے ہُن خواب دے اوڑو پاڑو

رات لڑائے کئی روز توں بعد
تیرے تالاب دے اوڑو پاڑو

رہتے ہیں منت و زاری دے ہوا
رعب اور داب دے اوڑو پاڑو

جھونپڑا ہُن تے بنائیں گے کدی
کسے سیلاب دے اوڑو پاڑو

دشمنی چاہیے، گھر ہُن ڈھونڈیں
اپنے احباب دے اوڑو پاڑو

عُمر بھر پھرتے رہے آں گویا
اوسے نایاب دے اوڑو پاڑو

کدی خضدار میں ہمیں ڈھونڈے گا
کدی خوشاب دے اوڑو پاڑو

پکڑے جائیں گے کدی مے پیتے
کسے محراب دے اوڑو پاڑو

کُجھ کھچاوٹ اے کئی دن توں، ظفر
اپنے اعصاب دے اوڑو پاڑو

☆

اوڑو پاڑو: (سندھی) اڑوس پڑوس

ہے دریا پار اربیلو
ہمارا یار اربیلو

اُترنے والا ہو جِسراں
کوئی اوتار اربیلو

بہت ٹھُھرا گیا ساتوں
اوہ ٹھنڈا ٹھار اربیلو

جُدا ای کر گیا سبھ توں
ہُوا دوچار اربیلو

اساڈا دوست اے آخر
اوہ دُشمن دار اربیلو

بجائے گھر دے مِلدا اے
سرِ بازار اربیلو

کھروے نیں بزم وچ کیہ کیہ
گُل گفتار اربیلو

کدی قلات وچ مِلیا
کدی قندھار اربیلو

ظفر قابو توں باہر اے
اوہ ناہنجار اربیلو

☆

اربیلو: (سندھی) البیلا

بے رنگی اے رنگ سدائیں
خاموشی آہنگ سدائیں

ٹوٹ نہیں سکدا اے نشّا
پیتے ہوئے نیں بھنگ سدائیں

آسمان دی جانب اُس دی
چڑھدی ہوئی پتنگ سدائیں

کھلی فضاؤں میں پھرتے تھے
رہتے تھے دِل تنگ سدائیں

جسم ہُوا گُم اُس دا جد توں
لگا اساڈے انگ سدائیں

اندرے اندر لگی ہوئی اے
کوئی انوکھی جنگ سدائیں

اور، مجید امجد نے آ کے
کیا عارضی جھنگ سدائیں

ہُونجا پھیر کے چور لے گئے
بچی اے ایک اُمنگ سدائیں

رہ جاون گے ظفر کول اب تو
وہی بھوک تے ننگ سدائیں

☆

سدائیں: (سندھی) جاودانی، ہمیشہ

صف بہ صف جھنجرکو اے
ہر طرف جھنجرکو اے

روشنی دی کترن دے
نال لف جھنجرکو اے

جس وچ اے چمک موتی
اوہ صدف جھنجرکو اے

نُورپُور توں لے کے
تا نجف جھنجرکو اے

جو اے سبھ نُوں نامنظور
اوہ شرف جھنجرکو اے

جھٹ نہیں رہیا کد توں
اِتنا رف جھنجرکو اے

زندگی دے ساحل تے
کف بہ کف جھنجرکو اے

کشف کُجھ نہیں ہوتا
ایہہ کشف جھنجرکو اے

اَج توں ، ظفرؔ ، اپنا
ہر ہدف جھنجرکو اے

☆

جھنجرکو: (سندھی) دمکدا

اصل ظاہر ہویا ہوریاں ہوریاں
رنگ اُترن لگا ہوریاں ہوریاں

پھر مُجھے کُچھ سُنائی نہیں دے سکا
پھر کُچھ اوہنے کہا ہوریاں ہوریاں

کھڑ رہیا سی محبت دا گہرا گلاب
چل رہی سی ہَوا ہوریاں ہوریاں

دِل تے چڑھدا گیا روکدے روکدے
اُس دا رنگِ قبا ہوریاں ہوریاں

پھر وہی دربدر ویکھدے ویکھدے
پھر وُہی جابجا ہوریاں ہوریاں

دیکھنا ایک بارش سے باغِ عدن
ہو رہے گا ہرا ہوریاں ہوریاں

سامنے آنے والا اے سبھ دے یہاں
سبھ کرایا کیا ہوریاں ہوریاں

زندگی لُطف توں اَج خالی ہوئی
اُڑ گیا سبھ مزہ ہوریاں ہوریاں

تُوں ای دیوار ایں سامنے ، اے ظفرؔ
ہُن ایہہ پردہ ہٹا ہوریاں ہوریاں

☆

ہوریاں ہوریاں: (سندھی) ہولے ہولے

پھیرا جو لگائے گا ٹپالی
کُجھ لے کے ای آئے گا ٹپالی

لائے گا کسے دا نامۂ ناز
خالی نہیں جائے گا ٹپالی

لکھنا ای نہیں اے اُس نوں آتا
چِٹھی کیا لائے گا ٹپالی

رُکدے ہوئے کام ہوں گے جاری
یُوں بات بڑھائے گا ٹپالی

لائے گا کدی خُوشی دی خبراں
روتوں کو ہنسائے گا ٹپالی

حالات ہوں چاہے جس طرح دے
اپنی سی نبھائے گا ٹپالی

کُجھ ہور تے کیہہ بچے گا اُس نوں
وردی ای بچائے گا ٹپالی

گھر دے احوال کیہہ میں اُس دے
مُنہ سے نہ بتائے گا ٹپالی

ہے بند ٹپال ، تے ، ظفرؔ نوں
بس مُنہ ای وکھائے گا ٹپالی

☆

ٹپالی: (سندھی) ڈاکیا

کھلدا کیا اپنی ہی تب و تاب میں گڑکھو
کھولا بڑی مُشکل سے مگر خواب میں گڑکھو

آخر تے دُعا دے لئی رستا وی اے درکار
رکھنا سی کوئی آپ نے محراب میں گڑکھو

ہُن روشنی ہو یا کہ ہَوا ، سبھ نے برابر
رکھا ہُوا ہے سندھ کا پنجاب میں گڑکھو

بچنے دی نظر آئی تو ہے ہُن کوئی صُورت
پیدا ہُوا شاید کہیں گرداب میں گڑکھو

ودھ جاتی ہے جد حد توں زیادہ تے کسے طور
ہم آپ بنا لیتے ہیں اعصاب میں گڑکھو

اطراف میں چلدی ہیں جو رُک رُک کے ہواواں
بنتا ہے فصیلِ دلِ نایاب میں گڑکھو

جو کُجھ سی سبھی بہہ گیا طغیان بلا وج
ہم ڈھونڈدے پھردے رہے سیلاب میں گڑکھو

ہے شرط اگر کوئی ضرورت ہو کسے نوں
ہم آپ ای بن سکتے ہیں احباب میں گڑکھو

گنجایش اک اپنی سی نکالی اے ظفرؔ نے
مینڈک نے بنا رکھا ہے تالاب میں گڑکھو

☆

گڑکھو: (سندھی) روزن

اس بات دا روَن کدی اُس بات دا روَن
کِس کام دا اپنا اے ایہہ دِن رات دا روَن

ہنس بول نہیں سکتے ہیں مل کر وی کسے طور
ہے اُس دی مُلاقات مُلاقات دا روَن

رُکنے میں ای آتے نہیں بادل دے ایہہ آنسو
ویکھا نہیں جاتا ہے ایہہ بہتات دا روَن

اپنی تے سمجھ وچ ای نہ آئے گا کہ آخر
ایہہ قحط دا روَن ہے کہ برسات دا روَن

ہُن ہور تے کِس بات دا روَن ہو کہ اس بار
درپیش اے اپنی ای شکایات دا روَن

حالات توں باہر جو نظر کی ہے تو یکسر
ہم بھول گئے تنگیِ حالات دا روَن

اُس ہت دا تے کیہ ذکر کہ ہوتا ہے یہاں پر
ہر روز نئی توں نئی آفات دا روَن

ماتم اے کدی سُوکھتے سبزے دا شب و روز
تے ہے کدی اُجڑے ہُوئے باغات دا روَن

کُجھ ہُن تے ، ظفر ، صورتِ حالات عجب سی
الفاظ توں باہر سی خیالات دا روَن

☆

روَن: (سندھی) رونا

باج دا باج تھا اچھواُجرو
چل رہی سی ہوا اچھواُجرو

اجے کُجھ وی پتا نہیں چلدا
کیا نہیں ہے تے کیا اچھواُجرو

خالص آٹے دی کھائی روٹی آج
اور ، پانی پیا اچھواُجرو

ہم اُسی پر نہ چل سکے ، ورنہ
اوہو سی راستہ اچھواُجرو

شہر آباد اے کوئی مُجھ میں
خُوش خبر ، خُوشنما ، اچھواُجرو

دُھند ای دُھند اے جدھر ویکھیں
سی یہی سلسلہ اچھواُجرو

ہُن دُھواں دھار اے جو سی پہلاں
روشنی جا بجا اچھواُجرو

اوہو خالص ترین اے سبھ توں وکھ
اور ، سبھ توں جُدا اچھواُجرو

ویکھ سکدے ساں آرپار ، ظفر
سی بدن وی اوہ کیا اچھواُجرو

☆

اچھواُجرو: (سندھی) صاف شفاف

لگا سی جس قدر دشوار موکھی
پڑا اُتنا ای اوہ ہموار موکھی

ڈبوتا وی نہیں دریا دے اندر
لگاتا وی نہیں اے پار موکھی

جہاں جاون توں ڈرتا ہاں سراسر
وہیں لے جائے گا اس بار موکھی

ہے اُس وی گرمجوشی دوسروں تک
مگر لگتا ہے ٹھنڈا ٹھار موکھی

میں خود نوں ویچ کر اُس نوں خریداں
جو مِل جائے سرِ بازار موکھی

بہُت چنگا بھلا ہوتا ہے، لیکن
بدل جاتا ہے ملتےسار موکھی

کسے کام آ تو سکتا ہوں، مگر، میں
سمجھتا ہے بہُت بیکار موکھی

اُسی کو ہُن کوئی پروا نہیں ہے
کیا خود جس نے ای بیمار موکھی

ظفر جس کام سے بچدا ساں ہر طور
اوہی کرنا پیا ناچار موکھی

☆

موکھی: (سندھی) مجھے

اوہ دلبر ہمارا پھرندرگرندڑ
ہے سارے دا سارا پھرندرگرندڑ

سکوں وچ ذرا آ گیا سی، مگر، اوہ
ہُوا ہے دوبارہ پھرندرگرندڑ

سمندر سی زیر و زبر، لیکن اب تو
ہُوا ہے کنارہ پھرندرگرندڑ

ہُنے پھول کر پھر پچکنے لگا ہے
ایہہ دل دا غبارہ پھرندرگرندڑ

زمیں تے کوئی پھل بُجھدا چمکدا
فلک تے ستارہ پھرندرگرندڑ

ہُنے زیب تن سی، ہُنے فرش تے ہے
کسے دا غرارہ پھرندرگرندڑ

خسِ خواب دی جستجو وچ اے میرے
تمھارا شرارہ پھرندرگرندڑ

کدی آ ای جائے گا واپس یہیں پر
اساڈا اوہ پیارا پھرندرگرندڑ

ظفر پھر سے غائب اے اپنے دناں توں
یہیں سی بچارہ پھرندرگرندڑ

☆

پھرندرگرندڑ: (سندھی) متلون

کوئی بھرپور تماشا ٹمار
سامنے سی کوئی دریا ٹمار

کوئی انسان وی ہوتا ان میں
ہے جو حیوانوں سے دُنیا ٹمار

پھر وی کُجھ ہور دی گنجایش سی
سی مرا جام تمنا ٹمار

جھانکنے کو وی مُیسّر نہیں ہُن
خاک سے تھا کبھی صحرا ٹمار

ہاں محبت ای محبت ہُن تاں
میں کدی ساں نہیں ایسا ٹمار

ایک پل دے لئی آیا جو نظر
حُسن توں سی اوہ دریچہ ٹمار

ایک ای رات دی بارش سے ہُوا
زندگی دا ایہ پیالہ ٹمار

آرزوؤں سے بھرا تھا ہر جسم
رات ہر شخص سی کیا کیا ٹمار

آن وی آن میں خالی سی، ظفرؔ
نظر آتا تھا جو اتنا ٹمار

-☆-

ٹمار: (سندھی) لبالب

ہمارے ہاتھ تھیں جیسے دُعا میں ہورو سور
شجر نہ تھا کوئی اتنا ہَوا میں ہورو سور

زمانہ ہو گیا آواز دی تھی مَیں نے اُسے
سو آج تک ہے ایہ صحرا صدا میں ہورو سور

کوئی پتا نہیں چلدا سی اس طرح سے ہُوا
مرے نصیب دا بدّل گھٹا میں ہورو سور

کُجھ اس طراں سے ہُوا ہو گئی کہ کیہ بتلائیں
جو آرزو سی دلِ مُبتلا میں ہورو سور

کُجھ اُس توں بچ کے مَیں جا ای نہیں سکا کتے پھر
کرشمہ سی کوئی اُس دی ادا میں ہورو سور

زیادہ سی کوئی حیرت وی میری آنکھوں میں
کُجھ اُس دا رنگ بدن سی قبا میں ہورو سور

کسے طرف وی نہیں جا رہیا سی اُس لمحے
جو راستا سی کسے نقشِ پا میں ہورو سور

مَیں اپنا آپ وہاں ڈھونڈدا کہاں آخر
جہاں خدائی سی ساری خُدا میں ہورو سور

جو دیکھیے تے اوہ انکار وی عجب سی، ظفرؔ
جو اصل وچ سی کسے دی رضا میں ہورو سور

-☆-

ہورو سور: (بلوچی) الٹ پٹ

لوٹی ہے ارض و سما تے کاروات
ہم تو ہیں خالی ہوا تے کاروات

ہے ، مگر ہم کو نظر آتا نہیں
ماسوا اور ماورا تے کاروات

اپنا سونا وی یہاں پیتل ہوا
ہم ہوئے جس کیمیا تے کاروات

بند کر کے آسماں دے راستے
پھر کیا ہم کو دُعا تے کاروات

بات سنتا ای نہیں میری کوئی
میں جو ہاں صوت و صدا تے کاروات

وقت ایسا وی کدی آئے گا جد
ہو سکاں اُس خوشنما تے کاروات

ہر کتے میرا اثر ناپید اے
لگ رہا ہوں جا بجا تے کاروات

خود نہیں چلنے کا ایہہ سارا نظام
ہے کوئی ارض و سما تے کاروات

کُجھ نہیں باقی بچا جد توں ، ظفر
اوہ ہوئے اس بے نوا تے کاروات

☆☆

کاروات: (بلوچی) ناسور

ٹھنڈی جو پڑی گرمیِ بازار اناگت
ہونے لگے خود توں وی اوازار اناگت

جد ہور بدلتے نہیں اطوار اناگت
کیوں اُس دی بدل جاتی ہے رفتار اناگت

چلتے رہے کیہہ جاپے کد توں ایہہ جراثیم
انکار اناگت اے نہ اقرار اناگت

کل تک جو کوئی کام نہ سی اپنے حسابوں
لگنے لگا اوہ کام وی دُشوار اناگت

جاگ اُٹھنے کا جن کے کوئی امکان ای نہیں سی
ہُن ہونے لگے خواب توں بیدار اناگت

معدوم سا ہو جاتا ہوں پھر اس دی خوشی وچ
مل جاتے ہیں جد اپنے ای آثار اناگت

میں حبس دی حیرت میں پڑا تھا کہ سرِ شام
ہونے لگا ہر زخم ہوادار اناگت

اُس دی وی کُجھ آنکھوں میں چمک سی ہوئی پیدا
میں وی ساں اسی بات پہ تیار اناگت

تُم تو ظفر اک پیکرِ تسلیم و رضا تھے
ہو جاندے او کیوں برسرِ پیکار اناگت

☆☆

اناگت: (بلوچی) اچانک

ایہہ جو ہیں زرد ہُوا دے ارسن
ان میں ہیں ساری فضا دے ارسن

کجھ مرے سازِ سخن دی آہیں
کجھ مرے برگ و نوا دے ارسن

خاک وچ گُم ہُوئے رفتہ رفتہ
میری لاچار دُعا دے ارسن

کتے ملتے نہیں ڈھونڈے سے وی ہُن
اوہ جو رکھے تھے دُعا دے ارسن

تیز بارش دا تماشا نہیں ایہہ
ہیں کوئی ارض و سما دے ارسن

آج دی بات نہیں اے رونا
ایہہ تے ارسن ہیں سدا دے ارسن

کتے شیون اے مری شاموں کا
کجھ مری طبعِ رسا دے ارسن

فرق دوہاں کی خوشی وچ اے، مگر
ایک ہیں شاہ و گدا دے ارسن

کہیں بہتے ہیں خدائی میں، ظفر
آسماناں تے خُدا دے ارسن

☆

ارسن: (بلوچی) آنسو

جو وی ہوتے ہیں عام خاص ملور
کبھی رہتے ہیں آس پاس ملور

ہوئے عہدِ خزاں توں پہلاں ای
پھُول پتے اُداس، گھاس ملور

دھان ہیں محوِ یاس مُدت توں
اور، رہتے لگی کپاس ملور

ہُوا موسم دا ای اثر شاید
اُس دے ہونٹوں کی ہے مٹھاس ملور

پہلے دن توں یہی تناسب ہے
پانچ خُوش نیں تے ہیں پچاس ملور

شیون و نالہ دا تے ذکر ای کیہ
قہقہے بھی ہُوئے اُداس، ملور

کجھ وی حاصل وُصُول انہیں نہ ہُوا
سبھ ہیں تیرے وفاشناس ملور

دل دی جولانیاں کجھ اور ای سن
ہم ای کرتے رہے قیاس ملور

ہُن وی گھر دی فضا وُہی اے، ظفر
بہو ناخُوش ہے، اور، ساس ملور

☆

ملور: (بلوچی) اُداس

ایہہ ہوا کیوں اے دربدر انکس
کجھ ہمیں وی نہیں خبر انکس

حُسن نُوں گھیر لائے گا کسے دن
نہیں اُمید عشق پہ انکس

سبب اس دا اے رات ای شاید
کدی روشن نہ سی سحر انکس

خوش خیالی کوئی محبت وچ
نہ اُدھر ہے نہ ہے ادھر انکس

ہم ای گذرے تھے کیوں اُدھر سے بھلا
سی جو سنسان رہگذر انکس

اس توں کیوں کر بچاؤ ممکن سی
جو محبت ہے سر بسر انکس

ہم کتے راستے میں پڑ رہتے
سی اجے ہمتِ سفر انکس

شعر دا شور پڑ گیا ٹھنڈا
یا نہیں کاوشِ ہنر انکس

شاعری ڈر کے چھوڑ دی اے، ظفر
راہ تھی ہی ایہہ پُرخطر انکس

☆☆☆

انکس: (بلوچی) آتی

میں جہاں ڈھونڈتا رہا دلگوش
کبھی کُچھ سی، مگر نہ تھا دلگوش

قہر ہے ایک دُوسرے دے لئی
کتے باقی نہیں رہا دلگوش

حُسن تے بازار وچ ای ملدا اے
جد وی چاہو خریدنا دلگوش

روز اوّل توں ہم تو جانتے ہیں
کہ کجا اوہ صنم، کجا دلگوش

عرضِ مطلب دے لب تے آتے ای
گفتگو سے ہوا ہُوا دلگوش

ایہہ وی مُمکن تے ہے کہ ڈال ای دے
اُس دے دل وچ کتے خدا دلگوش

دیکھ کے ہم پھر گئے سی وہیں
اُس دی آنکھوں میں سی ذرا دلگوش

سو رہے ہوں کہ جاگدے، ہر دم
دل میں رہتا ہے خواب سا دلگوش

اُس دے شر توں نہ بچ سکا ہاں، ظفر
میں نے جس سے روا رکھا دلگوش

☆☆☆

دلگوش: (بلوچی) التفات

جس قدر سی مری گفتار میں سرا بزا
جمع ہوتا رہا بیکار میں سرا بزا

ایک دو لفظ ای کافی تھے مری رائے میں تو
کیوں سی اتنا ترے انکار میں سرا بزا

صرف میں ای نہیں ، سچ پُوچھیے تو میرے ہوا
ہور وی سی مرے آثار میں سرا بزا

سُننے والوں کو تردّد وی کرے گا پڑنا
ہے بہُت کوشش اظہار میں سرا بزا

طائروں اور ہَواؤں نے سَحَر ہوتے ای
بھر دیا ہے کوئی اشجار میں سرا بزا

چشم ولب دی تے الگ بات ہے لیکن ہُن تک
وَی موجود اے دیدار میں سرا بزا

کوئی گاہک نہیں مِلتا ہے مگر ہم پھر وی
بیچتے پھرتے ہیں بازار میں سرا بزا

ہُن ہو گنجایش اصلاح کہاں سے ، ہُن تے
بھر چکا اے مرے افکار میں سرا بزا

چھاپ لی شاعری جیسی وی مُیسّر سی ، ظفر
ڈھونڈ سکتے نہ تھے انبار میں سرا بزا

-☆-

کہتے اگر مرا جینا نہیں ہُوا تالان
تو کیا ہُوا ، مرا مرنا تو ہو گیا تالان

خبر دے پھُلن کھِڑے باغ وچ روش پہ روش
اُسی قدر ہوئی اخبار وِچ ہُوا تالان

کہانیاں کئی تالان ہوتی رہتی ہیں
اگرچہ ہوتا نہیں کوئی واقعہ تالان

مُدیر نے میری تصویر ای نہیں چھاپی
نہ اُس نے ہون دیا نام وی مرا تالان

جو کر دیا ہے بہُت خُوش ہیں یار لوگ اُس تے
حِساب اُس کا بھی دیں جو نہیں کیا تالان

ہمیں وی شک و شُبہ وچ رکھا گیا شاید
ہُوا ہے آج ای جو اشتہار سا تالان

ہماری حیرت و حسرت کریں الگ شائع
اور ، ایک رنگ ندامت کریں جُدا تالان

اُسی میں ہو جو حکایت ہمارے ہوون دی
ہُوئی ہے سر پہ جو اُنڈی ہوئی گھٹا تالان

ظفر ، ہماری ای سازش نہ ہو کوئی اِس وچ
جو کُلّیات ہمارا نہ ہو سکا تالان

-☆-

خود نوں جو کر سکے نہیں تیرے میں ہورتور
کرتے ہیں روشنی نوں اندھیرے میں ہورتور

کر دی اے رفتہ رفتہ جو خود نوں اُسی میں گم
ہوتی ہے رات آپ کے میرے میں ہورتور

ہم وی گھرے ہوئے ساں کسے خواب وصل وچ
گھوڑی ہوئی جد آ کے پچھیرے میں ہورتور

ہونا ای سی تے اُس میں جگہ وی نہیں سی قید
گھر وچ نہیں تے ہو گئے ڈیرے میں ہورتور

تد تک کجھ اُس دی شکل و شباہت ای ہور سی
جد تک ہوا رہی اے پھیرے میں ہورتور

ہونا سی آخر اُس نے سرِ راہ کیا کہ اوہ
ہونا ہمارے ساتھ بسیرے میں ہورتور

اُس دی پسند دا وی رکھاں گے ذرا خیال
ہونا اے جس نے شام دے گھیرے میں ہورتور

تنہائی پانیاں دی وی دیکھی نہ جائے گی
مچھی تاں ہو رہے گی مچھیرے میں ہورتور

خلقت توں ساں میں خود نوں بچائے ہوئے، ظفر
اور، ہو گیا ہوں آخری پھیرے میں ہورتور

☆

ہورتور: (بلوچی) گندم

اُس نے سو طرح سے ماری اے پگار
کدی آدھی، کدی ساری اے پگار

مل جو لیتے او کدی ماہ بہ ماہ
ایہہ وی سمجھو تو ہماری اے پگار

ایک دم بند وی کر سکدے نئیں
ابھی کیا کم ہے کہ جاری اے پگار

ہور کجھ سوجھ نہیں سکتا ہے
اپنے سر تے اجے طاری اے پگار

جھلملاہٹ اے اجے تک باقی
درمیاں توں جو گزاری اے پگار

ڈھونڈ لیتی اے نشانہ اپنا
اس طرح دی ایہہ شکاری اے پگار

لے وی سکتے ہیں کسے دن واپس
ایہہ وی سمجھو کہ اُدھاری اے پگار

ہم تے ہیں صرف وکھاوے دے لئی
اصل وچ تُم ہو، تُمھاری اے پگار

ہم نے بیگار وی بھگتی اے، ظفر
ہور ہوں گے جنھیں پیاری اے پگار

☆

پگار: (بلوچی) تنخواہ

غلطی سے ای آج ہو دلگوش
اس طرف وی کدی کرو دلگوش

ہے چھچھلتی ہوئی نظر کافی
ابھی کرنی ہے آپ کو دلگوش

بس ہمیں ای خبر نہیں ہوتی
کر دے رہندے او آپ تو دلگوش

مُسکراہٹ ، اِشارہ ، لاگ لپیٹ
آپ نوں ہو پسند جو دلگوش

عاقبت دے لئی بھی اے بہُت
جو ہم ایسوں پہ کر چلو دلگوش

تُم یہ بتلاؤ ، ہم کہاں جائیں
تُم تغافل نوں وی کہو دلگوش

وقت ای رفتہ رفتہ بیت چکا
پاس اپنے ای اب رکھو دلگوش

کیوں ہیں ایسی رُکی رُکی نظریں
اور ، کیا ہے ایہہ گو مگو دلگوش

ہور کیہ تینوں چاہیے ہے ، ظفرؔ
کبھی اُس سے جو لے مرو دلگوش

☆

دلگوش: (بلوچی) توجہ، التفات

اوہ تھا جتا جتاری
تے ، کیا جتا جتاگری

آ کر سبھ نوں کر گیا
کیسا جتا جتاگری

دُشمن ہے ، تے یار ہے
اپنا جتا جتاگری

آیا سبھ دے نال جو
بیٹھا جتا جتاگری

پھر نہیں دیکھا آج تک
ویسا جتا جتاگری

گیا وی سبھ توں جُدا جو
آیا جتا جتاگری

ایسا سی جیہراں کہ ہو
پہلا جتا جتاگری

سچا ہوراں دی طراں
جھوٹا جتا جتاگری

ہُن وی اے سبھ توں ظفرؔ
کِتنا جتا جتاگری

☆

جتا جتاگری: (بلوچی) جدا گانہ

دروازہ نکلا کوئی ناچار اناگت
رستے میں مرے آ گئی دیوار اناگت

سن بند ای آنکھوں کے دریچے اجے لیکن
غائب ہوئے اُس خواب دے آثار اناگت

اپنے ای طریقے سے ہُوا کرتا ہے سبھ کُجھ
آسان اناگت اے نہ دُشوار اناگت

جس طراں تری شکل اناگت ہوئی معدوم
ہو جائے گا اِنج ای ترا دیدار اناگت

حیراں سا مجھے کر گیا موسم دا بدلنا
ایہہ دل جو ہُوا تیرا طلبگار اناگت

ہو سکدی سی ایہہ بات مؤخر وی کسے طور
اچھا تے لگا سی ترا اقرار اناگت

دریا دے وی اوقات نیں دونوں طرف اپنے
اوہ آر اناگت اے نہ کُجھ پار اناگت

سوتا وی ہُوں اور جاگتا رہتا وی ہُوں یکسر
ہوتا نہیں میں نیند توں بیدار اناگت

ایہہ زہر، ظفر دیر سے چڑھدا اے بدن نُوں
لگدے نہیں اس طرح دے آزار اناگت

☆

اناگت: (بلوچی) اچانک

جیبھ دل دا ہورت آرت
اچھا خاصا ہورت آرت

ٹوٹا خواب دا اِک کنارہ
نال ای میں تھا ہورت آرت

ایک چھناکے سے ہوتی ہے
ساری دُنیا ہورت آرت

منّے منّے سی ثابت سالم
منّے ہے کیسا ہورت آرت

فرش تے گرنے توں پہلاں ای
سی آئینہ ہورت آرت

ہو جاتا ہے نال ہمارے
کام ہمارا ہورت آرت

مُڑدا ہُوا وی ہو جاتا ایں
رفتہ رفتہ ہورت آرت

نازک اے اوہ، ہو سکدا اے
آندا جاندا ہورت آرت

ٹکڑے ٹکڑے، ظفر، آپ اپنے
ہُوا تھا ایسا ہورت آرت

☆

ہورت آرت: (بلوچی) چکنا چور

اگرچہ اُس دا بظاہر تے مَیں ای تھا آماج
مگر ، غریب کوئی ہور ہو گیا آماج

اگر یہ ایک نشانہ خطا گیا اُس دا
تو جان لو کہ لگائے گا دُوسرا آماج

اجے نہیں کوئی منزل نگاہ وچ میری
ایہہ اوہ سفر اے کہ میرا اے راستہ آماج

مَیں اپنے مطلب و معنی توں آں بہت اگے
کہ اپنا ایک تو ہوتا نہیں سدا آماج

مرا ہدف نیں بیک وقت ایہہ بہار و خزاں
کدی تے زرد اے اپنا کدی ہرا آماج

ہوا بچاری نشانہ بنائے گی مجھے کیہہ
کہ ایک عمر توں میں جو نہیں ہوا آماج

مٹا دیا ہے یہ نزدیک و دُور دا جھگڑا
اساڈے پیشِ نظر اے جو فاصلہ آماج

ایہہ میرا صدق اے جو مجھ سے خاص اے ہُن تک
اثر توں آپ کرے گی مری دُعا آماج

شکار کر دا اے ، ویکھاں گے کون کس نوں ، ظفر
مَیں ہاں خدا دا ، تے میرا اے خُود خُدا آماج

☆

آماج: (بلوچی) نشانہ

کوئی خدائی دا سی یا خدا دا نندارہ
اوہ جس کسے دا وی ہو ، سی بلا دا نندارہ

مَیں خُود تاں اَج ای شرابور ساں پسینے وچ
مرے نصیب میں سی بس ہَوا دا نندارہ

ایہہ ساری ویکھی ہوئی صُورتاں نیں شام و سحر
ہُوا نہیں کسے ناآشنا دا نندارہ

مَیں اُس دا رنگ بدن ای سمجھ رہیا ساں ، مگر
اوہی سی اصل میں رنگِ قبا دا نندارہ

اگرچہ دیر ہوئی بند نیں مری آنکھیں
مری نظر وچ اے ہُن جا بجا دا نندارہ

اجے تے ہور بہت کُجھ پیا اے قابلِ دید
ہے ہور وی ستم ناروا دا نندارہ

مَیں اُس جگہ ساں مجسّم نگاہ دی صُورت
جتھے نہیں سی ہما و شما دا نندارہ

وکھائی وی نہ دیا ، تے سنائی وی نہ دیا
عجیب سی تری آواز پا دا نندارہ

مَیں لکھتا رہتا ہُوں کاغذ تے اپنی بات ، ظفر
مَیں ویکھ سکدا ہاں اپنی صدا دا نندارہ

☆

نندارہ: (بلوچی) نظارہ

لگا ہمیں کیہ اچھا چُرمٹ
اُٹھا ہویا چہرے دا چُرمٹ

غلط سلط جیسا وی سی اوہ
سدھا سی یا اُلٹا چُرمٹ

ہمیں دور توں ویکھ کے اُس نے
ہور وی ذرا گرایا چُرمٹ

ہور کام میں لگے ہوئے تھے
ہم نے نہیں اُٹھایا چُرمٹ

دیر سی کمرے وچ آون دی
کیہ پردہ تے کیسا چُرمٹ

آخر توں اُس دے چہرے تے
بوسوں کا پھیلایا چُرمٹ

ایہہ چُرمٹ اے کوئی ہور ای
کتھے گیا اوہ پہلا چُرمٹ

ہوا سی ، تے اُس دے ہلتے سن
پل پل گرتا اُٹھدا چُرمٹ

کیہ قندیل ، ظفر ، روشن سی
جھمک جھمک کردا چُرمٹ

☆☆

اگر پہنچے گا نظر دریچے
تے کٹ جائے سارا سفر دریچے

اسے اس قدر بے بضاعت نہ جان
اپنے خواب وچ اے خبر دریچے

ہوا ایک پاسے دی چلدی ہوئی
پسینے میں تر اے شجر دریچے

جو چوری چھپے آنا چاہیں جناب
کھلا ہے محبت دا در دریچے

لئی پھر رہا ہاں جو آدھا بدن
نہ جانے ہوا گم کدھر دریچے

خزانہ ہے اوہ کھول دے ٹھیک ٹھاک
اجے ہور اے مال و زر دریچے

گذردا اے آخر کہاں سارا وقت
کہ آنے لگے او نظر دریچے

ایہہ ساری خرابی کہیں پر تو ہے
جو ہوتا اے اُس تے اثر دریچے

کہاں چھوڑ آئے او باقی ، ظفر
کہ ایہہ تے ہے سارا ہنر دریچے

☆☆

دریا توں واتری ہو کہ صحرا توں واتری
گویا ہے اپنے خواب تمنا توں واتری

اپنی شکست وی فقط اپنی اے سر بسر
ہے سبھ دے نال ، پھر وی اے تنہا توں واتری

جتنا وی واپس آیا ہاں کافی سمجھ اے
گجھ ہی دِنوں میں ہوئی بقایا توں واتری

جو ویکھتا ہاں میری سمجھ توں ہے دُور تر
ہوتی اے روز باغ تماشا توں واتری

میں سوچتا ہوں حسرت ہستی دے موڑ تے
دیکھوں کہ ہون والی اے کیا کیا توں واتری

مُجھ میں رہا نہیں اے مرا اپنا آپ ای
جس دم ہوئی اے اُس دے سراپا توں واتری

خُود ہی بچا ہُوں ، سبھ سر و سامان جا چکا
اپنی گلی ہوئی سی ہمیشہ توں واتری

اُس دا یقین ای ہمیں آتا نہیں کتے
ایہہ واتری اے خواب زلیخا توں واتری

جو ہو ، ظفرؔ ، کہ رخت سفر دے بغیر ای
ہُن جلد ہون والی اے دُنیا توں واتری

-☆-

واتری: (بلوچی) واپسی

ظاہرا تے ہُوا مکاں ڈُرتنگ
اصل وچ سی اوہ آسماں ڈُرتنگ

ایہہ پلازے ، حویلیاں ، ایہہ محل
ہون والا اے سبھ یہاں ڈُرتنگ

ہو رہیا اے بدن توں اک آغاز
اجے ہونا اے قصرِ جاں ڈُرتنگ

بعد وچ جا کے جبہ سائی کی
کیا پہلے وہ آستاں ڈُرتنگ

اجے دیوار دل سی کارآمد
کیتا اس نوں وی رائگاں ڈُرتنگ

ہُن یقیں توں اُمید کیہ رکھیے
کر لیا اے اگر گُماں ڈُرتنگ

ایک دُنیا نویں وساون نُوں
کدی کرنا ایں ایہہ جہاں ڈُرتنگ

آئے دن آپ کردا رہندا ہاں
اپنا پیرایۂ بیاں ڈُرتنگ

ہو ، ظفرؔ ، درپئے غزل کد توں
اسے کر وی چھکو ، میاں ، ڈُرتنگ

-☆-

ڈُرتنگ: (بلوچی) مسمار

ایک نُکلا تے دُوسرا اے زند
جس نوں دیکھو وہی پڑا اے زند

اک تھکاوٹ اے چار سُو جاری
باغ لاچار اے ، ہوا اے زند

جو برسدی اے ، تے نہ کھلدی اے
دُور توں آئی اے ، گھٹا اے زند

کر رہی اے خُدائی وی آرام
نالے افلاک تے خُدا اے زند

روشنی ایں کتے نڈھال الگ
تے ، ہنیرا یہاں جُدا اے زند

رنگ وی تازہ دم نہیں اب کے
زرد پژمُردہ اے ، ہرا اے زند

ایہہ زمین ای نہیں اے تنہا سُست
آسماں وی تے ایک سا اے زند

مجھ میں پھُرتی نہیں رہی ، نہ سہی
اوہ تاں مجھ سے وی دوگنا اے زند

جو پہنچدی نہیں کتے وی ، ظفر
کجھ دناں توں مری صدا اے زند

☆

زند: (بلوچی) مضمحل

نقشکوں کئیں بہت بنایا لوغ
اور پھر آپ ای گرایا لوغ

کدی آون کی دی نہیں دعوت
اوس نے دُور توں وکھایا لوغ

قدر اُس دی نہ کر سکے کجھ ہم
مل گیا سی بھرا بھرایا لوغ

شہر وچ ایک ای شجر اے میاں
ڈھونڈیے اُس دے زیرِ سایہ لوغ

کجھ پُرانی ای طرز دا سی ، مگر
سارے لوغاں وچ ایک بھایا لوغ

اُس نے آنا اگر نہ سی ، ہم نے
کس لئی اس قدر سجایا لوغ

نام ای اُس دا جاندا سی کوئی
نہ کسے نے ہمیں بتایا لوغ

کدی زخمی کیا اے راکٹ نال
اور بم سے کدی اُڑایا لوغ

شہر وچ اگ جدوں لگی سی ، ظفر
اسیں اپنا ای کیوں بچایا لوغ

☆

لوغ: (بلوچی) مکان

اُس دِل دے آس پاس مرا گھر نہیں انوں
مَیں اُس دی خاک پا دے برابر نہیں انوں

آواز دا اے شک جیہا آواز دے بجاے
باہر نہیں انوں ، کِتے اندر نہیں انوں

کوری اے جیویں میری تلی دی ہر اک لکیر
لکھا گجھ ان پہ میرا مُقدر نہیں انوں

انبار جنے لگے ہوئے اُمید دے تے ہین
آنکھیں جو مانگتی ہیں مُیسّر نہیں انوں

اُس کم نُما دی دُور توں اُڈدی ہوئی جھلک
ہے دِن وِچ ایک وار ، مکرر نہیں انوں

فریاد کر سکیں کدی اُس کول جا کے ہم
حالت اساڈی اتی وی ابتر نہیں انوں

ٹھہرا ہُوا تو رہتا ہے دِل اُس دی یاد نال
کم کم تے ہے ضرور ، پہ اکثر نہیں انوں

ہیں اُنج تے ساری رونقیں ہر سُو لگی ہوئیں
اس رات وِچ اوہ ماہ مُنور نہیں انوں

مَیں اپنی دُھن میں جا تو رہا ہُوں ، مگر ، ظفر
اگے کُھلا ہُوا کوئی منظر نہیں انوں

-☆-

انوں : (بلوچی) ہنوز ، ابھی

دِن تے جاری اے رات دی انگار
ہور اجے تک نہیں رُکی انگار

ہر طراں توں اے مہرباں ہم پہ
کدی دھکی اتے کوئی انگار

کہہ رہے نیں کہ دوستانہ ہے
اور ہے صرف عارضی انگار

جس تے پروے ای ڈالدے رہے ہم
سی اوہ ہر طرح سے کُھلی انگار

طرح دیتے رہے اسیں یکسر
اور پھر سر تے آ پئی انگار

ہم تے اپنے ساں آپ دے ، صاحب
اور ، ہوتی تھی ہم پہ ہی انگار

ایہہ وی ہم پر نہیں کُھلا ہُن تک
دشمنی سی کہ دوستی انگار

سانوں بس آپ یاد آتے ہیں
جد وی ہونے لگے کوئی انگار

ناتواں جان کر ، ظفر ، ہم پہ
جلدبازی وِچ اُس نے کی انگار

-☆-

انگار : (بلوچی) یلغار

نیا خواب آ کر دکھاتا اے چوش
سو کام اور وی گڑبڑاتا اے چوش

ایہ ساری جفا جیسے اُس دی نہ ہو
جو ملتا ہے اور مسکراتا اے چوش

کوئی کام دی بات ہوتی نہیں
کہ باتاں وچ آ کے اگاتا اے چوش

کدی رنگ اے تے کدی اے پتنگ
ہواواں میں جو سرسراتا اے چوش

مجھے آ ای جاندا اے آخر یقین
کہانی بنا کر سُناتا اے چوش

مرے اشک رُکنے وچ آتے نہیں
مرے چار سُو کھلکھلاتا اے چوش

اوہ اگلا سا انداز ای ہُن نہیں
نہ آتا اے چوش اور نہ جاتا اے چوش

ہوائیں ای رہتی ہیں پھر میرے نال
اوہ بدل بنا کے اُڑاتا اے چوش

ظفر دا نہیں اے کوئی اور چھور
کہ روتا اے چوش اور گاتا اے چوش

☆

چوش: (بلوچی) وہ

جو ویکھو نہ صحرا نہ دریا اے ایش
عجب کوئی رنگ تماشا اے ایش

کدوں تک فریب نظر کھائیں ہم
کہ دُنیا نہیں، خواب دُنیا اے ایش

وُہی چاہتا اے چھڑوانا ہمیں
ہمیں کام ای ایک آتا اے ایش

خزاں دُور اے میرے دل توں اگر
تو پتا سا کیوں کھڑکھڑاتا اے ایش

کوئی ہے درختوں میں جو شام توں
ہوا دی طراں سنسناتا اے ایش

جگہ کوئی خالی تے رہنی نہ سی
اگر اوہ نہیں اے، لہذا اے ایش

نہیں اے اجے کوئی دل وچ ہوا
اجے ویکھنا تے ترستا اے ایش

پڑا اے یونہی دل دے اندر لہو
کتے ہور آتا نہ جاتا اے ایش

گراتا تے ہے سارے پردے ظفر
کدی کوئی پردہ اُٹھاتا اے ایش

☆

ایش: (بلوچی) یہ

عجب نہیں جے سزا و جزا اے یک ہمک
عجب اے ایہ کہ چمن دی ہوا اے یک ہمک

تُسیں وی سُن کے یقین اُس دا آئے شاید ای
اگر سنو تے بڑا ماجرا اے یک ہمک

اگر تُم اس نُوں خُدا دی رضا سمجھدے او
تو جان لو کہ رضائے خُدا اے یک ہمک

یہاں توں کوئی نہیں واپسی دی گنجایش
جے چل پئے او تے ایہ راستہ اے یک ہمک

اثر سے اس دا تعلّق بہت ای کم کم اے
کہ اس نواح میں میری صدا اے یک ہمک

اساڈے حق میں خیال اُس دا ہو نہیں سکدا
سبب یہی اے کہ اوہ سوچدا اے یک ہمک

اساڈے دل وچ اُسی دا اے عکس شام و سحر
سو، کیوں نہ ہو کہ ہر اک آئنہ اے یک ہمک

اُس انجمن میں کوئی میری بات وی سُندا
مجھے قبول نہیں ، فیصلہ اے یک ہمک

تری طرف کدی ویکھے تے اوہ وی جان ظفر
بجا نہیں کہ تیرا ویکھنا اے یک ہمک

-☆-

یک ہمک: (بلوچی) یک طرفہ

انسان سبھ جو ہو لے حیوان یک دمان
آیا حضور شاہ توں فرمان یک دمان

دشوار ہو گئی مری اتنی جو زندگی
سو کام ہو گئے مرے آسان یک دمان

آیا اوہ بے شک اور کسی کام سے ، اُسے
میں ہو گیا ساں ویکھ کے حیران یک دمان

اپنے عناد ، اپنی عداوت دے باوجود
کِسراں کیا ہے آپ نے احسان یک دمان

موسم دا معجزہ اے ، اسے اور کیہ کہیں
بدلا اے باغ وچ جے بیابان یک دمان

کس طراں ایہ مہکنے لگا اے دل ایک دم
کیہا دھڑک اُٹھا اے گلستان یک دمان

سی واقعہ ای ایسا کہ سی اوہ وی دم بخود
تے ، میں وی رہ گیا ساں پریشان یک دمان

پھر اوہ وی ہو کے رہ گیا سیلِ ہوا میں گم
پیدا ہُوا تے سی کوئی امکان یک دمان

حیرت زدہ اُسے وی کیا چاہیے ، ظفر
ایہ عشق ہے تے کیجیے اعلان یک دمان

-☆-

یک دمان: (بلوچی) یک لخت

گھٹ اے نہ سارا ہوار
اُس دا ہمارا ہوار

کر لیا سبھ کُجھ الگ
ہُن اے دوبارہ ہوار

موج ہوس اے جُدا
اور ، کنارہ ہوار

کیوں نہیں تقدیر اِک
جد ہے ستارہ ہوار

ہو نہیں سکدا اے ہور
اپنا گزارہ ہوار

پھٹ کے بکھرنے لگا
سی جو غبارہ ہوار

اس مرضِ خواب دا
کیجیے چارہ ہوار

ہم وی پہنچے کدی
ہے جے غرارہ ہوار

اس نوں بچا لیں ، ظفر
ہے ایہہ سہارا ہوار

-☆-

اوہ جو نہ تھا اندیختہ
ہم کو رہا اندیختہ

تُجھ توں الگ اِک خوف اے
تُجھ توں جُدا اندیختہ

مُجھ کو تے لگتی اے یہی
چلتی ہوا اندیختہ

یا ایہہ خُدائی سی خطر
یا اے خُدا اندیختہ

ہر موڑ اِک ڈر جاپیے
ہر راستا اندیختہ

سبھ کُجھ لُٹایا راہ وچ
باقی بچا اندیختہ

کُجھ اپنا ڈر اے رات دن
کُجھ آپ دا اندیختہ

جد شام رُخصت ہو گئی
تو آئے گا اندیختہ

مر تاں گئے او اے ، ظفر
ہُن اور کیا اندیختہ

-☆-

اندیختہ : (پشتو) اندیشہ

چاندنی وچ سی تے چنار میں ہور
نالے سی میرے آرپار میں ہور

اُس دے آندے ای لگ گئی کیہی
خس و خاشاک انتظار میں ہور

گرم رفتار کارواں سی بہُت
اُڈ رہی سی کوئی غبار میں ہور

اور ، کھڑے ساں قطار وچ ہم بھی
مِل رہی تھی جہاں اُدھار میں ہور

ٹھنڈ جیہی پڑ گئی سی آنکھوں میں
سی کوئی ہور ای شرار میں ہور

برف سی کوہسار تے ہر سُو
جل رہی سی بس ایک غار میں ہور

ہُن تے بلدے کُھلسدے رہندے آں
سی کدی اپنے اختیار میں ہور

ایک طوفانِ رنگ سی برپا
لگ رہی سی اوہ لالہ زار میں ہور

موسم اِک شعلہ سی شجر میں ، ظفر
سی جو اس طرح برگ و بار میں ہور

☆

ہور : (پشتو) آگ

حُسن دا رنگ سی ہوا داسے
اور ، اوہ وی سی جا بجا داسے

اوہ بدن وی سی آتشیں سارا
آگ سی شعلۂ قبا داسے

بھیڑ وچوں گذر نہیں سی کوئی
رُک گیا سی اوہ راستا داسے

راستے اپنے آپ کُھلدے گئے
سامنے توں کوئی ہٹا داسے

ودھ رہیا سی وہاں ہنیرا ہور
جل رہیا سی کوئی دیا داسے

سی سجھاں دی سمجھ توں باہر و باہر
سی وہاں کوئی سِلسلہ داسے

ڈھونڈدی پھر رہی سی ساری خُدائی
کتے غائب ہُوا خُدا داسے

اُس توں آتے تھے پُچھ کر موسم
باغ سی اوہ ہرابھرا داسے

کتے رہندا اوہ یادگار ، ظفر
کام ہوتا کوئی کیا داسے

☆

داسے: (پشتو) ایسا، ایسی

بھلایا اسے ، تے نکالا کشالہ
کہ پہلے تو سب سی کشالہ کشالہ

اساڈی تے ناکام اے ساری کوشش
نکالیں گے ہُن حق تعالیٰ کشالہ

کیا ہم نے اُس نوں وی شامل بالآخر
نکلتا نہیں بالا بالا کشالہ

جو عاجز وی اُس توں بہت آ گئے سان
مگر سی کوئی بہت اعلیٰ کشالہ

شمھیں وی شناسائی کافی تھی اُس سے
ہمارا وی سی دیکھا بھالا کشالہ

نکالا ہے اپنی مہارت سے ہم نے
اوہ اپنا ای نازوں کا پالا کشالہ

جو نکلا تے ویکھو اُسی وقت اُس نے
ہماری طرف ای اُچھالا کشالہ

تھے کُچھ ہور وی مُستحق ، لیکن اُس نے
ہمارے گلے وچ ای ڈالا کشالہ

ظفر ہے نکل کے وی ویسے دا ویسا
کہ سی کوئی ایسا نرالا کشالہ

-☆-

کشالہ : (پشتو) مُنّا

جو نہیں اے کتے نہیں ، پہ خُدائے
اُس خُدا تے مرا یقین ، پہ خُدائے

ظلم دے ہیں وُہی وُہی انداز
آسماں ہے مُجھے زمیں ، پہ خُدائے

جو مِرے آس پاس ہے ہر دم
مُجھے مِلدا نہیں کہیں ، پہ خُدائے

ہے وُہی سنگ آستاں اُس دا
جِھس چُکی اے مری جبیں ، پہ خُدائے

مینوں کرنا پڑا دوبارہ ای
کر چُکا ساں جو پیش ازیں ، پہ خُدائے

سطح تے جو نظر نہیں آندی
ہے کوئی چیز تہ نشیں ، پہ خُدائے

شور اے جس مکان وچ اینا
کوئی اُس دا نہیں مکیں ، پہ خُدائے

جد یہاں توں اوہ بے خبر گذرا
میں وی موجُود ساں یہیں ، پہ خُدائے

جس وچ اب تک پھنسا ہُوا ہُوں ، ظفر
سی اوہ اِک رنگِ اوّلیں ، پہ خُدائے

-☆-

پہ خُدائے : (پشتو) بخدا

نال ہمارے آنے بانے
وِہی تُمھارے آنے بانے

رنگ برنگے ، ٹھنڈے مِتّے
مِٹھے کھارے آنے بانے

نیندر شہر دے اندر اندر
خواب کنارے آنے بانے

کدی کنایہ حُجت حیلہ
کدی اشارے آنے بانے

وِہی خرابی نیت دی اے
وِہی دوبارے آنے بانے

کوئی مُل نہیں اے اِس دا
لکھ ہزارے آنے بانے

یہیں کتے رہ جاؤ گے تُم
اور ، ایہہ سارے آنے بانے

سیکھ لیے ہیں کہاں سے ایہہ سبھ
پتے لارے ، آنے بانے

کرتے تھے گُمراہ ظفر نُوں
سمت ستارے آنے بانے

-☆-

آنے بانے: (پشتو) ٹال مٹول

بس تُوں ویکھو آشنا آشنا نندارچی
باغ وِچ سارا تماشا سی ہوا نندارچی

کوئی نندارہ ای ایسا سی کہ بس پُچھو نہ کُجھ
اُس نے آنکھیں بند کر لیں جو ہُوا نندارچی

دُور توں ای ویکھنا مُمکن اے اوہنوں بیش و کم
ہے بجے سچ پُچھو تے سارا فاصلہ نندارچی

ہُن یہاں بحفظِ مراتب دی نہیں اے کوئی شرط
اِک تُوں پہلاں ہُوا ہے دُوسرا نندارچی

ایہہ اوہ منظر اے کہ اِس ورگا نہیں اے کوئی ہور
آنکھ الگ درکار اے اِس تُوں جُدا نندارچی

ہور وی گویا سر و سامانِ حیرت اے بہم
جلوہ گاہِ ناز وِچ اے آئنہ نندارچی

رہ گیا اے اج اِس اُجڑی ہُوئی محفل میں کیا
ہو گیا اے کیوں خُدائی تے خُدا نندارچی

خواب ای ایسا اے اِس تُوں ویکھنے دے واسطے
اپنی آنکھیں نال لے کے آئے گا نندارچی

خُودنُمائی دی اے ساری کارفرمائی ، ظفر
اِس تماشے دے ہیں ورنہ آپ کیا نندارچی

-☆-

نندارچی: (پشتو) تماشائی

رکھدی اے کوئی مجھ سے بہت کام رہندے
رہندی اے جو مجھ میں سحر و شام رہندے

پہلے در و دیوار میں رہتی تھی مرے نال
پہنچی اے جواب جا کے لب بام رہندے

وقفہ کوئی ہوتا ای نہیں اس دے پس و پیش
آغاز رہندے کدی انجام رہندے

ہوتی رہی ترے ہوئے تالاب میں ہلچل
دیتی رہی کیا کیا ہوسِ خام رہندے

جا کر مجھے ہن ویکھنا تو چاہیے آخر
ہوتی اے اگر کوئی تہِ دام رہندے

پتے دی طراں کانپتا رہتا ہاں شب و روز
لینے نہیں دیتی مجھے آرام رہندے

ہر صبح مچاتی ہوئی اک شورِ قیامت
ہر رات مچاندی ہوئی کہرام رہندے

اک لرزشِ موہوم میں رہتا نہ گرفتار
وہندی جے رہائی کوئی بے نام رہندے

چد خوفزدہ رہتا ہاں خود سے ظفر اتنا
ہونا سی بالآخر مرا انعام رہندے

☆

رہندے: (پشتو) تھرتھراہٹ

یہاں نہیں اے فقط انتظار وچ درغل
چھپا اے دیکھیے ہر کاروبار وچ درغل

فریب اے مرے اپنے طریق کار میں کجھ
کجھ آ گیا اے ترے اعتبار وچ درغل

بغور اگر اسے کجھ دیر دیکھدے رہیے
ہے سبھ دا سبھ ای گرد و غبار وچ درغل

جے سوچیے تے پس و پیش وچ نہیں اتنا
بہت ملے گا اجے آرپار وچ درغل

خزاں دا رنگ تے رہندا اے اکو جیہا صاف
جے ہے تے سارے دا سارا بہار وچ درغل

عجب نہیں جے کتے ہور ای نکل جائے
کتے پیا اے زمیں دے مدار وچ درغل

اجے جو کوئی نتیجہ نہیں نکل پایا
اجے لگا ہوا ہو گا قطار وچ درغل

نکال سکدے او اوسط کوئی عجیب و غریب
وگرنہ ایک نہیں اے ہزار وچ درغل

جو کر رہے او بہت صلح ہوئی دی باتاں
تو لازمی اے، ظفر، کارزار وچ درغل

☆

درغل: (پشتو) دھوکا

ڈر رہے سن جو سفر توں ہٹنوا
نکل آئے وی گھر توں ہٹنوا

پہلے اُس نے ای دیا ردِ عمل
بے خبر سی جو خبر توں ہٹنوا

برگ و بار اون گے لوکاں تے یہاں
دیکھنا شاخ و شجر توں ہٹنوا

عُمر وچ ہور وی ڈر نیں لاکھوں
ہر گھڑی موت دے ڈر توں ہٹنوا

ہو وی سکدی اے مسافت پُوری
جادہ و راہ گذر توں ہٹنوا

خدشۂ سر نہیں ایسا سانوں
اپنی دستار اے سر توں ہٹنوا

اوہ وی دن سن کہ فغاں وچ اپنی
اثر آتا تھا اثر توں ہٹنوا

عیب ظاہر نیں اساڈے اُن پہ
اُٹھ گئے عرضِ ہنر توں ہٹنوا

روشنی آنکھ جھپکدی اے ، ظفرؔ
دو گھڑی نُورِ سحر توں ہٹنوا

-☆-

ہٹنوا: (پشتو) آگے، پہلے

اک شک جیہا اے گرمیِ گفتار دے پسے
اقرار سی کوئی جرے انکار دے پسے

دھوکے نیں پیش و پس میں کُجھ اتنے کہ سی اجے
انبار ایک ہور وی انبار دے پسے

اہلِ فن اطلاع چھپاندے نیں اج وی
جو اصل اے خبر وہ ہے اخبار دے پسے

پہلاں تے ایک واری ہی آتے سن اس طرف
ہے راز کُجھ ضرور لگاتار دے پسے

ہے ہور کوئی گرمِ سفر ، تے نہ مَیں کدی
ہوتا نہیں ہاں آپ تاں رفتار دے پسے

یاروں نے پیچ کھائے نہ ہوں کاٹ کے یہاں
اشجار ہور سن کئی اشجار دے پسے

اپنی فضا میں تازگی بے وجہہ وی نہیں
موسم اے ایک زخمِ ہوادار دے پسے

اپنی اساڈی مانگ تے پہلاں کدی نہ سی
دھوکا اے کوئی گرمیِ بازار دے پسے

اس عشق وچ تے اتری اپنی نہ سی ، ظفرؔ
کُجھ ہور اے ضرور اس آزار دے پسے

-☆-

پسے: (پشتو) پیچھے

کٹے بیڑ بوٹے، چمن شاڑ اے
لہو خشک اے تے بدن شاڑ اے

درندے، چرندے، پرندے، درخت
نہیں کوئی موجود، بن شاڑ اے

ہے ویران دانائی داناواں دی
تے وحشی دا دیوانہ پن شاڑ اے

جس انداز وچ ودھ رہیا اے ہجوم
تے بسراں کھواں مَیں وطن شاڑ اے

ہنے لہلہاندا سی باغ ہوس
جو دیکھا تو پھر دفعتاً شاڑ اے

مہکدے نہیں گفتگو دے گلاب
زمانہ ہوا انجمن شاڑ اے

کچھ اس طرح چھائی اے بے برکتی
کہ باغیچۂ اہلِ فن شاڑ اے

دکھائی نہیں دے رہیا دُور تک
تماشائے دشت و دمن شاڑ اے

نہیں پھٹدی کوئی کونپل، ظفر
زمینِ زبان کُہن شاڑ اے

☆

شاڑ: (پشتو) بنجر

جو وی سی آپ نے دکھائی لار
آن دی آن وچ بھلائی لار

اوہی پہنچا نشان منزل تائیں
جس نے اپنی ای خود بنائی لار

اوہ کسے ہور لار توں آیا
چھڈ کے ایہہ بنی سجائی لار

گرچہ بنجر زمین سی، لیکن
اسیں اپنے لئی اُگائی لار

جو نکالی سی ہم نے اپنے لئی
اوہ کسے ہور وچ سمائی لار

ہم وہیں کے وہیں رہے، اپنی
کچھ زمینی سی، کچھ ہوائی لار

ہم بھلا کس طراں سے آ سکدے
آپ نے بند ای کرائی لار

چل کے جس تے ہوئے تھے ہم بے لار
کچھ اوہ اپنی سی، کچھ پرائی لار

اوس توں اگے جا سکی نہ، ظفر
اسیں جس لار سے ملائی لار

☆

لار: (پشتو) راہ

وہاں پہ لوگ تھے خاص اور عام زرغونہ
جہاں رُکے تھے وہاں تھا تمام زرغونہ

ہم آئے ساں ای یہاں گھاس کھونے دے لئی
ہمارے سامنے سی صبح و شام زرغونہ

وہیں سے ہم وی ہوئے واپسی تے آمادہ
جہاں توں ہونے لگا اختتام زرغونہ

شجر دے سائے میں ستا سکے اگر کجھ دیر
تلاش کروی رہی طبعِ خام زرغونہ

بہت اے آب و ہوا سازگار اس دے لئی
رہے گا تازہ و تر یہ مدام زرغونہ

تمام بسترِ قالین اے ، اساڈے لئی
یہاں بہُت نہیں دیتا اے کام زرغونہ

اساڈا دل وی جہاں لگ گیا سی اور اس تے
بڑھا رہا تھا ہمارا قیام زرغونہ

مَیں اُس میں خُود ہی گرفتار ہونا چاہوندا ساں
پڑا ہُوا تھا جو پھیلائے دام زرغونہ

ظفؔر ، وہاں پہ بھلا بس اساڈا کیہ چلدا
جہاں پہ تھا ای مدارالمہام زرغونہ

☆

زرغونہ: (پشتو) سبزہ

یُوں وی مجھ سی مرا ارادہ پوخ
اور ، وعدہ وی سی کسے دا پوخ

ماریا ای فریب دے کے ہمیں
اور ، اوہ یار سی ہمارا پوخ

چھیتی معلوم ہو سکے گا کہ اوہ
خام اے کتنا اور کتنا پوخ

دند کمزور سن اساڈے کجھ
کجھ اوہ اخروٹ سی زیادہ پوخ

کس لئی ایہہ عزائمِ پختہ
جد نہیں اعتبارِ دُنیا پوخ

ہم وی اُس دے لگے رہے پیچھے
بات دا آپ وی اوہ نکلا پوخ

مُنہ میں کھٹیائی بھر گئی اِک دم
تھا ابے امب تھوڑا تھوڑا پوخ

ہم پھسل ای گئے ساں آخرکار
فرش سی چکنا اور خاصا پوخ

مَیں نے آپی بدل دیا سی ، ظفؔر
ہون والا ای سی جو لہجہ پوخ

☆

پوخ: (پشتو) پکا

گیا اے نہ جانے کدھر کونترہ
جو پلٹا نہیں نامہ بر کونترہ

ایہ رکھے ہوئے میں بھلا کس لئی
اُڈاتے نہیں او اگر کونترہ

اگر بند رکھا ہُوا ہے اسے
غُٹکدا اے کیوں رات بھر کونترہ

اگر تے نہیں اے کوئی خاص گل
نہ بھیجا کرو بام پر کونترہ

کی اپنی عزت وچ آتی اے یوں
پھراتے نہیں در بدر کونترہ

ہَوا وی لگایا کر اس نوں ذرا
پسینے میں ہے تر بتر کونترہ

ایہ چھتری اساڈی تے کد آئے گا
غٹرغوں غٹرغوں غٹر کونترہ

ایہ جنگلی اے یا پالتو ، کیا کہیں
جو رہندا اے پیشِ نظر کونترہ

کدی تے ، ظفر ، آیا جایا کرے
جے سمجھے اے اپنا گھر کونترہ

☆

کونترہ: (پشتو) کبوتر

یہاں جو پھیلی ہوئی اے ادھر ادھر زمکہ
کرو جو غور تے ہے آسمان پر زمکہ

کہیں سے لوٹ کے آتی اے دن چڑھے مرے کول
خبر نہیں کہاں رہتی اے رات بھر زمکہ

ایہ مجھ پہ ظلم تو کرتی اے رات دن ، لیکن
بنی ٹھنی مری معشوق اے ، مگر ، زمکہ

ہے میرا رُخ تے ہمیشہ ای آسماں دی طرف
ہاں ورنہ میں وی اُسی سمت ، ہے جدھر زمکہ

یہاں وی پھول نظر آ رہے نیں چار طرف
مرے لئی ایہ فلک وی اے سر بسر زمکہ

دراصل اس دا اے پھیلاو میرے اندر تک
جو دور توں مجھے لگتی اے مختصر زمکہ

میں ذرّے ذرّے سے اس دے ہاں آشنا ، لیکن
ایہ میرے حال توں رہندی اے بے خبر زمکہ

خزانے میرے ای کام آن گے کدی اس دے
چھپائے رکھدی اے مجھ سے جو مال و زر زمکہ

میں خود وی کد کا بتاتا ہوں اس دا ہاتھ ، ظفر
ہے میرا بوجھ اُٹھائے ہوئے اگر زمکہ

☆

زمکہ: (پشتو) دھرتی

مرے نواح میں ویسے تے حبس تھا لگ لگ
جو مجھ کو دیکھ کے چلنے لگی ہوا لگ لگ

اوہ بزمِ غیر سی ، اُس کا بھلا وہاں کیا کام
سو ، اُس نوں ویکھ کے شک تو مجھے ہُوا لگ لگ

وہ آ گیا سی وہاں ہور ای کسے دے لئی
بھلا اُسی سے ہمارا وی ہو گیا لگ لگ

کُجھ اُس دے اگے کُھلی ای نہیں اساڈی زباں
مگر نہ کہنے میں ہی مَیں نے کہہ لیا لگ لگ

اگرچہ سمت سفر دا نہیں اے اندازہ
چلو کہ طے تے کیا جائے راستا لگ لگ

اساڈے حق میں نہیں اوہ ، پر اتنی محنت نال
کوئی زیادہ نہیں ، فرق تے پیا لگ لگ

جہاں پہ ختم سی میری توقعات دی حد
گئی وہاں توں وی آگے مری صدا لگ لگ

ہماری موت دا اِتنا کسے نوں غم نہ سہی
ہمارے گھر توں کوئی شور تے اُٹھا لگ لگ

ظفر ، غزل نوں میں پورا تے کیہ بدل سکدا
بدل رہا ہُوں مگر اِس دا ذائقہ لگ لگ

☆☆

لگ لگ : (پشتو) کچھ کچھ ، لگ بھگ

حال چنگا نہیں سم ولاس
پہلوں جیسا نہیں سم ولاس

ویکھدا اے اوہ چور اکھ نال
بات کرتا نہیں سم ولاس

کہنا تے چاہوندا اے ، مگر
کُجھ وی کہتا نہیں سم ولاس

اگ تے جل رہی اے ، مگر
اس میں شعلہ نہیں سم ولاس

جو اساڈے وی کم آ سکے
کوئی بندہ نہیں سم ولاس

پک رہیا اے جو پھل شاخ تے
اتنا میٹھا نہیں سم ولاس

ہم وی کُجھ وقت لیں گے اجے
اوہ وی ایسا نہیں سم ولاس

کام دا تے بہت اے ، مگر
کام آتا نہیں سم ولاس

چاہوندے ہاں اُسی نوں ، ظفر
جو اساڈا نہیں سم ولاس

☆☆

سم ولاس : (پشتو) سردست

جدوں کوئی فتنہ اُٹھا اے جتی
سمجھ لو کہ اوہ آ گیا اے جتی

تڑپدا اے زور ہوس وچ ایہہ دل
لرزتے ہیں پتے ، ہوا اے جتی

جے دوناں دی آپس میں بنتی نہیں
خدائی نہیں اے خُدا اے جتی

ڈراندی وی ہے تے لبھاندی وی اے
کڑکتی ہے بجلی گھٹا اے جتی

نکلاں گے ہم کوئی اپنی ای راہ
چلیں گے نہ ہم راستا اے جتی

ہُوا سارا منظر وہاں سے ای بند
کتے کوئی پردہ ہٹا اے جتی

وہیں ڈوبنے دا وی سامان سی
کنارے سفینہ لگا اے جتی

سفر ختم ہوون دا غم اے بہت
وہیں ڈھونڈدے ساں ، ملا اے جتی

ظفر نوں نہیں کوئی پہچاندا
بڑے شوق سے جا رہا اے جتی

☆

جتی: (سندھی) جہاں، جس جگہ۔

جو کجھ یہاں اے سارے دا سارا توہان جو
پانی تمھارے اور کنارہ توہان جو

دیوار و در تے اوہ وی نہیں باقی ہُن کتے
مشترکہ سی جو رنگ ہمارا توہان جو

سمجھا بجھا کے لائے ساں واپس ایہہ دل ہُنے
ویکھا تے ہو چکا سی دوبارہ توہان جو

اُمید و انتظار توں وی دست کش ہوئے
کجھ اوہ وی ہم نے قرض اُتارا توہان جو

اس ابتری میں وی کدی چمکا سی چار دن
اپنے وی آسماں تے ستارہ توہان جو

اس شہر توں وی سانوں نکالو کسے طراں
چلتا یہاں جو ہو کوئی چارہ توہان جو

دنیا تو کیا کہ ہم ہُنے خودنوں وی چھوڑ دیں
بس ایک چاہیے اے اشارہ توہان جو

کجھ کجھ کھڑے ہوئے تو ہیں لوگ اپنے پانو تے
جد توں نہیں رہا اے سہارا توہان جو

اپنی ای آن والی اے شامت کتے ، ظفر
اتنا چڑھا ہُوا اے جو پارہ توہان جو

☆

توہان جو: (سندھی) تمھارا

کیا کیا ٹھیل ٹھکیل
کیسا ٹھیل ٹھکیل

جچی تُلی محفل وچ
آیا ٹھیل ٹھکیل

لاپروا سی اُتنا
جتنا ٹھیل ٹھکیل

ڈھیلے ڈھالے ٹوں میں
سجھا ٹھیل ٹھکیل

بول نہیں سکدا ہاں
جملہ ٹھیل ٹھکیل

کبھی نہیں کہہ پایا
مصرع ٹھیل ٹھکیل

ہور وی کوئی دن اوہ
رہتا ٹھیل ٹھکیل

کدے نہیں ویکھا پھر
ویسا ٹھیل ٹھکیل

بدلا نہیں ظفرؔ نے
لہجہ ٹھیل ٹھکیل

☆

ٹھیل ٹھکیل: (سندھی) بچا کھچا

زندگی کیکاند اے
ہور وی کیکاند اے

ایسا لگدا اے مُجھے
کُجھ ابھی کیکاند اے

ہاں ہنیرے وچ پیا
روشنی کیکاند اے

اوہ تاں پہلی سی ، تے ہُن
دُوسری کیکاند اے

جانتے او آپ تو
ایک ای کیکاند اے

خُود نہیں آندے او آپ
یا کوئی کیکاند اے

دُور ہو جائے گی ایہہ
سرسری کیکاند اے

اَج رہندی اے جو پیش
ایہہ وُہی کیکاند اے

بے کدی کرشی ، ظفرؔ
تے کدی کیکاند اے

☆

کیکاند: (سندھی) دوبھر

شام پینڈے تیرگی نے سر نکالا اوچتو
تے گھراں وچ ہو گیا کیسا اُجالا اوچتو

چل رہی سی زندگی آسان رستے تے مری
اور پھر اُس نے مجھے مشکل میں ڈالا اوچتو

اہلِ محفل نوں مزہ وی کجھ نہیں سی آ رہیا
میرے اُٹھنے سے ہُوئی رونق دوبالا اوچتو

رات دن اک بھیڑ جتھی ہُندی سی ہُن تک جس دے ہاں
لگ رہیا اے اُس دے دروازے تے تالا اوچتو

ہے سفر دی اکو ای ہُن تے نشانی دستیاب
پیر وچ اپنے نکل آیا اے چھالا اوچتو

ساں نکمے روزِ اوّل توں ای لیکن ہم سے وی
کم کوئی ہو گیا آپی نرالا اوچتو

آپ نے پہچان اپنی خود بنا لئی اے یہاں
یعنی غائب ہو گیا میرا حوالہ اوچتو

میں نے ہونٹوں سے لگایا وی نہ سی شاید اجے
جلد بازی وچ گرا ہاتھوں سے پیالہ اوچتو

جس دے استقبال دی تیاریاں سن سبھ، ظفرؔ
رُک گیا سی راہ وچ ای آن والا اوچتو

☆

اوچتو: (سندھی) دفعتاً

آیا اے اندھکار
چھایا اے اندھکار

اوہ نال ای اپنے
لیایا اے اندھکار

دیوار ہوا دا
سایا اے اندھکار

ہے جس دا تعاقب
مایا اے اندھکار

پی لی اے گھٹاٹوپ
کھایا اے اندھکار

حاوی ہوئے ایسے
بھایا اے اندھکار

کھویا اے کھُلا دن
پایا اے اندھکار

رویا اے ہنیرا
گایا اے اندھکار

دیکھو تے ظفرؔ دی
کایا اے اندھکار

☆

اندھکار: (سندھی) گھپ اندھیرا

اس اختتام تام
آ جاؤ شام تام

دُنیا وی اے فریب
ہم وی آں کام تام

ایہہ پختگی اے سبھ
سودائے خام تام

رستے میں پھس گئے
پہنچے نہ دام تام

ایہہ ساری برکتیں
نیں اُس دے نام تام

مشکل سے اپنی گل
پہنچی سلام تام

اپنی نماز تے
ہے اُس امام تام

ایہہ شیون اور شور
ہے اختتام تام

پہنچو کدی ، ظفر
اُس خوش کلام تام

-☆-

تام: (کشمیری) تک

ایک پولار دے اوپر پولار
کدی اندر کدی باہر پولار

ہتھ پکڑے ہوئے اک دوسرے دا
چلدے رہندے نیں برابر پولار

کچھ ملاوٹ نہیں اُن میں کوئی
اپنا ای آپ نیں اکثر پولار

ختم ہونے میں نہیں آتے ہیں
ایک توں ایک اے بڑھ کر پولار

کچھ وی اگدا نہیں اندر اُن کے
ایہہ بیابان ، ایہہ بنجر پولار

جو بنے وکھ کے بیٹھا ہاں کتے
سامنے ہے وہ مکرر پولار

روز آتے ہیں کسے پاسے توں
کتھے جاتے ہیں یہ چل کر پولار

ہیں سجائے ہوئے اک دوسرے نوں
ایک پولار دی جھالر پولار

کتے غائب ہوا نظراں توں ، ظفر
اک بناتا ہوا منظر پولار

-☆-

پولار: (سندھی) خلا

اج وی کس طراں نہ ہوندا گاس
اوہ جو ہے نال لے کے آیا گاس

ہن تے کجھ وی پتا نہیں چلدا
ایہ ہمارا اے یا تمھارا گاس

ان ہنیروں دی فوج دے لئی اے
کافی اتنا سا ، اور ، اکیلا گاس

کوئی جھگڑا نہیں کسی سے یہاں
رات اپنی اے اور اپنا گاس

وکھ اُٹھی سی شام ہر پاسے
اُس دی آنکھوں میں ای سی اتنا گاس

ایہو بستی اے اوہ کدی جس وچ
مل کے رہتے رہے اندھیرا ، گاس

شہر ہوتا نہیں اے کیوں روشن
رات دے نال نال اُترا گاس

کدی نکلا نہیں سی چاند ایسا
کدی دیکھا نہیں تھا ایسا گاس

دن نکلنے توں پیشتر ای ، ظفر
چاروں سمتوں میں آج پھیلا گاس

☆

گاس: (کشمیری) اُجالا

قبل از شام جھنجھرکو
بے ہنگام جھنجھرکو

ایک آغاز دُھندلکا
ایک انجام جھنجھرکو

ایک ساتھ چھائے سن
پختہ و خام جھنجھرکو

ذرا ذرا جیہا پھیلا
صبح آشام جھنجھرکو

جادۂ خاص ہنیرا
شارع عام جھنجھرکو

پڑا رہیا رستے وچ
اک ناکام جھنجھرکو

اُس دی بات اُجالا
اپنا کام جھنجھرکو

اُس دا نقش سویرا
اپنا نام جھنجھرکو

سمجھا نہیں ظفر وی
کوئی پیام جھنجھرکو

☆

جھنجھرکو: (سندھی) دُھندلکا

برا ہُوا کہ بالآخر ہُوا بھلا اپتم
کیا شروع جے اُس دا ہُن ہُوا اپتم

اگر دوبارہ چلے گی تو دیکھ لیں گے پھر
کہ ایک بار تو ہونا اے بات دا اپتم

ہر ایک بات دا انجام اپنا اپنا ایں
اخیر ایہہ ہے الگ اور اوہ جُدا اپتم

سفر اساڈا سی ہُن تک اُسی طراں جاری
مگر یہ کیا کہ ہُوا اپنا راستا اپتم

ہمارا سانس تے چلدا سی کُجھ نہ کُجھ پہلوں
کہ اس نواح میں ہونے لگی ہُوا اپتم

جو نفرتاں دا بہُت کاربار کردا سی
اساڈے دل توں محبت نہ کر سکا اپتم

شریف آدمی تھے ، ہم بھی ہٹ گئے پیچھے
بس اک اشارے سے جد اُس نے کہہ دیا اپتم

اخیر تے مری مرضی سے ای ہُوا ، ورنہ
لکھا ہُوا سی مرا اُنج تے جا بجا اپتم

یُونہی رہے گا ظفر میرے بعد وی مرا شور
کہ میرے نال نہ ہوسی مری صدا اپتم

-☆-

اپتم: (کشمیری) اخیر

چھا گئی اے جو باہر اندر برد
ہے اشارہ کوئی برابر برد

چاہیے ہے اُنھیں اِسی رُت وچ
بُرد دے ہور ایک اُوپر بُرد

تُلے پتّراں دا شور ہر پاسے
کوئی آواز اے سراسر بُرد

پیش خیمہ بہار دا اے ایہہ
سبھ دی اُمّید دا اے محور بُرد

شکل اے اُس دی اپنی رنگا رنگ
دیکھ گھر توں ذرا نکل کر بُرد

میرے اندر دا اے سُراغ اس وچ
ایہہ جو پھیلا ہے میرے باہر بُرد

سُر ہَواواں دا وی اے بدلا ہُوا
ہے عجب طرح دا فسوں گر بُرد

آن والے پھُلاں دی خُشبو نال
ہے ہُنے توں بہُت مُعطّر بُرد

یُوں ظفر ان برہنہ پیڑاں دا
لے کے آئی اے ایک منظر بُرد

-☆-

بُرد: (کشمیری) پت جھڑ

اساڈا جو کار وفا اے اڑوئی
تے ہُن کیا کریں، رہ گیا اے اڑوئی

ضروری سی جیہی وی تکمیل اُس دی
وہی کام ہم نے کیا اے اڑوئی

ادھوری سی نیت ای اپنی تے پھر کیا
اگر کام ہم نے کیا اے اڑوئی

یہاں کوئی کوئی ای پورا اے، یعنی
جو پہلا نہیں، دُوسرا اے اڑوئی

کراں گے اُسے آپ اِک دن مکمل
اجے تک تے اپنا خدا اے اڑوئی

اساڈی سمجھ وچ ای آیا نہیں اے
اشارہ اُدھر توں ہُوا اے اڑوئی

بھلا ہُن اُسے توڑ پہنچایئے کیہ
جو خط ہم نے اُس نوں لکھا اے اڑوئی

لگا کے بہُت زور ایہہ شعر ہم نے
بنایا اے لیکن ذرا اے اڑوئی

ظفرؔ، دل دی دیوار توں نام اُس دا
مٹایا اے لیکن مٹا اے اڑوئی

☆

اڑوئی: (کشمیری) ادھوری، ادھورا

فقط قافیہ ای ہلاندا اے بس
بھی ہے، کئی کشٹ اُٹھاندا اے بس

اُسے پانیاں دی خبر ای نہیں
محبت دے چھینٹے اُڑاندا اے بس

ٹھکانے نیں اُس دے کئی ہور وی
مرے گھر کدی آندا جاندا اے بس

کہانی اے اصل معلوم اے
کوئی ہور قصہ بتاندا اے بس

قریب آئے گا تے پھُلائے گا مُنہ
بہُت دُور توں مُسکراندا اے بس

ہر اک چیز تے ہوی قابض کدی
اجے پیڑا سا جماندا اے بس

محبت دا مینڈک اے تالاب وچ
پیا رات دن ٹرٹراندا اے بس

کسے ہور دے کم آئے گا اوہ
ہمیں مفت وچ آزماندا اے بس

ظفرؔ وے نہیں شاعری وس دی گل
فضول اپنا سر ای کھپاندا اے بس

☆

بس: (کشمیری) جو

میرا بھی پر اج نہ چھپا دوکھ
ہور کوئی غریب کھاندا دوکھ

تیری باتاں وچ آ گیا ہاں میں
ہُن کسے ہور نوں نہ دینا دوکھ

وصل کیہ اے ، پتا چلے ایہہ وی
ہے اگر وصل دی تمنا دوکھ

راہ کوئی نہیں ، کہاں جائیں
دل اے دیوار ، اور ، دُنیا دوکھ

کس دا ہو اعتبار ، کس دا نہ ہو
اُتنی ای دوستی اے جتنا دوکھ

اصلیت ہُن نہیں کسے شے وچ
چاندنی خواب اے ، پرندہ دوکھ

ویکھنا کیہ اے ، تے وکھانا کیہ
اکھ اک وہم اے ، تماشا دوکھ

اور ، کسی نوں فریب دیون توں
کتے بہتر اے آپ کھانا دوکھ

زندگی دا پتا نہ چلیا ، ظفر
اصل کتنی اے اور کتنا دوکھ

☆

دوکھ:(کشمیری) فریب

خوب سی اوہ بنا بنایا سیت
ایک دن اوہ کے دے آیا سیت

پہلاں ٹھوڈوں تے اوہنوں آن دیو
نال لے آئے گا بقایا سیت

ہمسفر ٹھیک ٹھاک سی ، لیکن
کر دیا آپ ہم نے ضائع سیت

لوگ ہُندے نیں نال انج اُس دے
جویں ہُندا اے کوئی سایا سیت

پہلے صفحے ای تے چھپے گی خبر
اور ، تصویر ہو گی شائع سیت

نال اپنے سی اک دُشمن وی
ہو گیا اُس دا وی صفایا سیت

اسیں اک ہور دا کہیا سی ، مگر
تُسیں اک ہور ای لیاندا سیت

سبھ توں پہلاں اساڈی گل سُنی
تے ہمیں بزم توں اُٹھایا سیت

چائے تے شوخ نوں بُلا کے ، ظفر
اسیں بستر دی اک بچھایا سیت

☆

سیت:(کشمیری) ساتھ

کہیں آئے مرے شمار میں سُرف
پھر رہے سن جو سبزہ زار میں سُرف

شوکتی تھیں اُچھل رہی لہراں
اور ، دریا دے آرپار میں سُرف

ہور تے کُجھ سُجھائی دے نہ سکا
نظر آندے رہے غُبار میں سُرف

سپ سن سارے آستیناں دے
بھر گئے سایۂ بہار میں سُرف

یا کہیں پہ پڑے سی ہم آغوش
یا لگے سن کھڑے قطار میں سُرف

کیا بھلے لگ رہے سن آنکھوں کو
تیرے آب انتظار میں سُرف

میں نے پالا اے اس نُوں بچپن توں
اپنا پہچان لُوں ہزار میں سُرف

آ گئے نیں کہاں سے ایہہ اتنے
دشت میں سُرف ، کوہسار میں سُرف

ڈس گیا اے مجھے ، ظفر ، کیسا
سی مرے شعرِ آبدار میں سُرف

☆

سُرف : (کشمیری) سانپ

لیہہ جاپے لدّوں اپنے سراں تے لڑا اے نب
ہوتا اے جو وی کُجھ یہاں ، سبھ دیکھتا اے نب

کیہہ کیہہ نیں اس زمیں تے ستارے جڑے ہوئے
پھُولوں سے اور پانیوں سے کیا بھرا اے نب

ہم پہ اے ایک ہور وی چھتری تنی ہوئی
اُوپر تلے معلق ہوئی ایہہ ہوا اے نب

موسم نے ایہہ عجیب تماشا وکھا دیا
تاریک بادلوں میں جو غائب ہُوا اے نب

سمجھو تاں ایک دُوسرے سے ہیں جُڑے ہُوئے
ویکھو اگر تے صاف زمیں توں جُدا اے نب

کیہہ کیہہ عجائبات نیں اس دے مدار وچ
ورنہ تے چاند تاروں کا اک راستا اے نب

آتی ہیں دُور دُور توں کیسی صدائیں جنی
اپنے تئیں تے جانتے آں بے صدا اے نب

ایہہ کوئی ٹھوس چیز نہیں ، اک فریب اے
تے ، اصل وچ تمام خلا در خلا اے نب

ہم اپنی خاک ہیں ، سو اساڈے لئی ، ظفر
اک انتہا اے جس دی اجے ابتدا اے نب

☆

نب : (کشمیری) آسمان

تجھے نمک کھایا پھرایا اے
بہت اُس نے اُلّو بنایا اے

شجر ہم نے جو کاٹ ڈالا اے خود
ملے گا کہاں اُس دا سایا اے

جسے ہم نے ڈالی نہ سی کوئی گھاس
وہی آخر کار بھایا اے

ہمیں ای ہُوا کوئی حاصل وصُول
کجھ اُس نے وی کھویا نہ پایا اے

پُرانے بہانے کیے ترک ، تے
نواں کوئی قِصّہ سُنایا اے

نہ سی اُس دی موج اور مرضی ، اگر
گِرایا اے یا اُٹھایا اے

کدی راہ میں لا سجایا ہمیں
کدی راستے توں ہٹایا اے

کُھوہ وچ وی دھکا اُسی نے دیا
جو چھوٹے گڑھے سے بچایا اے

ظفرؔ ، ساں ہی اِتی بُلندی تے ہم
سہولت سے اُس نے گِرایا اے

☆

اے:(کشمیری) ہمیں

ابتدا اے کہ اِنتہا دا دروگ
ایہہ اساڈے لئی ہوا دا دروگ

کدی ویکھا سُنا نہ سی پہلوں
اِس خُدائی وچ اِس بلا دا دروگ

کجھ مُیسّر نہیں کسے وی جگہ
اب کے ایسا اے جا بجا دا دروگ

خوف توں بولدا نہیں کوئی
دِل دی گلیاں وچ اے صدا دا دروگ

ایسی نایاب اے یہاں ہر چیز
ہے وفا دا ، کدی جفا دا دروگ

کوئی گُذرا نہیں یہاں توں کدی
رستیاں تے اے نقشِ پا دا دروگ

کجھ سروکار ای نہیں اے کتے
اج پیا اے جزا سزا دا دروگ

آسمانوں سے رابطہ ای نہیں
کہ زمیناں تے ہے دُعا دا دروگ

کوئی موجود ای نہیں اے ، ظفرؔ
چار سُو اے ہما شما دا دروگ

☆

دروگ:(کشمیری) قحط

نہیں رہ گئے اِتنے لاچار اَس
کراں گے ترے اَگے اِنکار اَس

اساڈا کیا اُس نے ایسا علاج
ہوئے اور ای اور بیمار اَس

محبت ای سی ساڈے کرنے دا کام
سو، ہُن پھرتے رہتے ہیں بیکار اَس

رہی جیب تے اپنی خالی، مگر
کدی جا نکلدے ساں بازار اَس

محبت دا دریا اے دوناں دے وچ
کہ اُس پار اوہ نیں تے اس پار اَس

ایہہ سوتا سا اُس دا دمکدا بدن
نہیں آں کجھ اِتنے وی نادار اَس

نہ جیتے سی پل بھر جہناں دے بغیر
اُنہی توں ہوئے اَج بیزار اَس

ہمیں چاہیے تھوڑی مُہلت اجے
یہاں مر رہے آں لگاتار اَس

ظفر، شعر دا کوئی گاہک نہ سی
لگائے رہے ایویں بازار اَس

☆

اَس: (کشمیری) ہم، ہیں

اسیں جو وی کدی نکالا کیم
کاش ہوتا کوئی تے اچھا کیم

دُوجیاں دی ای فکر اے ساری
کوئی کروا نہیں اے اپنا کیم

اوہ کے ہور دا سی سر تا سر
ہم سمجھدے رہے تُہاڈا کیم

آپ نے جس نُوں ہس کے ٹال دیا
آپ سے تھا ہمیں بس اتنا کیم

کتنے کر کے نہیں دیا اوہ وی
آپ سے تھا جو پہلا پہلا کیم

ہم جو مزدور عشق ساں یکسر
کجھ اساڈے لئی نہ نکلا کیم

داد دینے لگے ہم ایسے وی
اصل وچ آپ دا اے ایسا کیم

جانے کیوں کل تے چھوڑ دیندے ہاں
روز کردے نہیں آں پُورا کیم

ایتھے آندے نیں اہلِ فن ای، ظفر
ایسی محفل وچ آپ دا کیا کیم

☆

کیم: (کشمیری) کام

عموماً تے ہندا اے آٹا دروگ
کدی اس توں ودھ کے ہے بوسہ دروگ

حقیقت کھلی ہم پہ مہنگائی دی
ہوا ہُن جو ملنا تہاڈا دروگ

پہنچ وچ نہیں رہ گئی کوئی چیز
کہ سودا سلف ہے ایہہ سارا دروگ

کجھ ارزاں وی سی اُس دکانے وہاں
مگر ہم نے خود ای خریدا دروگ

کہاں جائیے ہُن یہاں توں کہ ہے
کئی دن توں بازار سارا دروگ

خریدار بن کے ای جانا پیا
کہ دیکھا نہیں ہم نے سستا ، دروگ

محبت دا بازار سی تیز ای
مگر اس برس اے زیادہ دروگ

بے گاہک وکھائی نہیں دے رہیا
اجے مال وی تے ہے اِتنا دروگ

حقیقت میں سستا پڑے گا ظفر
بظاہر تے لگدا اے خاصا دروگ

☆

دروگ : (کشمیری) مہنگا

لیا کام اپنا ودن دان توں
نہ مطلب نکالا ودن دان توں

اساڈے مسائل ای کجھ ہور سن
اوہ کجھ ہور سمجھا ودن دان توں

اثر کوئی اُس تے نہیں اے ، مگر
بنے ہم تماشا ودن دان توں

پیا فرق ماحول تے کوئی خاص
نہ موسم ای بدلا ودن دان توں

وہاں ہم نے صورت ای ایسی بنائی
کیا کجھ بہانہ ودن دان توں

پگھر دا تے کیہہ اُس دا پتھر سا دل
ہے ناراض اُلٹا ودن دان توں

لیا کجھ تاں منت سماجت توں کم
لیا اے بقایا ودن دان توں

ہر اک مان لیتا اے پہلے ای بات
اوہ چالو اے ایسا ودن دان توں

ظفر نے کیا کم اُتنا خراب
رہیا دور جتنا ودن دان توں

☆

ودن دان : (کشمیری) گریہ وزاری

حیلے اور بہانے سُتھ
اوہ اے نویں زمانے سُتھ

آخر آپ وی نکلے گا
سارے تانے بانے سُتھ

ساری بات بتاون جیسا
تھوڑی گل بتانے سُتھ

اندر باہر دی دُنیا وچ
وُہی سی آنے جانے سُتھ

کھلا رہیا سینے دے اندر
پھُل کوئی مُرجھانے سُتھ

ہُنے نکل آئے گا کِتھوں
بدل بن کے چھانے سُتھ

کام بہُت آندا اے اپنے
اوڑھنے سُتھ ، بچھانے سُتھ

یاد کدی آندا اے ہُن وی
بھُل گئے یارانے سُتھ

خُوب ، ظفرؔ ، بیگانہ سی اوہ
سیدھا صاف یگانے سُتھ

-☆-

سُتھ: (کشمیری) جیسا

رشتے ناتے ہیں یتھ
روندے گاتے ہیں یتھ

خاموشی اے چار سمت
شور مچاتے ہیں یتھ

اوہ وی آیا کرے گا
آتے جاتے ہیں یتھ

چھوڑ کے چل دیں گے کدی
اپنا کھاتے ہیں یتھ

یاد نہ آواں گے کدی
دھوم مچاتے ہیں یتھ

کِس دا ایہہ تالاب ہے
ہم نہاتے ہیں یتھ

موسم اے ، تے دُھپ اے
پر پھیلاتے ہیں یتھ

دُکھ وی بہُت اُٹھائے نیں
دل بہلاتے ہیں یتھ

بک بک کردے ساں ، ظفرؔ
ہُن فرماتے ہیں یتھ

-☆-

یتھ: (کشمیری) جہاں

ی ہیرا بہت ، جلایا ژونگ
اُس دے آتے ای پھر بُجھایا ژونگ

روشنی چاہیے ہمیں ہر وقت
کوئی اپنا ہو یا پرایا ژونگ

راہ وچ ای کدی جلا رکھیا
راہ توں وی کدی ہٹایا ژونگ

دُوجیاں دے سبھے بُجھا وتے
اِک اپنے لئی بچایا ژونگ

یہاں جلدا نہیں کسے دا چراغ
اُس دے جلدا اے زیرِ سایہ ژونگ

اُنج تے محفل میں سن چراغ بہت
اوہ وی نال اپنے اِک لیایا ژونگ

رات اندھیرے میں کٹ گئی آخر
دن چڑھے ای کہیں سے آیا ژونگ

ایہہ تے ہیں تین چار ای سارے
اوہ کدھر میں جو سن بجھایا ژونگ

روشنی دے لئی ، ظفر ، اُس دے
ژونگ سے ہم نے وی جلایا ژونگ

☆

ژونگ : (کشمیری) چراغ

وی روز اگوں بجھاندا اے بُس
سبق اُس توں پچھلا بھلاندا اے بُس

بہت فاصلے تے اوہ ہے اج کل
تماشا سا کوئی وکھاندا اے بُس

کوئی شے یہاں بھُل جاندا اے روز
بہانے بہانے سے آندا اے بُس

کوئی صاف دیندا نہیں اے جواب
فسانہ جیہا اِک سُناندا اے بُس

کدی گھر اوہ ہوندا نہیں جد وی جائیں
بُلاندا اے تے بھُل جاندا اے بُس

ہُنے اُٹھ کے چل دے گا ہوراں دے نال
مجھے ویکھ کے مُسکراندا اے بُس

بتاندا نہیں پُوچھنے تے وی کُجھ
نہ پُوچھیں تے سبھ کُجھ بتاندا اے بُس

کسے ہور نُوں دے گا میری جگہ
مجھے راستے توں ہٹاندا اے بُس

کوئی دیر رکھنا ظفر تے نظر
ابے ہیرا سا چمکاندا اے بُس

☆

بُس : (کشمیری) جو

ایسی پوچھ تے ایسی واتھن
تُم تک نہیں اے اپنی واتھن

کاہل ساں اوّل درجے دے
جیسے ہم تھے ، ویسی واتھن

پانو کِتے چادر توں نکالے
کیا وُہی سی جچتی واتھن

دم خم اپنا ای سی اپنا
اپنی ای سی اساڈی واتھن

اُس کے پانو کو ای چھوہ سکدے
کِسے روز جو ہوندی واتھن

ہتھ اپنے کُجھ وی نہیں آیا
یُوں ہم نے وی لڑائی واتھن

ویسے وی تھک ہار چکے آں
ہُن نہیں پہلاں ورگی واتھن

اپنی دُور اے منزل اُس دی
نہیں جہاں تک میری واتھن

سبھی ، ظفرؔ ، جھوٹے قصے نیں
کیسی پہنچ ، کہاں کی واتھن

☆

واتھن : (کشمیری) رسائی

بھرے شہر وچ جد ہوئی پڑھ‌گار
تے ہم سے وی ہوتی رہی پڑھ‌گار

نہیں مان کر کُجھ وی ہم نے دیا
ہوئی اے وگرنہ بڑی پڑھ‌گار

پڑے آں مُصیبت میں ہم تو بہت
تُہاڈی سی کِس طرح دی پڑھ‌گار

گھراں وچ تے وڑ کے بہت کی ، سو ہُن
سڑک تے وی ہوون لگی پڑھ‌گار

یہی ہُن تے معمول اے روز دا
کدی مارکٹ تے کدی پڑھ‌گار

ہُنے پھر اوہ آ کے ہوئے سن شُروع
بھگت کے اُٹھے ساں ابھی پڑھ‌گار

کِسی دن تے بھرپُور ہوندی اے ، تے
کِسے دن فقط سرسری پڑھ‌گار

یہی روزی روٹی اے اونہاں دی ہُن
وُہی ماردھاڑ اور وہی پڑھ‌گار

ظفرؔ ، ہُن تے آزاد پھرنے لگا
کہ ہوندی نہیں اے کوئی پڑھ‌گار

☆

پڑھ‌گار : (کشمیری) پُوچھ گچھ

جے کول آئے وی تے کیہا ، ہورکن
بہُت اُس نے ساتوں رکھا ہورکن

پسینے میں ہم تو شرابور تھے
بہُت چل رہی سی ہُوا ہورکن

کیا ہم نے چارہ جو کول آئیں ہم
اوہ کُجھ ہور ہم سے ہُوا ہورکن

اگر اوہ ذرا کول آ وی گیا
رہے گی اساڈی صدا ہورکن

ہر اک فصل نوں کھا گئی تیز دُھپ
رہی اوہ برتی گھٹا ہورکن

کُجھ اپنے سے تھے ہم بھی سُست الوجود
یہاں سے گھر اُس دا وی تھا ہورکن

ایہہ ہئی پڑھائی اے کِس نے اُسے
جو ہم توں اوہ رہنے لگا ہورکن

اسیں وی سی جانا کسے ہور سمت
کُجھ اُس دا وی سی راستا ہورکن

اوہ کیہہ زندگی ہوی جس وچ ، ظفر
زمین سخت سی تے خدا ہورکن

☆

ہورکن : (کشمیری) پرے

حساب آ کے دیکھا جو اپنا پتم
تے گڑبڑ سی سارا ای اگلا پتم

اُسے ویکھ کر اج کیہہ جانے کیوں
بہُت یاد آیا زمانہ پتم

بہُت کھول کے وی کیا ہم نے غور
نہ اُلٹا پتم سی نہ سِدھا پتم

ہم آیندہ کی کُجھ نہیں پُوچھتے
اوہ وعدہ ہُوا کیہہ تُہاڈا پتم

بہُت عُمر گذری کہ ہیں مُنتظر
زمانہ پلٹ کے نہ آیا پتم

کدی اُس کو مرنے نہیں دیں گے ہم
اساڈی رگوں میں ہے زندہ پتم

اگر ہو سکے تو ہمیں بھیج دیو
کسے یاد دا ایک ٹکڑا پتم

اساڈی نظر توں جو غائب اے ہُن
اساڈا وہ سی دیکھا بھالا پتم

ہُن اتھے تے بربادیاں نیں ، ظفر
یہاں وقت گذرا اے اچھا پتم

☆

پتم: (کشمیری) پچھلا

جیہڑا ہویا کہیں اِتنا پیروں
یاد اے ساڈوں زمانہ پیروں

کجھ نویں گل اوہ سُندا ای نہیں
آزمانے آں طریقہ پیروں

مَیں نواں، روز نواں ہوندا ہاں
تے سمجھدی اے ایہہ دُنیا پیروں

ایہہ مشین اور نہیں چل سکدی
ہے ہر اک ایس دا پُرزہ پیروں

مُنتظر ہاں مَیں اُسی دا کد توں
یاد ہو کوئی جو نغمہ پیروں

بیٹھ جاندا اے سرِ شام آ کے
اک شجر تے اوہ پرندہ پیروں

مَیں کہاں جاواں کہ ہوندا اے وُہی
سامنے میرے تماشا پیروں

دیکھتا رہتا ہاں پانی اے نواں
اتے، بے شک ایہہ ہے دریا پیروں

ہُن تے ایہہ وی نہیں کھلدا کہ ظفر
کیا نواں ہے یہاں اور کیا پیروں

☆

پیروں: (کشمیری) پُرانا

پہلے تے سی فقط لہو وچ تیز
آندا جاندا اے گفتگو وچ تیز

ڈھونڈدا ہاں، بھٹکدا جاندا ہاں
ہے کوئی تیری جُستجو وچ تیز

ویکھدے ویکھدے ہر اک جانب
پھیل جاندا اے رنگ و بُو وچ تیز

ٹھنڈ ای ٹھنڈ ہے جدھر جاؤ
ہے کوئی اب کے نُو بنُو وچ تیز

چلدا چلدا رُکا اے کیہہ پانی
بھر گیا کوئی آبجُو وچ تیز

سردمہری دی انتہا اے کوئی
کجھ دناں توں اے اُس دی خُو وچ تیز

پھیل جائے گی دشت و دریا وچ
بھر رہی اے جو کاخ و کُو وچ تیز

کجھ نتیجہ نہیں نکل سکدا
ہے بہت اُس دی گومگو وچ تیز

رُوح تے برف جم رہی اے، ظفر
اس طرح دا اے آرزو وچ تیز

☆

تیز: (کشمیری) یخ

باہر اندر اے کیسا کیسا بڈ
جس نوں ویکھو وہی اے اتنا بڈ

بولیا کدی نہیں اے بول بڑا
ہے ایہہ میرا نہیں ، تُہاڈا بڈ

اس زمیں تے تاں ہو نہیں سکدا
کوئی وی آپ توں زیادہ بڈ

فرق دونوں میں کُجھ رہا ای نہیں
ہیں برابر یہاں پہ چھوٹا بڈ

ہم تو بڈ اپنا نال لیائے آں
تُم وی لے آؤ کوئی اپنا بڈ

کیسا کیسا پڑا اے ، ان میں سے
منتخب کیجیے بھلا سا بڈ

خود نوں چھوٹا نہیں کرے جد تک
کوئی ہو ای نہیں اے سکدا بڈ

ایہہ اگر ہو سکے تے رکھنا یاد
ہے بڑے کم دا نتیجہ بڈ

اصل وچ تے وہی بڑا اے ، ظفر
جسے کہتی ہو ساری دُنیا بڈ

☆

بڈ : (کشمیری) بڑا

کیسی کشتی ، کیہا بوٹھ
دور بہت اے اپنا بوٹھ

میں پانی وچ ڈُب رہیاں
دور اے اجے تُہارا بوٹھ

لہراں سر ٹکراندیاں ہین
ڈٹ رہیا ہو گویا بوٹھ

کتے وی ڈیہا جا سکدا اے
اجے پڑا ہے سارا بوٹھ

اجے ہر طرف پانی اے
اجے نظر نہیں آندا بوٹھ

ایہی ہرا مُنہ زور بھنور
ایہی مرے دریا دا بوٹھ

اندازہ ای لگاتے آں
کتنا دریا ، کتنا بوٹھ

تھوڑا جیہا ای کافی اے
کیہ کرنا اے سارا بوٹھ

پانی سُوکھنے کی اے دیر
بن جائے گا دریا بوٹھ

☆

بوٹھ : (کشمیری) ساحل

ہم تے ایہی سمجھے ساں کہ ہیں کام وچ آدر
معلوم ہُوا آپ ہیں آرام وچ آدر

اپنا تے ایہہ عالم ایں کہ آندے ای جہاں وچ
آغاز توں پہلاں ای ساں انجام وچ آدر

کجھ توڑ دے، تے چھوڑ دے ای رہندے آں دن رات
اخروٹ وچ آں، تے کدی بادام وچ آدر

ظاہر میں جو خاموش آں، ویکھو تو ہلاں گے
اندر دے کسے اپنے ای کہرام وچ آدر

اپنے لئی وی وقت نکلدا نہیں ہُن تاں
رہندے آں کسے صبح، کسی شام وچ آدر

کہندے تے ایہی آں کہ بہت خاص اے ایہہ کم
ہاں ہُن وی کسے سلسلۂ عام وچ آدر

چیزاں نوں زلاون تے ہوئے آں کتے مامُور
پاؤ گے ہمیشہ کسی ادغام وچ آدر

خوشبو نے کہیں اور کا رکھا ای نہ آخر
ایسے ہوئے ہم ایک گل اندام وچ آدر

مشکوک اے ویسے تے، ظفر، ساری خدائی
فی الحال تے ہیں اپنے ای ابہام وچ آدر

☆☆

آدر: (کشمیری) مصروف

ساہمنے قصر ہُوا اے لُورت
یا یونہی ساری فضا اے لُورت

کجھ بچا ای نہیں بربادی توں
باغ ویران، صبا اے لُورت

ٹوٹا پھوٹا ہُوا رستہ اے تمام
نالے نقشِ کفِ پا اے لُورت

ایک ملبا ای پڑا اے ہر سمت
سربسر میری صدا اے لُورت

زندگانی سی الگ توں نابُود
تے، مری موت جُدا اے لُورت

رنگ وی کوئی سلامت نہ رہیا
زرد دے نال ہرا اے لُورت

کوئی موجود نیں گلیاں نہ مکان
شہر دا شہر پیا اے لُورت

خود میں باقی نہیں کوئی کہ یہاں
مینوں ہر شخص ملا اے لُورت

اک زمیں ای نہیں ابتر کہ ظفر
آسماں اس توں سوا اے لُورت

☆☆

لُورت: (کشمیری) منہدم

بھلملاندے میں بجھدے جلدے ژونگ
میرے اطراف توں نکلدے ژونگ

روشنی دے رہے ہیں سبھ پاسے
اینج تاریکیوں میں بلدے ژونگ

لہر در لہر آ رہے سن اجے
تیروے ، اور ، رُخ بدلدے ژونگ

ہُنیں ایک ایک ہوندے جاون گے
اینج اک دُوسرے میں ڈھلدے ژونگ

مسجداں منداراں دی رونق نیں
اینج خستہ ، دُھواں اُگلدے ژونگ

اس ہوا دی کرشمہ کاری وچ
زرد پتے نیں یا اُبھلدے ژونگ

تے لہو دے گھٹے ہنیریاں وچ
نیں کوئی رات بھر مچلدے ژونگ

دامنِ خواب توں ہُن اُس نے کیوں
پھر بُجھایا اے چلدے چلدے ژونگ

رہنمائی وی کر رہے سی ، ظفر
اینج گردے ہوئے سنبھلدے ژونگ

☆

ژونگ : (کشمیری) چراغ

آواز دے کے دیکھ لو، شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

منیر نیازی

عامر سہیل کے نام

دل نے ڈالا تھا درمیاں جن کو
لوگ وہ درمیاں کے تھے ہی نہیں

جون ایلیا

ہے کوئی طرز تمہاری جیسا
پانی میٹھا بھی ہے کھاری جیسا

کوششِ خام ہے جیسی تھی کہ ہے
لُطف آدھی میں بھی ساری جیسا

شُوم تھے اہلِ کرم بھی اب کے
دِل بھی تھا ایک بھکاری جیسا

دن ہی تھا وہ کوئی ایسا، جس میں
کام تھا رات گزاری جیسا

کیسی پت جھڑ کی ہوا ہے، جس میں
رنگ ہے بادِ بہاری جیسا

تھا ترے شوقِ مُلاقات کے ساتھ
نشہ ایک اور بھی طاری جیسا

سانپ خُوش تھا بہت اندر جا کر
ہے مزہ یہ بھی پٹاری جیسا

نقش دِل پر بھی پڑا ہے اب تو
تیرے ملبوس کی دھاری جیسا

بھُول جانا اُسے یکلخت، ظفر
تھا کوئی صدمۂ جاری جیسا

☆

بلبل تھا یا بوم تھا
یہی دل مرحوم تھا

باقی سب تھے مُستفید
اک میں ہی محروم تھا

وہی تھی سونے کی جگہ
وہی ڈرائنگ رُوم تھا

بندہ تھا وہ ٹھیک ٹھاک
نام مگر کلثوم تھا

ابھی ابھی تو تھا کوئی
اور، ابھی معدوم تھا

نام کا حاتم طائی وہ
سب سے بڑھ کر شُوم تھا

چُومنے میں چالاک، اور
دیکھنے میں معصوم تھا

ہوتے فریادی کہاں
ظالم خُود مظلوم تھا

کُلّیات اپنا، ظفر
کیسا نامنظوم تھا

☆

ہنگامہ تو گرم تھا
کام اپنا ہی نرم تھا

ہم خود ہی بھگوان تھے
یہی ہمارا دھرم تھا

جھٹ میں ہوئی دیوالیہ
دل ایک ایسی فرم تھا

جمع نہ ہوتے لوگ کیوں
میرا کریاکرم تھا

لے گیا کھال اُتار کر
کیا سوداگرِ چرم تھا

جس میں جم کر بیٹھتے
دل ہی وہ آشرم تھا

تھا خود بھی بے باک وہ
کچھ میں بھی بے شرم تھا

آیا نہیں وہ ، اگرچہ
آنا تو کنفرم تھا

سر پھڑوا آئے ظفر
اور ، مُنہ پہ بھی ورم تھا

☆

تنہا وہ مہمان تھا
بھرا بھرا یہ مکان تھا

مُشکل لگتا تھا ، مگر
کام بہت آسان تھا

گاڑی تھی وہ نئی سی
اور ، مَیں گاڑی بان تھا

چلتا تھا مَیں باخبر
اُتنا ہی انجان تھا

مایوسی بھی تھی ، مگر
تھوڑا سا امکان تھا

گلتی دال اپنی کہاں
وہاں وہی پردھان تھا

لگتا تھا کم ہی ، مگر
بہت عظیم الشان تھا

پریشان تھا وہ بہت
کچھ مَیں بھی حیران تھا

فیصلہ جو بھی ہو ، ظفر
میرا وہی بیان تھا

☆

بچا کھچا جو خواب تھا
اب وہ بھی نایاب تھا

تھا خُود بھی تیار وہ
کُچھ میں بھی بے تاب تھا

ڈوبنے کی حسرت رہی
دریا ہی پایاب تھا

زہریلی تھی شراب وہ
باسی کوئی کباب تھا

نیت اب کُچھ ٹھیک تھی
لیکن حال خراب تھا

ٹرٹر اندر ہی رہی
مینڈک ہی تالاب تھا

کہاں وضاحت مانگتے
اس کا صاف جواب تھا

کافی تھا اپنے لیے
خط کا جو القاب تھا

عزت یہ تھی ظفر کی
خُود ہی آپ جناب تھا

☆

تُو ہی عرش نژاد تھا
مَیں تو دُنیازاد تھا

پہلے ہی تعمیر سے
گھر کوئی برباد تھا

اس ملبے کی جگہ پہ
شہر کوئی آباد تھا

وہ تھا مجھ سے پیشتر
مَیں ہی اُس کے بعد تھا

رُت بدلی تھی اس طرح
شاد بھی اب ناشاد تھا

کُچھ تصدیق نہ ہو سکی
وہ کِس کی اولاد تھا

عشق اپنا اس بار کُچھ
زائد از میعاد تھا

ٹکرایا ہُوں جس کے ساتھ
میرا بھی اُستاد تھا

بہت مصائب تھے، ظفر
مَیں اُن پہ ایزاد تھا

☆

موقع تو مسعود تھا
رستہ ہی مسدود تھا

سیب تھا رسا ہُوا کوئی
کڑھا ہُوا سا دُودھ تھا

خُوشبُو کے طُوفان میں
پکا ہُوا امرود تھا

سمجھا شیخ سعید ہے
جو طارق محمود تھا

شک میں لتھڑا ہُوا جو
تھا ، میرا ہی وجُود تھا

بدلا ہُوا تھا اس قدر
ملنا ہی بے سُود تھا

پیدا نہیں ہُوا تھا مَیں
وہ بھی نامولُود تھا

باہر سے تو تھا وُہی
اندر سے مفقُود تھا

وہ بھی غائب تھا ، ظفر
مَیں بھی ناموجُود تھا

☆

مرنا ایک وبال تھا
جینا بھی جنجال تھا

تم نے جو کر دیا ہے
وہی ہمارا حال تھا

دیواروں پہ گرد سی
اور ، شیشے میں بال تھا

باسی کڑھی تھا عشق بھی
جس میں بہت اُبال تھا

سچی بات ہے یہ کہ وہ
اپنی آپ مثال تھا

بچ نکلا ، اُس کے لیے
یہ اچھا ہی سال تھا

جن اشیا کی تھی طلب
شہر میں اُن کا کال تھا

جس کو ترسا جی بہت
کوئی پرایا مال تھا

ملے تھے ہم بھی ظفر سے
وہی گرو گھنٹال تھا

☆

وہی خیالِ خام تھا
اور ، برائے نام تھا

ملا نہیں وہ ، اور ، مجھے
بہت ضروری کام تھا

کچھ نیچے تھا بام سے
کچھ بالائے بام تھا

چوس کے پھینکا ہی نہیں
ایسا میٹھا آم تھا

تھا آغاز بھی ہُوبہو
اور ، وہی انجام تھا

دانے سمٹے ہوئے سے
بچھا ہُوا سا دام تھا

دروازے سے لوٹ آئے
اپنا یہیں قیام تھا

ملنا تھا ہم نے جہاں
کوئی اور مقام تھا

آگے تھا خود تو ظفر
اور ، پیچھے پیغام تھا

☆

تھوڑا سا اقرار تھا
باقی سب انکار تھا

کچھ دریا کے اس طرف
کچھ دریا کے پار تھا

ہر کوئی بیمار تھا
اور ، وہی آزار تھا

گرمی تھی جب مال میں
سرد بہت بازار تھا

بھاگنے والا آخرش
ہر اک سے دوچار تھا

تارکِ دُنیا تھا ، مگر
کتنا دُنیادار تھا

پیچھے گہری کھائی تھی
اور ، آگے کہسار تھا

کام آتا کیا شہر کے
بندہ ہی بے کار تھا

مَیں بھی پیدل تھا ، ظفر
وہ بھی سڑک سوار تھا

☆

کعبہ تھا یا دَیر تھا
ایک ہی سب کا اَیر تھا

جھگڑے سے کیا نکلتے
بیچ میں اُس کا پیر تھا

ہوتا اپنا کس طرح
جو غیروں کا غیر تھا

میرے اُس کے درمیاں
بہت پُرانا بیر تھا

کام تمام جو کر گیا
ایک فرینڈلی فیر تھا

میں بھی تھا تجھ سے الگ
تُو بھی مرے بغیر تھا

ہم سمجھے تھے اور کچھ
باغ برائے سیر تھا

غلسی کھڑا بجار میں
مانگے سب کی کھیر تھا

مقطع لکھا گیا، ظفر
پھر تمت بالخیر تھا

-☆-

دل کے اندر چور تھا
چور کے پیچھے مور تھا

تازہ دم تھا عشق بھی
وہ بھی نیا نکور تھا

کھا گیا سارا ہی مجھے
ایسا آدم خور تھا

دل کا رقبہ ایک دم
سارا سیم اور تھور تھا

کشتی بھی ٹوٹی ہوئی
پانی بھی مُنہ زور تھا

کوئی نہ تھا اطراف میں
میں، اور، میرا شور تھا

کبھی مزے کا تھا سخن
کبھی نہایت بور تھا

مرا نہیں میں بھی، ظفر
گور میں کوئی ہور تھا

اچھا تھا پھر بھی ظفر
جو بھی ڈنگر ڈھور تھا

-☆-

رنگ تھا وہ یا ڈھنگ تھا
میں سر تا پا دنگ تھا

اندر سے تھا نرم خُو
لہجہ ذرا دبنگ تھا

رُکا رہا چنیوٹ میں
جانا جس کو جھنگ تھا

بھیڑ تو تھی معمول کی
رستہ ہی کچھ تنگ تھا

میں بچوں کے ہاتھ میں
ٹوٹی ہوئی پتنگ تھا

ویسا وہ تھا ہی نہیں
جیسا رُوپ اور رنگ تھا

شکل تو شاید وہی تھی
آئینے پہ زنگ تھا

مارا آخر اسی نے
یہ جو نام اور ننگ تھا

دل میں آہٹ تھی، ظفر
یا کوئی آہنگ تھا

☆

جنگ و جدل سے دُور تھا
اور، زخموں سے چُور تھا

مُفت مشقت کا دھنی
میں کیسا مزدور تھا

لہو میں تھی دیوانگی
سر میں کوئی فتور تھا

کچھ بے بس تھے آپ بھی
کچھ میں بھی مجبور تھا

کبھی تھا ساہیوال میں
کبھی بہاول پور تھا

خُوش تھے لوگ، اسی لیے
میرا دل رنجور تھا

وہ تو پاس ہی تھی مرے
میں ہی اُس سے دُور تھا

میں بھی تھا بے دید کچھ
کچھ وہ بھی مغرور تھا

طور طریق اپنا، ظفر
اُس کو نامنظور تھا

☆

ایک طرف حلوائی تھا
دُوسری جانب نائی تھا

چھائے ہُوئے تھے تُم کہیں
کہیں تُمھارا بھائی تھا

کنجوسوں کا بادشاہ
کیسا حاتم طائی تھا

اور ، شکرگڑھ سے بہُت
دُور کہیں شکھائی تھا

دل کے ترکے میں مرا
حِصّہ ایک تہائی تھا

صحرا ہے اب جس جگہ
یہ خطّہ دریائی تھا

وہی بنا ہے پیش رفت
پہلے جو پسپائی تھا

ہم بھی تھے دل پھینک سے
وہ بھی اک ہرجائی تھا

چھوڑ کے رُسوا ہُوں ، ظفر
پیشہ جو آبائی تھا

☆

یہ جو رُوے زمیں تھا
کہیں نہیں تھا ، کہیں تھا

آیا ہے وہ یہاں پر
جو پہلے ہی یہیں تھا

کھسک گئی تھی جگہ ہی
ورنہ مَیں تو وہیں تھا

شہر وُہی اُجڑا ہے ، جو
اُس کے زیرِ نگیں تھا

آدھا تو تھا مکاں میں
آدھا باہر مکیں تھا

اندر آنا تھا جسے
باہر ہی جاگزیں تھا

خواب تھا میرے اِردگرد
خوف علاوہ ازیں تھا

شور اتنے کے باوجود
مَیں دُنیا میں نہیں تھا

جتنا کُچھ بھی تھا ، ظفر
سو بھی اپنے تئیں تھا

☆

جس میں اپنا سفر تھا
مٹی ہی کا بھنور تھا

وہ بھی اب نہیں رہا، جو
جھوٹا سچا ہنر تھا

کبھی ہمارا شہر میں
ہونا ہی اک خبر تھا

مانا نہیں وہ، بات میں
بس اتنا ہی اثر تھا

اندھوں کے اس شہر میں
میں ہی صاحب نظر تھا

زہد شکن تھا خود بھی وہ
میں بھی بندہ بشر تھا

کون تھا، جس کے ساتھ وہ
اتنا شیر و شکر تھا

باہر آیا کیوں نہیں
غصہ مجھ میں اگر تھا

کیا کر ڈالا ظفر نے
بندہ تو بے ضرر تھا

☆

وہ اتنا ہی ورے تھا
جتنا مُجھ سے پرے تھا

پنڈی پہنچا کس طرح
جانا تو سنگھرے تھا

اپنے مرنے کا قلق
سب سے بڑھ کر مجھے تھا

شہر چھوڑنے کا خیال
مُجھ سے پہلے اُسے تھا

دلچسپی اُتنی ہی تھی
فائدہ جتنا جسے تھا

خطرے میں تھا وہ بہت
مسجد یا مدرسے تھا

جا پہنچا ہوں شاہکوٹ
جانا تو شاہدرے تھا

سچ پُوچھو تو شہر سے
سروکار ہی کسے تھا

گھر والوں کا ڈر، ظفر
مجھے ہی تھا یا تجھے تھا

☆

وہ جو دل میں لہو تھا
اُسی سے اپنا وضو تھا

ہنستا بستا شہر بھی
کھنڈ نہیں تھا، کھنڈو تھا

جسے منایا دُھوم سے
عید نہیں تھی، ٹرو تھا

بھاگے تھے جب بالکے
سب سے آگے گرو تھا

باتیں ہی کرتا رہا
بہت بڑا جوگرو تھا

تم نے جوڑا گوند سے
کرنا جس کو رفو تھا

شاطر تھا وہ اصل میں
دیکھنے ہی میں گئو تھا

لگتا تھا لاہور ہی
دیکھا تو لکھنؤ تھا

دیکھا تو خُود ہی ظفر
اپنا اصلی عدو تھا

☆

ایک ہوا کا دیا تھا
جو اندر جل رہا تھا

اُس نے سُنا نہیں، مگر
مَیں نے بھی کچھ کہا تھا

اُس کے مَیں بھی چار دن
آگے پیچھے ہُوا تھا

میرا ہی تھا اصل میں
شور جو میرے سوا تھا

پیچھے پیچھے تھی خزاں
آگے آگے ہرا تھا

گذرا ہی نہیں وہ، کہ مَیں
سامنے سے تو ہٹا تھا

جس کی مُجھ کو تھی طلب
رستے ہی میں پڑا تھا

اِک مَیں ہی تھا بے خبر
سب کو میرا پتا تھا

شہربدر تھے جو، ظفر
مَیں اور میرا خُدا تھا

☆

جان گیا ہُوں وہی تھا
ابھی نہیں جو ، ابھی تھا

سب سے اتنا مختلف
ہم میں ہی سے کوئی تھا

سچا تھا ہر طرح سے
لیکن ، جھوٹا بھی تھا

پھانسی چڑھ گئے بے گناہ
اصلی مُلزم بری تھا

مجھ سے آگے تھا بہت
جو مجھ سے بھی غبی تھا

بدقسمت تھا اصل میں
جو قسمت کا دھنی تھا

بہت بخیل تھا کام میں
باتوں کا ہی غنی تھا

پہلے تنہا تھا ، مگر
دیکھتے دیکھتے کئی تھا

ایک چھلاوا سا ظفر
کبھی نہیں تھا ، کبھی تھا

☆

ہر شے آلی جالی کر
چال ذرا مستانی کر

چلتا رہے یہ خرچہ بھی
کہیں کوئی اُستانی کر

بکرے تو مہنگے ہیں بہت
مُرغی ہی قُربانی کر

رونا عورتوں کا ہے کام
بات کوئی مردانی کر

کچھ تو نتیجہ نکلے گا
پانی میں ہی مدھانی کر

مشکل میں ہُوں پھنسا ہُوا
تُو ہی کوئی آسانی کر

آبادی بھی کبھی ہو گی
جہاں تہاں ویرانی کر

اور مسائل بھی ہیں بہت
ختم یہ رام کہانی کر

کبھی ، ظفر ، گھر میں بھی بیٹھ
اتنی خاک نہ چھانی کر

☆

بیٹھا ڈنڈ مچاتی کر
کچھ تو حال دُہائی کر

باپ سے اُس کے مار نہ کھا
آگے اُس کا بھائی کر

چھوڑ کے یہ گُم صُم رہنا
کوئی بات بنائی کر

گل پھڑے بھی اُڑا لینا
پہلے ذرا کمائی کر

دوسروں سے مت باندھ اُمید
اپنی آپ بڑائی کر

پہلے اپنا کام نکال
پھر اُس کی رُسوائی کر

بچ اُس کے شر سے بھی پھر
جس کے ساتھ بھلائی کر

مل جائے گا دفینہ بھی
تھوڑی بہت کُھدائی کر

آگے بڑھنا ہے تو ، ظفر
تھوڑی سی پسپائی کر

☆

ساری گئی گواتی کر
بات ختم اور جاتی کر

نرم خُوئی سمجھے گا کون
لہجے کو جتاتی کر

وار ڈھال پر روک نہیں
آگے اپنی چھاتی کر

اُلٹے ہاتھ پکڑ بیڑا
سیدھے ہاتھ چپاتی کر

دن کا کیا ہے، چڑھے نہ چڑھے
سب کچھ رات براتی کر

کافی کچھ کر بیٹھا ہے
اور نہیں بدذاتی کر

ڈاکو ، چور ، اُٹھائی گیر
سب کو اپنا ساتھی کر

جھوٹ مُوٹ کا مینہ برسا
باہر آ ، برساتی کر

رنج زیادہ جھیل ، ظفر
کم کم خُوش اوقاتی کر

☆

خدمت کوئی بتایا کر
حکم ہمیں فرمایا کر

اتنا دور نہیں رہتے
تھوڑا پاس بٹھایا کر

مانتے ہیں سردار تجھے
اپنی ہمیں رعایا کر

ساتھ ہمارے مل اور کھل
اور، ساتھ مرجھایا کر

دل ہے گیلی ریت، اسے
ڈھایا اور بنایا کر

کھلی ہوائیں ہیں کیا کیا
تو بھی پھرا پھرایا کر

رہ رہ کے مت مار ہمیں
ایک ہی بار صفایا کر

نئے بکھیڑوں کو اب چھوڑ
پہلے کام بقایا کر

گھر ہی بیٹھا رہ نہ، ظفر
باہر جایا آیا کر

-☆-

ملکِ سخن کا والی کر
اپنا رتبہ عالی کر

باغ بغیچہ کر تاراج
سبزے کی پامالی کر

پڑ سکتا ہے مجھ سے کام
میری بات نہ ٹالی کر

اور تو کیا کر سکتا ہے
اٹھ، اور، سیٹ ہی خالی کر

چاروں کھونٹ ملے گی بھیک
دونوں ہاتھ سوالی کر

سالا کچھ تو ڈالے گا
آگے آگے تھالی کر

آدھی گھر والی کو پھانس
لے ہی مرے تو سالی کر

سیرت کے چکر سے نکل
صورت دیکھی بھالی کر

پیٹ جہاں سے بھرا ہے، ظفر
بیٹھ کے وہیں جگالی کر

-☆-

کرنا ہے جو آپی کر
بعد میں آپادھاپی کر

قابلِ دید تو ہے، لیکن
چھاتی کچھ تو ڈھانپی کر

دل کو نیکی بھی سکھلا
پہلے اس کو پاپی کر

یہ روشن چہرے بھی چوم
خالی دھوپ نہ تاپی کر

دانشور میں بھولے سے
کبھی غزل بھی چھاپی کر

کچھ مالش کام آئے گی
کچھ فزیوتھیراپی کر

حق حلال کمائی تھی
مکر گیا وہ کھا پی کر

مزے سے پوری رات گزار
دن میں مٹھی چاپی کر

چوما کر موئے زحاف
خالی ناف نہ ناپی کر

☆

ماسی کر یا مامی کر
اٹھ، اور، کام تمامی کر

خوب آرام کیا ہے، اب
تھوڑی بے آرامی کر

کوئی مخالف کر پیدا
کسی کو اپنا حامی کر

خوبی یہاں نہیں مطلوب
دور کہیں یہ خامی کر

آزادی سے کام چلا
پہلے کہیں غلامی کر

دو نمبر ہو جا، خود کو
نامی اور گرامی کر

شربت کو شہ زور بنا
حلوے کو بادامی کر

الٹا چکر کوئی چلا
کامی کو ناکامی کر

خاص نہیں چلنے کا، ظفر
لہجہ ذرا عوامی کر

☆

پوری کر یا آدھی کر
بات کوئی بنیادی کر

خالی ہے دل کا یہ مکاں
آ اس میں آبادی کر

بوسہ تھا یہ ہوائی سا
اس کو ذرا سوادی کر

شعلہ جنگل جنگل پھینک
شورش وادی وادی کر

جاری کر اس کا شیڈول
مُلاقات میعادی کر

ہوئی نہیں اپنی تعمیر
جگہ جگہ بربادی کر

اور جو کوئی کام نہیں
آگے بڑھ اور شادی کر

کوئی شگوفہ چھوڑ ایسا
سارا شہر فسادی کر

بات کو اُلجھا نہیں ، ظفر
سیدھی ، سادہ مرادی کر

☆

تازی کر یا باسی کر
جلدی جان خلاصی کر

لہجہ اچھا نہیں ، اسے
اور ذرا مدراسی کر

پاس کبھی تو بیٹھ ذرا
ساری دُور اُداسی کر

فوٹو نہیں بنے گا ٹھیک
شکل ذرا اکواسی کر

کچھ آرام مجھے پہنچا
یہ تکلیف ذرا سی کر

نہیں گھرانا یہ اچھا
اس کو شام چوراسی کر

یہ ہر بات فروعی ہے
کوئی کام اساسی کر

پھر بخشش کی مانگ دُعا
پہلے خُود کو عاصی کر

منزل پانی ہے تو ، ظفر
کوشش کر، اور، خاصی کر

☆

ہو سکتا ہوں ، ترابی کر
پہلے مجھے کبابی کر

وقت نہیں باقی اتنا
سارا کام شتابی کر

اصلی وصلی کر اب تو
اور نہیں بدخوابی کر

اوپر ہے سارا پرشاد
نیچے ذرا رکابی کر

کپڑے ہی دھلوائے ہیں
پالش تو مرگابی کر

ساتھ بہالے جاسب کچھ
ملاقات سیلابی کر

چہرہ کھول کے باہر آ
موسم ذرا گلابی کر

ٹخنے تو دکھلا پورے
لہنگا ذرا وہابی کر

چھوڑ زبانی بات ، ظفر
کوئی کام کتابی کر

-☆-

اسی نے آ کر جکڑی تھی
جس کے سامنے اکڑی تھی

کسی کی چھوڑی ہوئی تھی جو
میں نے ہی کیوں پکڑی تھی

دور سے لگی تھی خربوزہ
پاس گئے تو ککڑی تھی

ہاتھ لگایا تو یہ کھلا
لڑکی نہیں تھی ، لکڑی تھی

پھیل گئی جو ، پہلے تو
کافی سکڑی سکڑی تھی

اسی میں پھنس کر رہ گئی وہ
ذرا سی جو گل وکڑی تھی

تلے کئی بار اُس پر ہم
کوئی ترازو تکڑی تھی

جالا تان گئی ہر سمت
بہت حرامی مکڑی تھی

چھکڑے کے اندر ہی ، ظفر
چھپی ہوئی وہ چھکڑی تھی

-☆-

وہ تدی تھی یا چھکڑی تھی
لیکن ، مجھ سے تگڑی تھی

لڑ کر آئی تھی گھر سے
میرے ساتھ بھی جھگڑی تھی

نقش تو ایسے ویسے تھے
بس چمڑی ہی بگڑی تھی

کھاٹ چھانگا ہونے پر
فرش اوپر ہی رگڑی تھی

نکلی کیا نزدیک سے وہ
دُور سے کیسی لگڑی تھی

بہت کرایے سے بڑھ کر
اُس دُکان کی پگڑی تھی

خالی کھرلی کے اطراف
ڈھگڑا تھا اور ڈھگڑی تھی

بندھے ہُوئے سے دونوں ہاتھ
کھلی ہوئی سی پگڑی تھی

تاپی تھوڑی دیر ، ظفر
آگ نہیں تھی ، اکڑی تھی

☆

بہت زیادہ ربڑی تھی
سو بھی بلا سبھڑی تھی

چھینکیں ہی آتی رہیں ، کیا
تمباکو کی کھبڑی تھی

تھی خوش ذائقہ تو ، لیکن
طبع ذرا سی کبڑی تھی

ٹوٹی ایک دھوکے سے
جبڑا نہیں تھا ، جبڑی تھی

حیدر آباد سٹیشن پر
ابڑو تھا اور ابڑی تھی

آخرِ کار نکالا مجھ
حالاں کہ وہ سبھڑی تھی

بھینسیں کھڑی تھیں لاتعداد
اور ، چارے کی تھبڑی تھی

مٹی بیٹھ گئی قدرے
بارش نہیں ، دھربڑی تھی

لکھا ہُوا نہ مٹا ، ظفر
پنسل ہی بے ربڑی تھی

☆

چٹنی ، چپڑی چپڑی تھی
طبع کی ، لیکن رپچڑی تھی

ہم بھی پہنچ گئے بروقت
وہ بھی ٹھیک ہی اپڑی تھی

پالا کیسے رُکتا ، ہم
دو تھے ، ایک ترپڑی تھی

خود ملبوس تھی نیا نکلا
کہنے کو بےکپڑی تھی

شانت ہوئی اُتنی آخر
جتنا کودی پپڑی تھی

دھوئے نہائے اُسی میں ہم
چھوٹی سی جو چھپڑی تھی

فرش تھے اندر باہر ، اور
گھر میں ایک ہی تپڑی تھی

مُنہ ہی بھر گیا ، حالاں کہ
تھپڑ نہیں تھا ، تھپڑی تھی

جہاں سے ہاتھ لگی وہ ، ظفر
وہیں پپڑی نپڑی تھی

☆

جھولی تھی یا چپڑی تھی
ہمیں بہت ہی چپڑی تھی

دل کے اندر کافی دیر
شور کی صورت چپڑی تھی

رچّو تھے ہم آپ بہت
وہ بھی کافی رچپڑی تھی

کام پڑ گئے بڑے بڑے
چھوٹی تھی ، اور ، چپڑی تھی

فارغ ہو کر گئی تھی جب
کافی نچڑی نچڑی تھی

پہلے ہار گئے تھے ہم
وہ تو بعد میں پچھڑی تھی

بڈی ہی ایسی تھی کوئی
بہت پچوڑی چپڑی تھی

بھاگ رہی تھی گائے بھی تیز
گائے سے آگے بچھڑی تھی

کچی ہی رہ گئی ، ظفر
جو بھی کھچڑی کھچڑی تھی

☆

سیدھی تھی یا ٹیڑھی تھی
میں نے آپ سیڑی تھی

ستھری، صاف تھی کیسی وہ
اور، کس طرح لیبڑی تھی

وہ بھی پپ چلایا تھا
یہ مشین بھی گیڑی تھی

تیر چلی تو رہی بلخ
ڈوب گئی تو بیڑی تھی

وہ بھی ہم سے ہُوئی نہ حل
چھوٹی سی الجھیڑی تھی

قصّہ ایک ہُوا جب ختم
نئی کہانی چھیڑی تھی

ہتھکڑیاں تھیں پیروں پہ
اور، ہاتھ میں بیڑی تھی

اُس کے ساتھ کیا نہیں کچھ
اپنی کھال اُدھیڑی تھی

خُود بھی خالی ہُوئے، ظفر
وہ بھی ساتھ نبیڑی تھی

☆

چتکبری یا گرڑی تھی
بڑے جتن سے نرڑی تھی

ذائقہ ٹھیک تھا ویسے تو
تھوڑی سی کچ برڑی تھی

نازک نرم بدن کے ساتھ
طبع بہت سی کرڑی تھی

بات مان لیتی تھی کچھ
اڑیل نہیں تھی، ارڑی تھی

ڈیل ڈول بھی چھوٹا سا
دیکھنے میں بھی ترڑی تھی

چھڑی تو تھی لیکن مُردار
کہنے ہی کو چھرڑی تھی

پتّی نہیں بہت باریک
ذرا ذرا سی درڑی تھی

ڈالا نہیں مُرغی کیوں
ساری وہ تو ہرڑی تھی

مَیں تھا نیچے کھڑا، ظفر
وہ چوبارے چڑھی تھی

☆

ترچھی بھی یا آڑی بھی
بہت دُور سے تاڑی تھی

کھیلی خوب تھی ، حالاں کہ
لگتی بہت اناڑی تھی

جھوٹی کُند کُلھاڑی سے
کچی لکڑی پھاڑی تھی

اُسے کہاں لے جاتے اور
باغ میں ایک ہی جھاڑی تھی

بنی عمارت ، اور ، ابھی
پہلی اینٹ اُکھاڑی تھی

اُس کے عجائب خانے سے
کُچھ مٹی ہی جھاڑی تھی

اُس کا نہیں تھا کوئی قصور
آپ ہی بات بگاڑی تھی

جسے پچھاڑی سمجھا ہوں
افسر کی وہ اگاڑی تھی

اندر سے تھا ٹھیک ظفر
بس کایا ہی ماڑی تھی

☆

نیم تو کڑوی کوڑی تھی
چھانو بہت ہی گوہڑی تھی

ناشتا کیا اُسی کے ساتھ
کیسی حلوہ پُوڑی تھی

لگتی تھی جو امن پسند
پُوری ایک بھسوڑی تھی

قابو کرنے سے پہلے
ہاتھ پانو سے بُوڑی تھی

لہُو کی بُوند کلائی پر
اور ، ٹُوٹی ہُوئی چُوڑی تھی

دانہ تھا اُوپر اُوپر
نیچے تلہ توڑی تھی

ویسے تو لگتے تھے جوان
طبع ہی اپنی بُوڑھی تھی

شاعری کے اُوپر کوئی
اور چیز بھی ڈھوڑی تھی

کام چلانا پڑا ، ظفر
منجی تھی یا پھوہڑی تھی

☆

ناک سے ذرا پکوڑی تھی
خود بھی کافی چوڑی تھی

بھاگتی سب سے آخر میں
سب سے آگے بوہڑی تھی

پانو اُسی سے پھسلا، جو
پیار کی پہلی پوڑی تھی

چھٹی تو چھٹی ہی رہی
ایسی ڈھک کوڑی تھی

چوہے خور لگی مجھ کو
یا کوئی بلّی بتوڑی تھی

کیسے بھلا گذر سکتے
گلی ہی اتنی سوڑی تھی

بھوکے بیٹھے تھے چوگرد
چڑھی ہوئی اک توڑی تھی

کیل ڈھونڈتے پھرتے تھے
ہاتھ میں ایک ہتھوڑی تھی

آ گیا آگے وہی، ظفر
جس سے ڈر کر دوڑی تھی

-☆-

ساؤنی میں بھی ہاڑی تھی
کنک نہیں تھی، راڑی تھی

بہت ملائی تھی اُس پر
اسی لیے تو گاڑھی تھی

نیچے اور بچھاتے کیا
وہ، یا اُس کی ساڑھی تھی

صاف بدن تھا کیا جس پر
ایک بیل سی کاڑھی تھی

خون پی گئی جتنا تھا
ایسی ظالم پاڑھی تھی

ایک اُتارنے سے پہلے
دوسری ہانڈی چاڑھی تھی

دودھ میسّر ہوا نہ جب
تب لسّی ہی کاڑھی تھی

لاڑا تھا پیچھے پیچھے
آگے آگے لاڑی تھی

مونچھیں گم تھیں جہاں، ظفر
اُسی نواح میں ڈاڑھی تھی

-☆-

زور لگا کر توڑی تھی
وہی بعد میں جوڑی تھی

ہڈی نصف چچوڑی تھی
باقی وہیں پہ چھوڑی تھی

جاگی نہیں وہیں سے وہ
جہاں پہ خُوب جھنجوڑی تھی

تینوں چاروں نے اُس رات
ایک رضائی اوڑھی تھی

ٹھنڈی ٹھار تھی آخر تک
کافی دیر جھنجھوڑی تھی

کرنا پڑا گزارہ سا
میرے لیے وہ تھوڑی تھی

ایسے کُھلے نصیب اپنے
تنہا نہیں تھی ، جوڑی تھی

کافی دیر کے بعد کُھلا
گھوڑا نہیں تھا ، گھوڑی تھی

رُوٹھ کے جاتی ہُوئی ، ظفر
آدھی راہ سے موڑی تھی

☆

نیل گُوں فلک نیل
جھیل کی جھلک نیل

قرمزی کنارہ
اور ، دُور تک نیل

رنگ سے تہی خواب
نیند کی تھپک نیل

سچ کی خبر لا
نیل سے جھلک نیل

کان میں سیہ شور
آنکھ میں چمک نیل

اُڑ گیا روش رنگ
کہیں سے اُچک نیل

رُک رہے مُسافر
ہو رہی سڑک نیل

لکھ رکھو ، کہیں ہے
آج کی جھلک نیل

پک نہیں ، ظفر ، کچھ
شاعری بے شک نیل

☆

تھا کبھی سفر نیل
آج تک ہے گھر نیل

نیچے آ نیل کنٹھ
ہو گیا شجر نیل

آئی پھر سفیدی
چڑھا جس قدر نیل

ایک راستہ نہر
ایک رہگذر نیل

کر گیا زباں بھی
تھا جو بے ضرر نیل

قدر کھو کے اپنی
پھرا دربدر نیل

بڑھ گئی اگر مار
پڑ گئے اگر نیل

فکر ہو گیا دور
مل گئی خبر نیل

کر رہو، ظفر، کچھ
ہو رہے ہنر نیل

☆

نہیں اب کوئی سبز
آئی ہے کمی سبز

دور سے یہ زمیں
سرخ ہے کبھی سبز

گھاس کی روش پر
بچھ گئی دری سبز

کوئی زرد اندھیرا
کوئی روشنی سبز

شہر بھی ہے شاداب
شام بھی ابھی سبز

زخم کر گئی ہرے
آئی تھی پری سبز

رنگ چڑھ گیا اور
اب نہیں ہری سبز

شور کا ہے وہ رنگ
اور نہ شاعری سبز

اب، ظفر، کہاں ہے
وہ سخنوری سبز

☆

چل پڑی ہوا سبز
باغ پھر ہُوا سبز

کیا بہار ہری
چھائی تھی گھٹا سبز

زرد رہ گیا کوئی
کوئی ہو گیا سبز

زور مارا ہے بہت
کچھ نہ ہو سکا سبز

لائیے کوئی اور
چاہیے ذرا سبز

رنگ ہو گیا پھر
آسمان کا سبز

عرض الگ ہے ہری
آرزو ہے جُدا سبز

میں رہوں زرد کیوں
ہے مرا خُدا سبز

اثر ہرا آئے گا
مانگیے دُعا سبز

☆

ہے یہ آسماں سُرخ
اور، جہاں تہاں سُرخ

کہتے کہتے ہُوا
رنگ داستاں سُرخ

سبز پانیوں پہ
میرا بادباں سُرخ

آگ ہو گئی سیہ
ہو چلا دُھواں سُرخ

خُوں ہُوئی آرزو
چلیں آندھیاں سُرخ

وقت یہ نہ ہو گا
آئے گا سماں سُرخ

دُودھیا گھروں میں
ایک وہ مکاں سُرخ

برق دُور چمکی
ہُوا آشیاں سُرخ

خُون تھوکنے سے
تھا مرا بیاں سُرخ

☆

ایک رہگذر سُرخ
اور، وہ سفر سُرخ

سبز چاہتے ہو
مل گیا اگر سُرخ

زرد پانیوں میں
تھا کوئی ثمر سُرخ

اِس قدر تھے سُرخاب
ہو گیا شجر سُرخ

مُنھ نہ تھا وہ رنگین
کیا چوم کر سُرخ

نیند ہے یہ بے رنگ
خواب ہے مگر، سُرخ

سنگ دل سے یکلخت
کیا اُڑا شرر سُرخ

زرد تھی صحافت
چھپ گئی خبر سُرخ

اے ظفر، کہاں ہے
وہ ترا ہنر سُرخ

☆

نہیں تن بدن زرد
ہے کبھی چمن زرد

ہیبت خزاں سے
سرو اور سمن زرد

تھا یہی کیا ہرا
کبھی کا ہے بن زرد

دیا ایک دم جلا
ہوئی انجمن زرد

ڈوبنے لگا دن
ہو چلی کرن زرد

ہے بچھڑنا ابھی
کیوں نہ ہو ملن زرد

سُرخ شرٹ پر کیا
سجے ہیں بٹن زرد

ہُوئے ایک ہی ساتھ
نیا اور کُہن زرد

لفظ بیمار تھے
رہ گیا سخن زرد

☆

ہے جو سُو بہ سُو زرد
ہو چکا لہُو زرد

ہُوں ذرا ہَوا میں
کس لیے ہے تُو زرد

ہرا ہے جو موضوع
کیوں ہے گفتگو زرد

وہی ذُو بذُو لوگ
اور ، ہُو بہُو زرد

خُوش تھے پیٹھ پیچھے
اب ہیں رُوبرُو زرد

کُچھ یہاں ہے پیلا
کُچھ کنارِ جُو زرد

کہیں بے وضو سبز
کہیں باوضو زرد

مار کر مجھے کیوں
پڑ گیا عدُو زرد

لفظ مُرجھا گئے
تھا بہت گلو زرد

-☆-

چہرے پڑتے گئے سفید
خُون جو ہو چلے سفید

رات ہوتی نہ تھی سیاہ
دن نکلتے نہ تھے سفید

کچھ پتا ہی نہیں چلا
بال ہوتے رہے سفید

رنگ دیتی ہُوئی ہَوا
بادلوں کے پرے سفید

تھا ہمارا جو سچ سیاہ
جُھوٹ تھے آپ کے سفید

چل رہی تھی عجیب لہر
لگ رہے تھے ہرے سفید

خواب تبدیل جب کیے
دیے رنگیں ، لیے سفید

بال ہم نے بھی حُسن کی
دھوپ ہی میں کیے سفید

ذہن میں گھور تھی ، ظفرؔ رات
آنکھ میں موتیے سفید

-☆-

کِھل رہی تھی کلی سفید
کچھ ہوا بھی چلی سفید

سبز شلوار پر قمیص
لگ رہی تھی بھلی سفید

نقش اچھے تو تھے ، مگر
تھی بہت مجھلی سفید

چھا گئی پہلی روشنی
موم بتی جلی سفید

بھینچ کر لال کی ہے سُرخ
برف کی تھی ڈلی سفید

کس کو آنا تھا ، جب وہاں
ہو رہی تھی گلی سفید

آب دریا میں ایک رات
ہم نے مچھلی تلی سفید

دُور تھے رنگ شام کے
دوپہر جب ڈھلی سفید

بیج بے رنگ تھا ، ظفر
بیل پھولی پھلی سفید

-☆-

لاکھ پہلے سے کم سیاہ
ہیں وُہی اب بھی ہم سیاہ

دونوں ایسے نہ تھے کبھی
ہو گئے ہیں بہم سیاہ

کچھ ترا درمیان اندھیرا
کچھ مرے زیر و بم سیاہ

منزلیں صاف ستھریاں
راستے خم بہ خم سیاہ

زندگی کا لہُو سفید
زندگی کے ستم سیاہ

آنکھ میں دُھند اور غبار
روشنی دم بدم سیاہ

کچھ بٹھائے نقوش اندھیرے
کچھ اُٹھائے قدم سیاہ

کھلتی جاتی وہ روشنی
کُھلتا جاتا بھرم سیاہ

بات چمکے کہاں ، ظفر
ہاتھ میں ہے علم سیاہ

-☆-

لکھ رہا ہوں غزل سیاہ
ہے کوئی چل سو چل سیاہ

فرد کوری تھی اور سفید
تھے ہمارے عمل سیاہ

گر پڑی آسمان سے
رات کیوں منہ کے بل سیاہ

یوں تو بے داغ تھی یہ عمر
تھا وہی ایک پل سیاہ

نیت اچھی سہی ، مگر
پیڑ روشن ہے ، پھل سیاہ

اک گھٹا ہے رکی ہوئی
میرے سر پر اٹل ، سیاہ

پڑ گیا روشنی میں کیا
یہ دوبارہ خلل سیاہ

بال بکھرائے میری سمت
آ رہی تھی اجل سیاہ

وہی اُجلی ہے ، جو ظفر
بات ہو برمحل سیاہ

-☆-

حُسن چارسُو کھُلا
اور ، دُوبدُو کھُلا

شام سے رہی سعی
کہیں صبح تو کھُلا

جسم سے ذرا دُور
پڑا تھا لہو کھُلا

تھا دریچہ زخم
وُہی ہُوبہو کھُلا

بھر رہا تھا پانی
ابھی کُوبکُو کھُلا

چھپا چاہیے دوست
چاہیے عدُو کھُلا

کوئی روزنِ فلک
میرے رُوبرُو کھُلا

وہی میر کا شعر
بند ہے ، کبھو کھُلا

کوچ ہو گئے ، ظفر ، تو
رازِ گفتگو کھُلا

-☆-

تھا جو میہماں تنگ
ہے مرا مکاں تنگ

پھیلتی زمیں پر
ہُوا آسماں تنگ

کچھ بیاں نہ ہو سکی
تھی وہ داستاں تنگ

مجھ سے آخر کار
پڑا یہ جہاں تنگ

کھلا ہے جو تن تال
آ گئی ہے جاں تنگ

وا کشادہ تھے جو
ہُوئے بعدازاں تنگ

کس وسیع گھر میں
رہے رائگاں تنگ

آب ہو کے آگے
بحرِ بے کراں تنگ

کیا ، ظفر ، گذرتے
تھا بہت بیاں تنگ

-☆-

صرف ہے جبیں گرم
اور کچھ نہیں گرم

جسم اُس پری کا
سرد ہے کہیں گرم

ٹھنڈکیں کہیں اور
آسماں زمیں گرم

وہی حال اُوپر
ہے جو تہ نشیں گرم

سانپ سے بھی پہلے
تھی یہ آستیں گرم

سانس کی سلاخیں
رات بھر رہیں گرم

دھوپ تھی ابھی دُور
ہو گئے مکیں گرم

برف تھی جہاں پر
رہ گیا وہیں گرم

ہے ظفر کبھی کا
اپنے ہی تئیں گرم

-☆-

ہے بہت خُدا گرم
آدمی خُدا گرم

جسم حسبِ معمول
تھی، مگر، قبا گرم

کیوں نہ وہ پگھلتا
ہے مری صدا گرم

میں گذر چکا ہوں
ہے جو راستہ گرم

لفظ ہیں ٹھٹھرتے
لوگ جابجا گرم

تھا مرے بجائے
کوئی دوسرا گرم

زمہریر کے ساتھ
آئی کیا ہوا گرم

کس قدر چاہیے ہے
جو رہے چنا گرم

ٹھیک تو، ظفرؔ، ہے
طبع ہے ذرا گرم

☆

آج ہے نہ کل سرد
تھا وہ ایک پل سرد

گرم خود کرو گے
ہے وہ ہم بغل سرد

موسم ایک اُس کا
موت ہے اٹل سرد

آئے گی تپش بھی
ابھی ساتھ چل سرد

فرق تو پڑے گا
گرم سے بدل سرد

گرم تھا بہت قول
ہے، مگر، عمل سرد

دن کہیں سے نکلے
زندگی ہے شل سرد

اتنی گرمیوں میں
ہو گئی غزل سرد

ہے ظفرؔ وہاں دھوپ
جاؤں سر کے بل سرد

☆

پھر رہا ہرن کھلا
لگ رہا تھا اَن کھلا

تیز تھی ہوا تو
دیر بعد بن کھلا

خود ہوا ہے سربسر
جس پہ وہ چمن کھلا

دل ہی تھا مُقفل
پڑا تھا بدن کھلا

روشنی سی اُمڈی
شرٹ کا بٹن کھلا

بین کی صدا پہ
پھول سا وہ پھن کھلا

چھوڑ کر کہیں وہ
چل دیا ہے وطن کھلا

مسجدیں بہت ہیں
گانو کا بھجن کھلا

بھوک تھی بلا کی
جب ، ظفر ، تفن کھلا

-☆-

جب سے ہے قبا بند
حبس ہے ہوا بند

گاڑیاں کھڑی ہیں
اور ، راستہ بند

اس قدر کھلے میں
کچھ ہے جا بجا بند

پھر رہی کھلی خلق
خلق میں خدا بند

سورما تھے اتنے
کوئی کھولتا بند

کیا نکلتی آواز
کھلا منہ ، گلا بند

گفتگو کا بازار
کب سے ہے پڑا بند

کھل کے برستی ہے
تھی بہت گھٹا بند

آپ کا ، ظفر ! وہ
اب نہیں ہے پابند

-☆-

نرم ہے کہیں سخت
اس قدر نہیں سخت

جہاں سے دبایا
رہ گیا وہیں سخت

آسماں وہی دُور
اور، وہی زمیں سخت

سنگ آستاں سے
تھی مری جبیں سخت

تھا وہاں ملائم
ہُوا ہے یہیں سخت

وقت ہی تھا ایسا
کہیں اور سُنیں سخت

اس دفعہ تو نکلے
مکاں سے مکیں سخت

رفتہ رفتہ دل میں
ہُوا جاگزیں سخت

اور بھی ظفر پر
بندشیں ہوئیں سخت

☆

تھا وہ ایک دم سخت
سہم گئے ہم سخت

فاصلے وہی ہیں
پڑے پیچ و خم سخت

پھر نہیں سکے گا
کھائی ہے قسم سخت

کر سکے نہ پولا
تھا وہ زیر و بم سخت

بھربھری تھی یہ خاک
دھر گیا قدم سخت

اور ہی وہ نکلا
لگ رہا تھا کم سخت

ہے جو سنگ زادہ
کیوں نہ ہو صنم سخت

ایک دن تو ہو گا
نرم سے بہم سخت

ہضم ہے جو دُشنام
تھا ظفر شکم سخت

☆

نیند سے پرے نرم
خواب سے ورے نرم

سہج سہج آیا
پانو بھی دھرے نرم

دور سے لگے سخت
تھے وہ سنگترے نرم

کر سکے اگر وہ
طبع کو کرے نرم

ہاتھ پھیرتے تھے
تب ڈرے ڈرے ، نرم

کھیت کے ہر اک سمت
چر ہی باجرے نرم

اور بھی وہاں تھے
کئی دوسرے نرم

مولیوں سے بڑھ کر
تھے وہ مونگرے نرم

تھی ، ظفر ، سخت موت
آپ ہی مرے نرم

☆

مست ماجرا نرم
اور ، ذرا ذرا نرم

تھا کوئی گدیلا
روئی سے بھرا ، نرم

سبزہ زار تھا کیا
تازہ تر ، ہرا ، نرم

گفتگو تھی اس رات
خواب کی طرح نرم

لہجہ کیجیے کچھ
اور بھی ذرا نرم

ورنہ ہے میسّر
ایک دوسرا نرم

پھینک اس طرف بھی
کوئی کنکرا نرم

زخم بھی نہ آئے
چلے استرا نرم

لا ، ظفر ، بدل کر
کوئی پینترا نرم

☆

تھی ہوا کھڑی بند
اور، یہ گھڑی بند

یہ مشین اب تک
رہی ہے پڑی بند

مُنہ کُھلے ہیں چھوٹے
بات ہے بڑی بند

رونقیں لگیں گی
جب ہوئی جھڑی بند

اور کیا چلاتے
ہاتھ ہتھکڑی بند

آگ ہے ذرا سی
رکھو کانگڑی بند

کھل گئے پلازے
چھابڑی پھڑی بند

بُجھ گیا تماشا
ہوئی پھلجھڑی بند

تھا ظفر سیانا
کر گیا تڑی بند

☆

تھا جو پیش و پس کُھلا
ہے اسی برس کُھلا

اُڑ نہیں سکے ہم
تھا درِ قفس کُھلا

بند سب دریچے
ایک ہے یہ بس کُھلا

بے خبر رہے سب
رہا رنگ رس کُھلا

منظرِ مُلاقات
پڑا تھا عبث کُھلا

دیکھتی رہی خلق
خواب نیم رس، کُھلا

زور کی ہوا آئی
یوں درِ ہوس کُھلا

ہے شرر کہاں قید
تھا یہ خار و خس کُھلا

سُن، ظفر، کسی دن
نالۂ جرس کُھلا

☆

یوں ہے گفتگو سرد
ہو گیا لہو سرد

میں تو مر چکا ہوں
کس لیے ہے تُو سرد

چھانو کر رہی تھی
ساری آبجو سرد

ایک سمت ہے گرم
اور، ایک سُو سرد

ہند کا زمستاں
وہی ہُوبہُو سرد

تھا جو دربدر گرم
ہے وہ کُوبکُو سرد

کیا نماز ہو اب
ہو چکا وضو سرد

باغ میں پڑا مینہ
ہُوئے رنگ و بُو سرد

پیش ہے ظفر کے
کوئی جُستجو سرد

-☆-

کچھ نہیں یہاں سرد
ہے مرا مکاں سرد

گرم پانیوں پہ
رہا بادباں سرد

رات جب ڈھل گئی
ہُوئی داستاں سرد

دل ٹھٹھر رہا تھا
ہو رہی تھی جاں سرد

پہلے گرم تھی خلق
ہُوئی بعدازاں سرد

ڈھونڈتا پھرا ہوں
کھو گیا کہاں سرد

جھاڑتا ہے گرمی
آ کے اب یہاں سرد

جم گئی عدالت
تھا بہت بیاں سرد

بُجھ گئی، ظفر، آگ
ہو گیا دھواں سرد

-☆-

طبع کی وہ بھی گرم
اور، بہت گھنی گرم

موقعہ ہے موزوں
بزم ہے ابھی گرم

کاٹ لے گا کوئی
جیب ہے تری گرم

زندگی کے یہ دن
نرم تھے کبھی گرم

شور تو رہا زور
دھوم تو مچی گرم

آخر اپنی مٹھی
آپ نے بھی کی گرم

کیا کریں، جلیبی
ایک ہی بچی گرم

ٹھنڈکوں کے اندر
چیز تھی کوئی گرم

شاعری کی تاثیر
تھی، ظفر، بڑی گرم

☆

آگ بھی بھری گرم
اور، سرسری گرم

سرد موسموں سے
آئی تھی پری گرم

فرش ہی تھا ایسا
ہو گئی دری گرم

آ رہی ہے روٹی
اور دوسری، گرم

ہے سڑک سڑک پر
وہی بے گھری گرم

سرد تر ہے ملتان
اور، ہے مری گرم

شش جہات میں ہے
جنگ زرگری گرم

آتشِ طلب سے
تھی سخنوری گرم

بات ہے ظفر کی
بے غرض، کھری، گرم

☆

عکسِ کارواں گرد
سارا آسماں گرد

اک غبار ہوں میں
ہے مرا نشاں گرد

بحر تھی مری خاک
میرا بادباں گرد

اُڑی اتنی مٹی
ہوئی داستاں گرد

بے حساب پانی
اور ، بے کراں گرد

اس قدر کہاں سے
آئی ہے یہاں گرد

جھاڑنے لگا ہوں
جسم کی یہ جاں گرد

اٹ گیا ہوں ، ورنہ
کہاں میں ، کہاں گرد

خود سے ناشناسا
ہے ظفر جہاں گرد

☆

تھا کوئی سفر دھند
اور ، سربسر دھند

پائے گا کوئی کیا
ہے مری خبر دھند

اک دھواں آسماں
اور ، بحروبر دھند

چھائی ہے ازل سے
یہ وجود پر دھند

کو بہ کو اندھیرا
اور ، در بہ در دھند

ہم نہیں اکیلے
ساتھ ہے اگر دھند

رُک رہے گا سب کچھ
یوں رہی اگر دھند

چھپ گئے ہیں سب عیب
تھا مرا ہنر دھند

صاف کیا نظر آئے
آپ ہے ظفر دھند

☆

یہ نہیں نئی دھول
ہے ظفر وہی دھول

گم ہوا مسافر
راہ پر جمی دھول

جسم کی ہوا سے
روح پر پڑی دھول

برستا گیا مینہ
بیٹھتی گئی دھول

آئنے نہیں صاف
ہے بہت ابھی دھول

آئے ہیں وہاں سے
ہے جہاں بڑی دھول

مل سکا نہ پانی
کھیت میں اُگی دھول

کون الگ کرے گا
دھول میں پھنسی دھول

جو لگی گھٹا سی
اصل میں وہ تھی دھول

☆

دل دھڑک اُٹھا تیز
جب چلی ہوا تیز

سیلِ آب الگ تُند
روشنی جُدا تیز

جانتا نہیں کوئی
کیا ہے سُست، کیا تیز

زندگی کی رفتار
یا ہے راستا تیز

رنگ تو ہیں مدھم
رقص جابجا تیز

لگ رہا تھا مجھ کو
زرد میں ہرا تیز

چاہیے مسالا
اور بھی ذرا تیز

مَیں نہیں تھا تیار
آ گئی قضا تیز

رُک گئی، ظفر، شام
کچھ نہیں بچا تیز

☆

کیوں ہوا سفر سست
کچھ نہیں اگر سست

وہ کہاں پہنچ گئی
میں ہوں بے خبر سست

پڑ گیا تھا گھڑمس
ہے جو سست پر سست

دن چڑھے تھے کچھ اور
رہے رات بھر سست

انقلاب کیا آئے
ہیں یہ خشک و تر سست

انتظار کیجے
ہوا ہے اثر سست

ہوں تو چاق و چوبند
لگ رہا ، مگر ، سست

ہم تو تھے سبک رو
ہے یہ رہگذر سست

ڈوبتے ، ظفر ، کیا
تھا ہی وہ بھنور سست

-☆-

کر گیا عمل سست
تھا جو ایک پل سست

تیز بھی چلیں گے
تھوڑی دور چل سست

پھرتیاں نہ دکھلا
میں ہوں آج کل سست

ہے فضول ، اگر ہو
بات برمحل سست

جانے آئے گی کب
موت ہے اٹل سست

عمر برق رفتار
خواہشوں کا حل سست

چست ہے وہ چولی
رہ گئی غزل سست

ٹوٹ جائے گا کچھ
گر نہ جا ، سنبھل ، سست

رک گیا ، ظفر ، خواب
پڑ گیا خلل سست

-☆-

کیوں نہ ہو لہُو تیز
چل رہی ہے لُو تیز

سُست موج تھی بزم
اور ، گُفتگو تیز

سو رہا ہے اِک پھول
آ رہی ہے بُو تیز

کِس لیے ہے تُو تیز
اور ، ڈوبدُو تیز

زخم کُھل گیا ہے
کر اسے رفُو تیز

چل رہا ہے سیلاب
کیسا کُو بہ کُو تیز

دن وہی ہے ڈھیلا
رات ہُوبہُو تیز

مِیر کی غزل بھی
سُست ہے کبھُو تیز

پھر ، ظفر ، ہیں جاری
رنگ چارسُو تیز

☆

کُچھ نمک ہُوا تلخ
کُچھ ہے ناشتا تلخ

یہ سواد بھی تُرش
وہ بھی ذائقہ تلخ

کُچھ تھا مَیں بھی کڑوا
کُچھ رہی صدا تلخ

ہُوا ہوتے ہوتے
سارا ماجرا تلخ

کُچھ اثر ہو میٹھا
مانگیے دُعا تلخ

بس نہیں یہیں پر
وہ ہے جابجا تلخ

سُن سکیں اگر آپ
بات ہے ذرا تلخ

کُچھ سوال شیریں
کُچھ جواب تھا تلخ

عشق میں ظفر کو
ہُوا تجربہ تلخ

☆

تھی وہ گفتگو شہد
اور ، ہُوبہُو شہد

آئی ہے کہاں سے
سربُسر تُو شہد

زہر اندر اندر
اور ، چارسُو شہد

کیا چپک گئے ہیں
ہے وہ گفتگو شہد

چکھ سکے نہیں ہم
تھا وہ دُوبدُو شہد

سامنے کبھی شام
کبھی رُوبرُو شہد

دھوپ پھیکی پھیکی
چل رہی ہے لُو شہد

پھول کا پیا رس
ہو گیا لہُو شہد

کوششیں، ظفر! کیں
ہو سکی نہ تُو شہد

☆☆

تھا وہ سربسر شہد
اور ، کس قدر شہد

شام ہی سے آغاز
تھا وہ رات بھر شہد

چاٹ کر رہیں گے
مل گیا اگر شہد

ہاتھ میں ہے شمشیر
اور ، زبان پر شہد

تلخ ہو چکی رُوح
کر گیا اثر شہد

ایک پر تھا مکھن
ایک توس پر شہد

دے رہا تھا ترغیب
سامنے شجر شہد

وہ کرے گا تقسیم
جا کے دربدر شہد

ہے ، ظفر ، نوا تلخ
تھا کبھی ہنر شہد

☆☆

تھی بہت زباں تلخ
اور ، ناگہاں تلخ

کب تلک وہ سنتا
تھی یہ داستاں تلخ

جسم کا ہو کیا حال
ہو گئی ہے جاں تلخ

نغمہ تو وہی ہے
خود ہے نغمہ خواں تلخ

کبھی راز کڑوا
کبھی رازداں تلخ

پہلے ذائقہ شہد
اور ، بعدازاں تلخ

کچھ نہیں کہا میں
وہ ہے رائگاں تلخ

ٹھیک تھا وہاں جو
ہے بہت یہاں تلخ

ہُوں کی تُوں ، ظفر ، پیاس
بحرِ بےکراں تلخ

☆

آپ ہیں جہاں دُور
میں نہیں وہاں دُور

سخت ہے زمیں پھر
اور ، آسماں دُور

شور اُس کا ہے پاس
میں ہُوں بے زباں دُور

کبھی گُم سفینہ
کبھی بادباں دُور

ہے ہدف تو نزدیک
تمیں مارخاں دُور

خوف خواب کے ساتھ
عقل سے گُماں دُور

جا مناؤں کیوں کر
ہے وہ بدگماں دُور

تھک چکا ہُوں ، لیکن
ہے ابھی مکاں دُور

منزلِ معانی
ہے ، ظفر ، بیاں دُور

☆

تھی بہت پڑی پاس
اس لیے ڈری پاس

میں بھی ہو گیا سبز
شاخ تھی ہری پاس

رہی ایک شیشی
رنگ سے بھری پاس

دیکھ آؤں نانک
پاس ہے فری پاس

کہہ دیا جب اُس نے
بچھ گئی دری پاس

چُومنا نہیں تو
کس لیے دھری پاس

ہو سکے تو ہو جا
اور بھی ذری پاس

سید پُور ہے دُور
اور ، سمُندری پاس

رہ گئی ، ظفر ، یہ
اپنی بے گھری پاس

☆

رات بھر رہا پاس
پھر بھی کب وہ تھا پاس

امتحان ہم نے
ایک تو کیا پاس

دیکھ کر پسینے
رُک گئی ہوا پاس

اب وہ آئے ہیں ، جب
کُچھ نہیں بچا پاس

چل دیے ہیں اچھے
اور ، ہے بُرا پاس

آپ نے ہمارا
کُچھ نہیں کیا پاس

پچھلا اور پچھولا
دُور ، جو ہُوا پاس

تھوڑی دیر ٹھہرا
رنگ سا جما پاس

نقل کی ظفر نے
اور ، ہو گیا پاس

☆

شاخ سے شجر دور
اور ، اس قدر دور

ہو گیا سفر ختم
اور ، ابھی ہے گھر دور

چارہ کچھ نہیں پاس
وہ بھی ہے اگر دور

خس میں روشنی آئی
تھا ابھی شرر دور

خاک خون اندر
خواب سے خبر دور

پاس ہیں بہت لوگ
آپ ہیں جدھر دور

کوئی ڈوبڈو ، اور
کوئی سربسر دور

خود وہ ہو رہا ہے
مجھ سے خاص کر دور

ہو گیا ، ظفر ، کیوں
بات سے اثر دور

☆

انتظار باہر
بار بار باہر

لگ رہوں گا اک دن
اس کے پار باہر

پیرہن سے نکلا
تار تار باہر

چار تو ہیں اندر
اور ، چار باہر

کچھ زمیں ہے ٹیڑھی
کچھ مدار باہر

گونج ہوں اک ایسی
جو ہے ڈار باہر

کوہسار اندر
آبشار باہر

باری آ گئی جب
تھے قطار باہر

چل گئے ظفر کے
سب اتار باہر

☆

ہے خراب اندر
تھا جو خواب اندر

بے شمار باہر
بے حساب اندر

سطح پر سکوں ہے
پیچ و تاب اندر

آئے ہیں یہاں پاؤں
کب جراب اندر

ہے حباب کے بھی
اک حباب اندر

میں کھڑا تھا باہر
اور ، جناب اندر

کھا کباب باہر
پی شراب اندر

کھل رہے ہیں ، دیکھو
کیا گلاب اندر

ہے ، ظفر ، ہمیشہ
اضطراب اندر

-☆-

دل کہاں اپنی پہ ہے ، پر ہے
پاس کیا اور ہنر ہے ، خر ہے

اس سے بچنا بھی ضروری ٹھہرا
یہ وہی بندہ بشر ہے ، شر ہے

تیرتے پھرتے ہیں مینڈک گویا
جس رکابی میں مٹر ہے ، ٹر ہے

چل رہی ہے کسی ہونے کی ہوا
سب قضا اور قدر ہے ، در ہے

وہی پتا سا لرزتا ہے وجود
صرف کہنے کو نڈر ہے ، ڈر ہے

وہ جو محفوظ نہیں ہے مجھ سے
ایک ہی راہگذر ہے ، زر ہے

اس کی قیمت ابھی کرنی ہے ادا
رات اپنی جو بسر ہے ، سر ہے

ناامیدی میں بھی ہے راحتِ جاں
کوئی اُمید ، مگر ہے ، گر ہے

یعنی بارش کے علاوہ بھی ظفر
آسماں ایک چھتر ہے ، تر ہے

-☆-

واردات اندر
دن کے رات اندر

خود ہوا ہوں باہر
اور ، بات اندر

گانو گم ہوا ہے
شاملات اندر

نکل آئے خالی
تھے جو ہاتھ اندر

تھیں کئی ہی ذاتیں
ایک ذات اندر

گئے ہیں جو پکڑے
جائیں ساتھ اندر

کھیلتے تھے باہر
کھائی مات اندر

لہلہا رہے تھے
پھول پات اندر

اور ، ظفر نہیں ہے
شش جہات اندر

-☆-

اک طرف سبز بچپن ہے ، بن ہے
اور ، آہوئے ختن ہے ، تن ہے

بند ہوتے ہوئے آواز بھی دے
اُس قبا پر جو بٹن ہے ، ٹن ہے

چاندنی پھوٹ رہی ہے کیا کیا
سو بھی اک بول بچن ہے ، چن ہے

رات سے بات بھی ہو سکتی ہے
یہ بھی ایک اپنی کزن ہے ، زن ہے

ہاتھ میں اُس کے بھی جو یُوں دن رات
اپنے آپے میں مگن ہے ، گن ہے

بھوک لگتی ہے تو پھر دیکھیے گا
پیٹ میں جو بھی معا ہے ، اَن ہے

شعر کے ہوتے ہیں دو بھی مطلب
اس میں جو کچھ بھی اپن ہے پن ہے

بعد مرنے کے یہی کام آیا
زیب تن یہ جو کفن ہے ، فن ہے

پھول ہی پھول ہیں یادوں کے ظفر
یہی اپنا جو چمن ہے ، من ہے

-☆-

تھا نہ کام باہر
آئی شام باہر

کر رکھا تھا اُس نے
انتظام باہر

جا کے بھول بیٹھے
اُس کا نام باہر

وہ تمام اندر
میں تمام باہر

بھر رہا ہوں گھر میں
مجھ کو تھام باہر

سب رہیں گے بھوکے
بے طعام باہر

سب سلام اندر
رام رام باہر

کام تھا کہیں اور
دیے دام باہر

پھینک دے، ظفرؔ، اب
کُل کلام باہر

☆

ہوئی ہے کہیں صبح
یہ تو وہ نہیں صبح

آسماں فقط رات
اور، یہ زمیں صبح

چھوڑ کر مکانات
چل دیے مکیں صبح

صبح ہو چکی ہے
پھر ہے بعدازیں صبح

پھر کبھی نہ ہو گی
اس قدر حسیں صبح

ایک بے گماں رات
ایک بے یقیں صبح

دیر تک رہی ہے
کہیں جاگزیں صبح

اس طرح ہو، اے کاش
ہو کبھی یہیں صبح

دی، ظفرؔ، جب آواز
ہو گئی وہیں صبح

☆

چل پڑی جدھر شام
گم ہوئی اُدھر شام

راستہ ہے یہ دن
ہے مرا سفر شام

چھا گئی اگر دُھند
پڑ گئی اگر شام

واپس آئے طائر
مِل گئی خبر شام

بوجھ تھا بہت سا
اور ، شام پر شام

دیر سے کھڑی تھی
راہ میں شجر شام

کوئی بھی نہ نکلا
رہی دربدر شام

ایک راستہ شور
ایک رہگذر شام

چھوڑ گھر کی دہلیز
آئی ہے ، ظفر ، شام

-☆-

ساری گفتگو شام
ہے یہ کوبکو شام

کچھ نہیں عقب میں
ہے جو روبرو شام

میرے دل کے اندر
ڈھل رہی ہے تُو شام

کوئی تاب و تب دن
کوئی رنگ و بُو شام

شام کی طرح کی
تھی وہ ہُوبہو شام

فیصلہ بھی ہو جائے
ہے جو دُوبدُو شام

درمیان میں وہ
اور ، چارسُو شام

زور تھے پسینے
چل رہی تھی لُو شام

دوست سب ظفر کے
اور ، ہے عدو شام

-☆-

دُور ہے اگر صبح
آ یہاں پہ کر صبح

دے ہوا سندیسا
بھیج نامہ بر صبح

تھی زمین پر رات
آسمان پہ صبح

ہو گی رات بھی ساتھ
جائے گی جدھر صبح

کیوں نہیں تھی کافی
ہوئی جس قدر صبح

رات ہی سمجھ کر
کیجیے بسر صبح

چھا گئے اندھیرے
کر گیا شجر صبح

ہوا شاید اُس پہ
کچھ مرا اثر صبح

رات بھی، ظفر، اب
آئے گی نظر صبح

☆

راہ میں ملی گرد
پھیلتی ہوئی گرد

کارواں تھا کچھ تیز
اور، کچھ اُڑی گرد

جس طرف بھی جائیں
دُھند ہے، کبھی گرد

آ رہی ہے واپس
شہر سے چلی گرد

پھر اُٹھے گی اک دم
گرد میں دبی گرد

کس کی جستجو میں
گھومتی رہی گرد

صاف تھا بہت مُنہ
آئنے پہ تھی گرد

دیکھ کر گھٹا کو
بیٹھنے لگی گرد

جھاڑ دے، ظفر! کوئی
شہر پہ جمی گرد

☆

ہیں زمیں زماں گرد
سارا آسماں گرد

رات ہے یہ کیوں صاف
گم ہوئی کہاں گرد

بات کر گئی ہے
ایک ، بے زباں گرد

سن کبھی ہوا سے
ساری داستاں گرد

اب جہاں ہے گرداب
تھی کبھی یہاں گرد

تیز آندھیوں میں
ہوا آشیاں گرد

بیٹھنے کو تیار
ہے مری فغاں گرد

سن سکے اگر کوئی
ہے مرا بیاں گرد

رک گئے ، ظفر ! کیوں
تم تو تھے جہاں گرد

☆

وہی چارسُو دھند
ہے یہ جستجو دھند

چل رہا ہوں ، اور ، ہے
راستے میں تُو دھند

کھا گئی معانی
لفظ میں لہو دھند

اُڑ رہی ہے ہر سُو
کوئی گفتگو دھند

دُوبدُو کوئی دھول
اور نہ رُوبرُو دھند

ساری عزتیں خاک
ساری آبرو دھند

کر چکی ہے غائب
سبھی رنگ و بُو دھند

دھند تھی کہاں وہ
تھی جو ہُوبہُو دھند

میر بھی ، ظفر ! کچھ
دھواں ہے کچھو دھند

☆

چھٹنے لگی دھند
تھی کہیں کبھی دھند

کچھ مرا دھواں ہے
اور، کچھ تری دھند

کچھ نظر نہ آیا
آئنے پہ تھی دھند

دھوپ چھپ گئی تھی
اس قدر پڑی دھند

تھی بہت اچھی
راہ میں کھڑی دھند

تھی ابھی یہاں پر
پھر کہاں گئی دھند

اب نہ چل سکیں گے
اب تو چھا چکی دھند

گھیر ہی چکے ہیں
شام، تیرگی، دھند

صاف اسے، ظفرؔ، کر
ہے یہ شاعری دھند

☆

سب سے ہے سفر برا
اور، کس قدر برا

کوئی بے خبر ٹھیک
کوئی باخبر برا

شام سے ہے آغاز
اور، رات بھر برا

کبھی فرش پہ خوب
کبھی کھاٹ پر برا

بھلی تھی نصیحت
ہوا ہے اثر برا

بد ہے صرف نیت
نہیں مال و زر برا

کیوں پڑے ہو پیچھے
ہوں بہت اگر برا

کوبکو غلط ہے
اور، دربدر برا

آزما کے دیکھو
اب نہیں ظفرؔ برا

☆

ہے یہ آسماں بُرا
اور ، یہاں وہاں بُرا

وہ بھی ہے بہت ٹھیک
میں بھی ہُوں کہاں بُرا

بھلا بدزباں کوئی
کوئی بے زباں بُرا

ہیں مکیں تو اچھے
کیوں لگا مکاں بُرا

سانس رُک گئی تھی
لگا تھا دُھواں بُرا

جو وہاں بُرا تھا
کیوں نہ ہو یہاں بُرا

جیب ہی تھی خالی
ملا رائیگاں بُرا

سُن رہے تھے کیوں لوگ
تھا اگر بیاں بُرا

چل دیے ظفرؔ بھی
چھوڑ کر جہاں بُرا

-☆-

لگ رہا بدن بھلا
ہے ترا چمن بھلا

عام سا ہی تھا وہ
لگا دفعتاً بھلا

مور نے کیا تھا
اور بھی وُہ بن بھلا

لگ رہا ہے کیسا
بھاگتا ہرن بھلا

بُھوک سے بھی مر جائیں
پھر بھی ہے وطن بھلا

جو لگے بھلا بھی
وہی بانکپن بھلا

کُھلا ہی تھا پہلے
یُوں لگا بٹن بھلا

حُسن ظن بُرا کوئی
اور ، سُوء ظن بھلا

تھا ظفرؔ بُرا تو
جچ گیا کفن بھلا

-☆-

ہے جو رُوبرُو بھلا
ہو گا سُو بہ سُو بھلا

نہیں کوئی موضوع
کیا ہو گفتگو بھلا

سب سے میں بُرا ہُوں
اور سب سے تُو بھلا

جُستجو سے بڑھ کر
خواب جُستجو بھلا

دُوبدُو بُرا کہیں
کہیں کُوبکُو بھلا

جانے کیا نکل آئے
ہے تو ہُوبہُو بھلا

بے نماز ہے دل
کیا کرے وضو بھلا

لڑے گا تو کُھل کر
دوست سے عدُو بھلا

رگوں میں، ظفر، یہ
رُک رہا لہُو بھلا

☆

رہے گی کمی ابھی
آئی ہے ابھی ابھی

جامِ زہر دے کر
کہا، اس کو پی، ابھی

اور بھی کُھلے گا
رنگِ دُشمنی ابھی

پڑی تھی کہ بُجھتی
کہاں گئی، تھی ابھی

بیٹھ جائے گی پھر
لہر جو اُٹھی ابھی

حکم تھا، چلے جاؤ
کیا عرض، جی، ابھی

ہنس پڑی ہے بے شک
نہیں پھنسے گی ابھی

وقت پر بُجھے گی
آگ جو لگی ابھی

جو بھی ہو، ظفر، یہ
نہیں شاعری ابھی

☆

ہو چکا ہے کیا ابھی
چلے گا پتا ابھی

یہاں بھی ہے ممکن
وہاں جو ہُوا ابھی

رکیں گے پسینے
چلے گی ہَوا ابھی

سامنے سے اپنے
ہٹ نہیں رہا ابھی

کان کھول رکھو
آئے گی صدا ابھی

رنگ جو سمیٹے
پھر ہیں جابجا ابھی

فیصلہ یہی ہے
رہیں گے جُدا ابھی

آ رہا تھا مُجھ کو
خواب آپ کا ابھی

ہے، ظفر، یہیں وہ
ہو گا سامنا ابھی

-☆-

چین تو پڑے کبھی
مجھے اور تجھے کبھی

دور بھی ہُوئے ہم
پاس بھی رہے کبھی

پھر بچھڑ بھی جانا
مل تو لے، ارے کبھی

زندگی میں اپنی
آپ بھی ہنسے کبھی؟

چل پڑوں گا اِک دن
رات دو بجے کبھی

یہ دیا ہے کیسا
بُجھے اور جلے کبھی

کبھی آئے سیلاب
اور، زلزلے کبھی

سنگ تھے کبھی نرم
سخت آئنے کبھی

اے ظفر، نکلیں گے
بند راستے کبھی

-☆-

ساتھ چل پڑو کبھی
اس طرح بھی ہو کبھی

رات کیا رہو گے
بات ہی کرو کبھی

سب ہی خرچ ہو جاؤ
اور ، بچ رہو کبھی

دیر دیر سے کیا
روز بھی مِلو کبھی

باغ بھی نہیں بُرا
گھر بھی آؤ تو کبھی

میرے ساتھ بیٹھو
ساتھ ہی اُٹھو کبھی

کر بھی چھوڑیے کام
میرے ایک دو کبھی

مَیں بھی آ مِلوں گا
راہ میں رُکو کبھی

جو ، ظفرؔ ، گیا ہے
آ رہے گا وہ کبھی

-☆-

آسماں زمیں سست
تیز ہیں کہیں سست

جس قدر لگا ہُوں
اُس قدر نہیں سست

چُست آستیں میں
مار آستیں سست

ہو گئے تھے آ کر
اور بھی مکیں سست

تھے جو تیز طرار
ہُوئے بعدازیں سست

گرم شوہروں کو
بیویاں ملیں سست

تھا کسا ہُوا جسم
اور ، ادائیں تھیں سست

سجدہ ہے تنک تاب
اور ، مری جبیں سست

ہے یہاں تو کچھ اور
تھا ظفرؔ وہیں سست

-☆-

کیا ہوا چلی سُست
ہُوا ہر کوئی سُست

چُست ہیں گواہان
اور ، مُدعی سُست

کچھ نہیں بھروسا
چُست ہیں کبھی سُست

زندگی کی رفتار
ہے بہت ابھی سُست

تھی نہیں وہ ایسی
پر مجھے لگی سُست

اُس سے کیا گلہ ہے
تھا مَیں آپ ہی سُست

تھا وہ خُوب چالاک
اور ، مَیں سبھی سُست

کب پڑے گی آخر
جنگِ زرگری سُست

تُو بھی کچھ ظفر ! تھم
ہیں یہاں سبھی سُست

☆

سُست میں پھنسا چُست
ہُوا ماجرا چُست

جانتا نہیں کوئی
کیا ہے سُست ، کیا چُست

جسم تو ہے ڈھیلا
اور ، ہے قبا چُست

مَیں نہیں تو کیا ہے
ہے مرا خُدا چُست

سُست ہیں مُسافر
اور ، راستہ چُست

سوئے پیڑ پودے
کر گئی ہوا چُست

مَیں الگ ہُوں چالاک
اور ، وہ خُدا چُست

کر گئی ہے بارش
سب الابلا چُست

کچھ ہوا تھی ایسی
کچھ ظفر نہ تھا چُست

☆

نیند سے بھری چپ
آئی تھی پری چپ

کوئی اور تھی وہ
یہ ہے دوسری چپ

تھا زیاں صدا میں
لائی بہتری چپ

بولنے لگی ہے
طاق پر دھری چپ

لگ گئی جو رونے
پھر نہیں کری چپ

زرد گفتگو پر
چھا گئی ہری چپ

ڈھونڈتی ہے آواز
کہاں ہے، اری، چپ

کھا گئی ہے سب شور
ایک سرسری چپ

بولنے سے اب تو
ہے، ظفر، کھری چپ

☆

شام کا مچا شور
رات بھر رہا شور

کچھ تھا میرا شیون
تھا کچھ آپ کا شور

چھائے چپ اندھیرے
جل اُٹھا دیا شور

شہر کی ہے سوغات
دھواں، گرد یا شور

میرے تک نہ پہنچا
عمر بھر مرا شور

ہر طرف ملے گا
راہ پر کھڑا شور

کان میں سجا رنگ
آنکھ میں جما شور

سُنا تھا نہ دیکھا
اس قدر بڑا شور

تھا، ظفر، عقب میں
سامنے بھی تھا شور

☆

ظاہر میں لڑی ہوئی سی
اور بات بہت بڑھی ہوئی تھی

کچھ وقت ہی تھا عجب کہ سب کو
اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی

دل کے پاتال میں تھی جو بات
ماتھے پر بھی مڑھی ہوئی تھی

مونچھوں کو ہی تر نہیں کیا تھا
سر کو بھی ذرا چڑھی ہوئی تھی

دل تنگ تھے ہم بھی کچھ زیادہ
کچھ وہ بھی بہت سڑی ہوئی تھی

ہلتی ہی نہ تھی جگہ سے اپنی
کچھ فرش میں بھی گڑی ہوئی تھی

کہلائے وہیں وہیں معزز
رسوائی جہاں بڑی ہوئی تھی

اپنی یہ زمیں خلا کے اندر
پتھر سا کیا جڑی ہوئی تھی

کچھ بھی نہ تھی اصل میں، ظفرؔ، وہ
جس بات پہ یوں اڑی ہوئی تھی

☆

پردہ سا کہیں ہٹا ہوا تھا
منظر بھی ذرا پھٹا ہوا تھا

موجود تو تھا وہاں پہ میں بھی
خانوں میں، مگر، بٹا ہوا تھا

مٹی نہیں، تھا کچھ اور جس میں
میں واپسی پہ اٹا ہوا تھا

میں ہار چکا تھا جنگ، لیکن
کیا جانیے کیوں ڈٹا ہوا تھا

سُننے کے لیے تھا وہ بھی تیار
میں نے بھی سبق رٹا ہوا تھا

بھٹکا ہوں اُس کے ساتھ میں بھی
جس قافلے سے کٹا ہوا تھا

موجود وہاں تھا ایک میں ہی
اتنا جہاں جمگھٹا ہوا تھا

باہر باہر بڑھوتری تھی
اندر اندر گھٹا ہوا تھا

غائب تھی دھوپ ہی وہاں سے
بادل تو، ظفرؔ، چھٹا ہوا تھا

☆

خوشیوں سے جو دل بھرے ہوئے تھے
اندر اندر ڈرے ہوئے تھے

آتے رہے سطح پر نظر ہم
ڈوبے ہوئے بھی ترے ہوئے تھے

کچھ راکھ اڑی ہوئی تھی ہر سو
کچھ پھول وہاں دھرے ہوئے تھے

اتنا ہی قریب تھے وہ ہم سے
جتنا جتنا پرے ہوئے تھے

بارش کے بغیر ہی یہاں پر
کچھ پیڑ کہیں ہرے ہوئے تھے

ہوتے رہے زندہ باد جو لوگ
دراصل وہی مرے ہوئے تھے

بازار تھا گرم شاعری کا
کھوٹے بھی جہاں کھرے ہوئے تھے

مانا ہی نہیں کسی نے ہم کو
مقبول تو دوسرے ہوئے تھے

موسم تھا، ظفر، عجیب اندر
ہم دھوپ میں بھی ٹھرے ہوئے تھے

☆

جیسی تھیں جہاں جسی ہوئی تھیں
ایسی بھی کہیں اسی ہوئی تھیں

شکلیں جو کہیں نہیں تھیں موجود
دل کے اندر بسی ہوئی تھیں

روتی ہوئی آرزوئیں اکثر
اپنا حصہ ہنسی ہوئی تھیں

چیزیں ساری اسی طرح سے
اک دوسری میں پھنسی ہوئی تھیں

سارے لڑکوں کے ساتھ اس بار
سب لڑکیاں ہی پھنسی ہوئی تھیں

نیلی تھیں جس قدر زمینیں
افلاک ہی کی ڈسی ہوئی تھیں

معدے بھی مٹھاس مانگتے تھے
انجیریں بھی رسی ہوئی تھیں

ڈھیلی تھی شاعری، اگرچہ
چاروں چولیں کسی ہوئی تھیں

طرفیں تھیں، ظفر، الگ الگ جو
کچھ وہ بھی آپسی ہوئی تھیں

☆

کچھ اگر بے کنار ہے مجھ میں
کون یہ آر پار ہے مجھ میں

ایک بارش سے بیٹھتا کیوں کر
اتنا گرد و غبار ہے مجھ میں

آ رہا ہوں کسی بلندی سے
کوئی اپنا اُتار ہے مجھ میں

آتے جاتے ہیں لوگ شام و سحر
کیا کوئی رہگزار ہے مجھ میں

اتنا پانی کہاں سے آتا ہے
پھر وہی آبشار ہے مجھ میں

جیسے تعمیر ہونے والا ہوں
کوئی آغازِ کار ہے مجھ میں

کوئی جلدی تھی آج تو، ورنہ
صبر بھی بے شمار ہے مجھ میں

سادگی ہے وجود پر، لیکن
کوئی شے رنگدار ہے مجھ میں

آنے والے سب آ چکے ہیں، ظفر
اور، وہی انتظار ہے مجھ میں

☆

یہ جو خواب و خیال ہے مجھ میں
سو بھی ایک احتمال ہے مجھ میں

روزِ اوّل سے ہوں زوال پذیر
ایک یہ بھی کمال ہے مجھ میں

میں جو طرزیں نکالتا ہوں نئی
اک پرانی سی چال ہے مجھ میں

سنگ ہوں تو شرر سے ہوں محروم
آئنہ ہوں تو بال ہے مجھ میں

اس کی زد میں ہوں آپ بھی اب تو
جو قتال و جدال ہے مجھ میں

ٹوٹتا پھوٹتا ہی رہتا ہوں
جب سے یہ دیکھ بھال ہے مجھ میں

میں نے پھنسنا ہے جس میں خود اک دن
بچھ رہا کوئی جال ہے مجھ میں

روشنی ہے سیاہ سی کوئی
رنگ سا کوئی لال ہے مجھ میں

حالت اپنی ہی یہ نہیں کہ ظفر
دوسروں کا بھی حال ہے مجھ میں

☆

چارسُو کوئی شام ہے مُجھ میں
یہ دُھندلکا مدام ہے مُجھ میں

وہ جو مُجھ سے نہیں ہُوا تھا شروع
اُس کا اب اختتام ہے مُجھ میں

کبھی دالانِ دل کے چاروں طرف
کہیں بالائے بام ہے مُجھ میں

وہ اکیلا نہیں مرے اندر
اور بھی تام جھام ہے مُجھ میں

ایک اُس کے یہاں پہ ہونے سے
اک عجب ازدحام ہے مُجھ میں

مُجھ تو ہے انتظار بھی اُس کا
اور کُچھ انتظام ہے مُجھ میں

بند آنکھوں سے جو نظر آئے
وہ تماشا تو عام ہے مُجھ میں

اُٹھ رہا ایک شور ہے اندر
ہو رہا کوئی کام ہے مُجھ میں

جلتی بُجھتی ہیں بتیاں سی ظفر
کیا کسی کا قیام ہے مُجھ میں

☆

حمید اختر خاں نیازی کے نام

گرد ہستی نے دل کو دی ہے شکست
آئنہ اس غبار سے ٹوٹا

میر دردؔ

یہ جو دریاے خواب ہے مجھ میں
بے حد و بے حساب ہے مجھ میں

کچھ اندھیرے جو میرے اپنے ہیں
کچھ تری آب و تاب ہے مجھ میں

راستے بند ہو رہے باہر
کھل رہا کوئی باب ہے مجھ میں

رنگ ہیں روشنی کے ساتھ رواں
یا کوئی بے نقاب ہے مجھ میں

بہت اچھا بھی ہے ، مگر ، کم کم
اور ، زیادہ خراب ہے مجھ میں

کوئی صورت کہاں سے ہو پیدا
دشت ہی بے سراب ہے مجھ میں

پتی پتی بکھرتا رہتا ہے
کس طرح کا گلاب ہے مجھ میں

کوئی پھیلا رہا یہ دین اپنا
ایک صاحب کتاب ہے مجھ میں

میرا اپنا کیا دھرا ہے ، ظفرؔ
جو عذاب و ثواب ہے مجھ میں

☆

وہم ہے یا گمان ہے مجھ میں
یہ زمیں ، آسمان ہے مجھ میں

سب اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں
جان ہے تو جہان ہے مجھ میں

واقعہ مجھ سے اک ہوا تھا شروع
ختم اک داستان ہے مجھ میں

یہی شانِ لباسِ خستہ نہیں
اور بھی آن بان ہے مجھ میں

ناؤ ہے سانس کے سہارے پر
یہ بھی کیا بادبان ہے مجھ میں

بیٹھ جاتا ہوں دو قدم چل کر
اس طرح کی اُٹھان ہے مجھ میں

خود ہوا ہوں بیان سے باہر
ابھی میرا بیان ہے مجھ میں

اس میں بھی تنگ ہے جگہ اب تو
یہ جو کُنجِ امان ہے مجھ میں

چاہیے ہے کرایہ دار ، ظفر
ایک خالی مکان ہے مجھ میں

☆

دن ڈھلا ہے نہ رات ہے مجھ میں
اور ہی کوئی بات ہے مجھ میں

میں اکیلا نہیں سفر میں ابھی
اور بھی کوئی ساتھ ہے مجھ میں

کبھی دل سے نکل کے دیکھوں گا
اک عجب شاملات ہے مجھ میں

دیکھتا ہوں جہاں سے دُنیا کو
ایک چھوٹی سی جہات ہے مجھ میں

بیٹھتا ہی نہیں کوئی مرے پاس
اس قدر چھوت چھات ہے مجھ میں

صرف اندھوں کو جو نظر آئے
جلوۂ شش جہات ہے مجھ میں

روز ہی اہلِ شہر کے ہاتھوں
اک نئی واردات ہے مجھ میں

یہ بھی کچھ کم نہیں اگر اب کے
میری اپنی ہی ذات ہے مجھ میں

خود کو تقسیم کر لیا ہے ، ظفر
میری اپنی قنات ہے مجھ میں

☆

یہ جو تیر و تفنگ ہے مجھ میں
اپنے ہی ساتھ جنگ ہے مجھ میں

خُوش نہیں دُور کے مُسافر بھی
رہنے والا بھی تنگ ہے مجھ میں

دُور ہے جس کی اور ہاتھوں میں
دل بھی کوئی پتنگ ہے مجھ میں

جانے والے تو تھے پریشاں ہی
آنے والا بھی دنگ ہے مجھ میں

بے تعلّق پھرا کروں سب سے
ایک یہ بھی اُمنگ ہے مجھ میں

چل رہی ہے ہَوا کہیں نمدار
لگ رہا کوئی زنگ ہے مجھ میں

خوف ہے کوئی میرے سر پہ سوار
اور، لہجہ دبنگ ہے مجھ میں

کام تو چل رہا ہے میرا بھی
ڈھب کوئی ہے نہ ڈھنگ ہے مجھ میں

اُڑتا جاتا یہ رفتہ رفتہ، ظفرؔ
میرا اپنا ہی رنگ ہے مجھ میں

☆

اشک ہیں، اور، سکون ہے مجھ میں
پھر وہی مون سُون ہے مجھ میں

گرم رکھتی ہے سردیوں میں بھی جو
اُگ رہی کوئی اُون ہے مجھ میں

لوگ پہچانتے ہیں خُوب اپنے
اپنا ہی کارٹون ہے مجھ میں

جسم کی چھت کھڑی ہے جس پہ ابھی
دل ہی ایسا ستُون ہے مجھ میں

کوئی موسم ہے اور ہی اب تو
یہ دسمبر نہ جُون ہے مجھ میں

دُور و نزدیک سُوجھتا نہیں کیوں
جو درون و برون ہے مجھ میں

خود پگھلتا ہُوا ہُوں باہر سے
جم رہا کوئی خُون ہے مجھ میں

ہے غنیمت، بچاکھچا جو ابھی
شعلۂ سابقون ہے مجھ میں

شاعری کو لگا رہا ہُوں، ظفرؔ
جو بھی کچھ تیل نُون ہے مجھ میں

☆

آتش و انجماد ہے مجھ میں
کیسا کیسا تضاد ہے مجھ میں

خواب سے پہلے کچھ نہیں یکسر
جو بھی ہے، اُس کے بعد ہے مجھ میں

زخم کھلتے ہیں، سانس گھٹتی ہے
ایسی بست و کشاد ہے مجھ میں

رنج دل ہے ہرا بھرا اب تک
کوئی تو ہے جو شاد ہے مجھ میں

دشمنی کا ہی رہ گیا سروکار
ورنہ کس کا مفاد ہے مجھ میں

کوئی اس کا سبب نہیں تُو ہی
یہ جو اتنا فساد ہے مجھ میں

کوئی جلسہ ہے زور کا جیسے
جس کا یہ انعقاد ہے مجھ میں

جسے اب تک تلاش کرتا ہوں
گم شدہ ایک یاد ہے مجھ میں

آندھیاں سی جو چل رہی ہیں، ظفر
صورتِ خاک و باد ہے مجھ میں

☆

مستی کا وفور ہے مجھ میں
بات کوئی ضرور ہے مجھ میں

کوئی پہچان تو ہے میری بھی
دشت ہوں، اور، کھجور ہے مجھ میں

دیتا ہوں دوسروں کو ہی الزام
ورنہ سارا قصور ہے مجھ میں

جسے باہر سے سوجھتا تھا کبھی
آج وہ بے حضور ہے مجھ میں

جس قدر فاصلے تھے باہر سے
کوئی اُتنا ہی دور ہے مجھ میں

پھل نہیں مجھ پہ آ رہا، ورنہ
پھول پتے ہیں، بور ہے مجھ میں

کچھ نظر آ رہا ہوں ساحل پر
نہ یہ دریا عبور ہے مجھ میں

عکس تھا ایک، اب ہزاروں ہیں
آئنہ چور چور ہے مجھ میں

جس کو سارے بھگت رہے ہیں، ظفر
سب فساد و فتور ہے مجھ میں

☆

رنگ پنہاں ہیں ، راز ہے مجھ میں
اک عجب ساز باز ہے مجھ میں

نو بہ نو روشنی سی ، رستہ سا
بعض اُس میں ہے بعض ہے مجھ میں

اک طرف سنگ سنگ ہوں یکسر
ایک جانب گداز ہے مجھ میں

ہے کوئی احتجاج ہی اب تو
نہ کوئی اعتراض ہے مجھ میں

صرف مجھ تک نہیں پہنچ سکتی
یہ جو آوازِ ساز ہے مجھ میں

کچھ ہیں ٹیلے ، گڑھے مرے باہر
کچھ نشیب و فراز ہے مجھ میں

راستی ہے اگر تو اتنی سی
ہر حقیقت مجاز ہے مجھ میں

میں بھی ہوں محض دوسروں جیسا
اک یہی امتیاز ہے مجھ میں

ایک سایہ سا چل رہا ہے ، ظفر
ایک سورج دراز ہے مجھ میں

☆

زور نہیں تو زاری کر
بیٹھا عرض گزاری کر

کام مجھے بھی کوئی نہیں
تو بھی وقت گزاری کر

عہدہ چھوٹا موٹا ڈھونڈ
کام کوئی سرکاری کر

پہلے بات ذرا سن لے
یونہی نہیں سواری کر

مست ، ملنگ دعا دیں گے
خدمت کوئی ہماری کر

ہلکی پھلکی ہے اتنی
تھوڑا پانو ہی بھاری کر

دال وصل کی پھیکی ہے
تھوڑی بہت کراری کر

یا تلوار نیام میں ڈال
یا اس کو دودھاری کر

جیسا بھی لہجہ ہے ، ظفر
اور اسے بازاری کر

☆

ڈاکے مار، کمائی کر
مت یہ مغز کھپائی کر

کام نہیں ہے کوئی اگر
کہیں لگائی بجھائی کر

آتا جاتا ہے جو وہاں
کوئی بات بنائی کر

کام کاج کی نہیں اگر
باتیں ہی دوڈھائی کر

لوگوں کا یہ کام نہیں
اپنی آپ بڑائی کر

رکھ اُمید بُرائی کی
جس کے ساتھ بھلائی کر

ہو سکتی ہے کچھ اصلاح
اپنی آپ ڈھلائی کر

بکھری ہوئی یہ زُلف کہیں
آگے سے تو ہٹائی کر

کچھ بھی رہ جائے نہ، ظفر
چاروں سمت صفائی کر

☆

مرضی یا مجبوری کر
سب کچھ غیرضروری کر

باقی ہوتا رہے گا پھر
سارا کام عبوری کر

بھید کسی کا ڈھونڈ کوئی
پھر اُس کی مشہوری کر

جان خلاصی ہو جلدی
تاری کر یا ٹوری کر

ضائع ہی تو جاتی ہے
کوشش آج ادھوری کر

خاطر خدمت کچھ تو ہو
تھوڑی کر یا پوری کر

مجھے بھی جلدی نہیں بہت
تُو بھی صبر صبوری کر

پاس آ کر ہی بیٹھ ذرا
دُور کہیں رنجوری کر

وصل کی رات آئی ہے، ظفر
آج یہی مزدوری کر

☆

درمیان میں چھوڑی چائے
تھی کوئی ایسی ویسی چائے

مل جاتی ہے، یہی بہت ہے
کیا پتلی، کیا گاڑھی چائے

مزیدار دونوں ہوتے ہیں
بُرا کام اور اچھی چائے

مل کر بات بنائیں شاید
نقلی دُودھ اور اصلی چائے

بات ہی ایسی چھیڑی اُس نے
پڑی رہ گئی آدھی چائے

ذرا اندھیرا بھی کر رکھنا
جس دن کرو ہماری چائے

مَیں تھا اور جگہ مصروف
پی گئے وہ میری بھی چائے

ملنا چاہتی ہیں آپس میں
میری اور تُمھاری چائے

ظالم نے میرے اور اپنے
درمیان میں رکھی چائے

☆

موسم کا پیترا نکل آیا
بادل جو ہٹے، کھرا نکل آیا

اُوپر سے سیب لگ رہا تھا جو
اندر سے سنگترہ نکل آیا

پت جھڑ کے بعد کیا بہار آئی
پیلے سے کیا ہرا نکل آیا

کٹوا کر ناک مَیں نے دیکھا جب
نیچے سے زخرہ نکل آیا

تشدید ہٹا کے دیکھتا تھا مَیں
چھترہ تھا جو چھرا نکل آیا

واپس پھر جا نہیں سکا ہرگز
گھر سے جو مَیں ذرا نکل آیا

مَیں خود تو بند ہی رہا، لیکن
کچھ مجھ سے ماورا نکل آیا

آگے جانا نہیں پڑا ہم کو
شیخو میں سنگھرہ نکل آیا

حیران ہی کر گیا ظفر سب کو
خالی تھا، بھرا بھرا نکل آیا

☆

گھر سے جو ڈری نکل آئی
میں تو سمجھا پری نکل آئی

بوسہ ہی سمجھ رہا تھا میں جس کو
آخر ہم بستری نکل آئی

باہر سے مستقل لگی تھی جو
اندر سے سرسری نکل آئی

ظاہر سے ہی اصل سمجھے تھے جو
جازم کھینچا ، وری نکل آئی

آنکھوں نے کھا لیا تھا پھر دھوکا
خشکی کی جگہ تری نکل آئی

اتنے رنگوں، رفاقتوں کے بعد
کیسی بے منظری نکل آئی

جامد تھی زندگی بظاہر تو
لیکن کیا تھرتھری نکل آئی

دیکھیں گے آر پار اب سب کچھ
دیوار میں ہی جھری نکل آئی

بلوا بھیجا ، ظفر ، کسی نے کیا
اپنی بھی لاٹری نکل آئی

-☆-

مولی سے موگرے نکل آئے
سو بھی سب سے ہرے نکل آئے

دیوار وہاں نہ تھی کوئی ، لیکن
پھر بھی کچھ آسرے نکل آئے

اُدھڑی ہے شعر کی سڑک ایسی
نیچے سے کنکرے نکل آئے

آتا ہے شور یہ کہاں سے اب
زندہ تو سب مرے نکل آئے

سمتیں تو کھو چکی تھیں سب ہم سے
کیسے وہ بھی ورے نکل آئے

ڈوبے تھے ساتھ ساتھ ہی لیکن ، وہ
ہم سے اتنا پرے نکل آئے

گندم بوئی تھی جس جگہ پہ ہم نے
مکئی اور باجرے نکل آئے

دُنیا تھی عقلمند ساری ، لیکن
عاشق ہی باورے نکل آئے

رستے تو بند تھے ، ظفر ، سارے ہی
کس سمت سے ہم ، ارے نکل آئے

-☆-

عمامہ آدمی ہوں
علامہ آدمی ہوں

پہنے ہوئے ہوں خود کو
پاجامہ آدمی ہوں

ڈھونڈے کوئی تو مانوں
اوسامہ آدمی ہوں

لکھنا ہے کام میرا
میں خامہ آدمی ہوں

اب اس میں شک ہی کیا ہے
ہنگامہ آدمی ہوں

مضمون کے بجائے
سرنامہ آدمی ہوں

انکار تو نہیں ہے
ہاں ، ڈراما آدمی ہوں

کاغذ کے پھول سونگھے
کیا شامہ آدمی ہوں

ہوں خاص بھی ، ظفر ، میں
اور ، عامہ آدمی ہوں

☆

دیوانہ آدمی ہوں
مستانہ آدمی ہوں

خدمت کچھ اور مجھے
مولانا آدمی ہوں

مرتا ہوں تیسویں دن
ماہانہ آدمی ہوں

اب تو کئی دنوں سے
روزانہ آدمی ہوں

منسوخ ہو چکا جو
وہ آنہ آدمی ہوں

اپنی غرض کا بندہ
فرزانہ آدمی ہوں

رہ کر تو مجھ میں دیکھو
کاشانہ آدمی ہوں

اپنا ہوں ، اور ، بظاہر
بیگانہ آدمی ہوں

دست سوال ہوں میں
طلبانہ آدمی ہوں

☆

آئینہ آدمی ہوں
دیرینہ آدمی ہوں

اک مُہر ہوں ربڑ کی
کابینہ آدمی ہوں

خوشبو تو دیکھیے گا
پودینہ آدمی ہوں

کھویا ہُوا کسی کا
گنجینہ آدمی ہوں

میں اصل ہوں ذریعہ
اور، زینہ آدمی ہوں

میری کمر نہیں ہے
میں سینہ آدمی ہوں

ٹی وی نہیں، مگر، میں
انٹینا آدمی ہوں

پنڈی سے ہے جو پہلے
وہ دینہ آدمی ہوں

ہو کر کرخت بھی میں
پشمینہ آدمی ہوں

☆

مایوس آدمی ہوں
منحوس آدمی ہوں

کچھ گھاس ہوں، تو باقی
سب پھوس آدمی ہوں

نکلا ہُوا خود اپنا
کیا جُوس آدمی ہوں

دیتا نہیں گرہ سے
کنجوس آدمی ہوں

مُنہ چوم تھا، سو، اب میں
لب چوس آدمی ہوں

آبا تھے میرے بندر
موروث آدمی ہوں

ہوتا نہیں جو اُس کو
محسوس آدمی ہوں

کھوئی ہوئی خود اپنی
ناموس آدمی ہوں

امریکہ آدمی تھا
اب رُوس آدمی ہوں

☆

بے باک آدمی ہوں
چالاک آدمی ہوں

آؤں گا سب کو پورا
پوشاک آدمی ہوں

رہتا ہوں گندگی میں
اور ، پاک آدمی ہوں

ظالم نہیں ، ذرا سا
سفاک آدمی ہوں

معشوق تاڑنے میں
کیا طاق آدمی ہوں

اک ٹوٹتا بکھرتا
صد چاک آدمی ہوں

اُترا ہوں آسماں سے
کیا خاک آدمی ہوں

میں نے ہی ڈوبنا ہے
تیراک آدمی ہوں

ہو کر ، ظفرؔ ، زمیں زاد
افلاک آدمی ہوں

☆

بدحال آدمی ہوں
کنگال آدمی ہوں

اصرار کرنے والا
ہٹ پال آدمی ہوں

بچاؤ میں پڑا اک
بھونچال آدمی ہوں

کرتا ہوں اپنی تجدید
ہر سال آدمی ہوں

افعال سے زیادہ
اقوال آدمی ہوں

سر پہ بندھا ہوا سا
رومال آدمی ہوں

آتا ہوں کام سب کے
دلاّل آدمی ہوں

اور ، گھاس کی طرح سے
پامال آدمی ہوں

بہہ کر نکل چلا سا
سیّال آدمی ہوں

☆

بدنام آدمی ہوں
ناکام آدمی ہوں

میں خاص ہوتے ہوتے
اب عام آدمی ہوں

پوشیدہ ہیں معانی
ابہام آدمی ہوں

بنگال آدمی تھا
آسام آدمی ہوں

لیتا ہوں ساتھ اپنے
آرام آدمی ہوں

لگتا ہُوا کسی پہ
الزام آدمی ہوں

وقتِ غروب ہوں میں
اور، شام آدمی ہوں

آغاز ہونے والا
انجام آدمی ہوں

اب تو، ظفر، کسی کی
دُشنام آدمی ہوں

☆☆

بے آس آدمی ہوں
بکواس آدمی ہوں

لکھوں نہ کیوں زیادہ
پچاس آدمی ہوں

میں اپنے شہر ہی میں
بن باس آدمی ہوں

اپنے سے دُور ہو کر
اُس پاس آدمی ہوں

ہارا ہُوا کسی کا
میں تاس آدمی ہوں

بے حس تو ہوں، مگر، میں
حساس آدمی ہوں

اِک بھوک ہوں سراپا
اور، پیاس آدمی ہوں

مُجھ سے ڈرو! پلس کا
میں خاص آدمی ہوں

پھل پھول ہوں نہ اب میں
بُو باس آدمی ہوں

☆☆

مضروب آدمی ہُوں
معتُوب آدمی ہُوں

کُچھ دن سے اب تو مَیں بھی
مطلُوب آدمی ہُوں

بدتر ہُوں جانور سے
کیا خُوب آدمی ہُوں

گُمراہ شاعروں میں
محبوب آدمی ہُوں

بے شرم بھی ہُوں، لیکن
محجوب آدمی ہُوں

سڑکوں پہ پھرنے والا
جاروب آدمی ہُوں

لگتا ہے، اب کسی سے
منسُوب آدمی ہُوں

رہتا ہے رونا دھونا
مرطوب آدمی ہُوں

بے اختیار ہُوں، اور
مغلُوب آدمی ہُوں

-☆-

مفقُود آدمی ہُوں
بے سُود آدمی ہُوں

توتے کتر رہے ہیں
امرُود آدمی ہُوں

کیا ڈھونڈتے ہو مجھ کو
نابُود آدمی ہُوں

اپنی ہی اک طرح سے
بہبُود آدمی ہُوں

تنہا بھی ہر جگہ پہ
موجُود آدمی ہُوں

ایمان کی جو پُوچھو
مردُود آدمی ہُوں

پہنچوں کہاں کہاں مَیں
محدُود آدمی ہُوں

کب کھولتے ہیں، دیکھو
مسدُود آدمی ہُوں

مُجھ میں بھی ہے ملاوٹ
مَیں دُودھ آدمی ہُوں

-☆-

معذور آدمی ہوں
مجبور آدمی ہوں

کھٹے ہیں جو ابھی تک
انگور آدمی ہوں

اپنا بزرگ ہوں خود
لنگور آدمی ہوں

خالی ہُوا ہوں جب سے
بھرپور آدمی ہوں

کپڑا نہیں ہے تن پر
مستور آدمی ہوں

مرغوب کیوں نہیں وہ
مشہور آدمی ہوں

اور ، قہقہے لگاتا
رنجور آدمی ہوں

تھوڑا سا آدمیت
سے دُور آدمی ہوں

دُنیا ہے میرے پیچھے
مفرور آدمی ہوں

☆

معمول آدمی ہوں
مجہول آدمی ہوں

مصروف ہی سمجھ لو
مشغول آدمی ہوں

شاعر بڑا نہیں کیوں
مقبول آدمی ہوں

گم ہے جہاز میرا
مستول آدمی ہوں

اور ، جُرمِ عاشقی میں
معزول آدمی ہوں

پہنچا نہیں جو اب تک
موصول آدمی ہوں

نکتا نہیں ہوں ، لیکن
معقول آدمی ہوں

کب واگزار ہوں گا
مقفول آدمی ہوں

جو عقلمند بھی ہے
وہ فُول آدمی ہوں

☆

پچیس آدمی ہوں
یا تیس آدمی ہوں

بکتا ہوں ریڑھیوں پہ
کٹ پیس آدمی ہوں

غزلیں ہیں میرے گھوڑے
سائیس آدمی ہوں

سب سے بڑا فرشتہ
ابلیس آدمی ہوں

ویسے تو تھوڑا تھوڑا
بلقیس آدمی ہوں

لیکن زیادہ تر میں
ادریس آدمی ہوں

بچے سکولیے ہیں
میں فیس آدمی ہوں

جو بھی مجھے پہن لے
برجیس آدمی ہوں

اُٹھتی ہے جو کمر میں
وہ ٹیس آدمی ہوں

☆

گرداب آدمی ہوں
بے تاب آدمی ہوں

پیچیدہ اور پریشاں
اک خواب آدمی ہوں

مینڈک بہت ہیں مجھ میں
تالاب آدمی ہوں

ٹوٹے ہوئے خود اپنے
اعصاب آدمی ہوں

دشمن ہوں، اور، بظاہر
احباب آدمی ہوں

ڈوبے گا کون مجھ میں
پایاب آدمی ہوں

رُخ سندھ کی طرف ہے
پنجاب آدمی ہوں

جو دستیاب ہے، وہ
نایاب آدمی ہوں

مندر ہوں، اور، اُس میں
محراب آدمی ہوں

☆

خیرات آدمی ہوں
کم ذات آدمی ہوں

اک بوجھ ہوں بدن پر
اک بات آدمی ہوں

تنہا مجھے نہ سمجھو
بہتات آدمی ہوں

جس کی سحر نہیں ہے
وہ رات آدمی ہوں

میں پانچ آدمی تھا
اب سات آدمی ہوں

بگڑے ہوئے وطن کے
حالات آدمی ہوں

بد احتیاط سا اک
محتاط آدمی ہوں

اسقام کا ہوں پیکر
اخلاط آدمی ہوں

تفریط کے علاوہ
افراط آدمی ہوں

☆

بے یاد آدمی ہوں
برباد آدمی ہوں

پہلے تو ہوں فرشتہ
اور ، بعد آدمی ہوں

شاگرد ہوں بظاہر
اُستاد آدمی ہوں

شاعر تو ہوں ، مگر ، میں
بے داد آدمی ہوں

خود میں ہی ڈھونڈیے گا
ہمزاد آدمی ہوں

یا والدین ہوں ، یا
اولاد آدمی ہوں

گریہ نہ کیوں کروں میں
دل شاد آدمی ہوں

خاموش ہوں ، یہ کیسا
فریاد آدمی ہوں

گزری ہوئی ظفر کی
میعاد آدمی ہوں

☆

الفاظ آدمی ہوں
اعجاز آدمی ہوں

سب پر کھلا ہوا میں
اک راز آدمی ہوں

چڑیوں سے ڈرنے والا
شہباز آدمی ہوں

شامل ہوں آپ سب میں
اور ، بعض آدمی ہوں

پہچان لو اگر ، تو
ممتاز آدمی ہوں

پھیلا ہوا اک ایسا
ایجاز آدمی ہوں

کھلتے نہیں مرے پر
پرواز آدمی ہوں

کچھ ناز کے علاوہ
انداز آدمی ہوں

بس اور کچھ نہیں میں
آواز آدمی ہوں

☆

الجھاو آدمی ہوں
بکھراو آدمی ہوں

کھا جاؤں گا تمھیں کیا
آ جاؤ ! آدمی ہوں

اپنے ہی آپ سے کچھ
ٹکراو آدمی ہوں

چاروں طرف ذرا سا
پھیلاو آدمی ہوں

آپ آزما کے دیکھیں
برتاو آدمی ہوں

اک شوق ہوں سراپا
اک چاو آدمی ہوں

چلتا ہوا شب و روز
ٹھہراو آدمی ہوں

میں نرخ ہوں خود اپنا
اور ، بھاو آدمی ہوں

ہارا ہوا کسی کا
اک داو آدمی ہوں

☆

تنہائی آدمی ہُوں
گہرائی آدمی ہُوں

ہمدرد ہُوں تُمھارا
اور ، بھائی آدمی ہُوں

بچ کر بھی مُجھ سے رہنا
رُسوائی آدمی ہُوں

کرسکتا ہُوں مَیں کُچھ بھی
سودائی آدمی ہُوں

مَیں دُوسروں ہی جیسا
یکتائی آدمی ہُوں

مجبور ہُوں بہت ہی
ہرجائی آدمی ہُوں

ناتا ہے مچھلیوں سے
دریائی آدمی ہُوں

اور، اُس کے ساتھ ہی کُچھ
صحرائی آدمی ہُوں

نیچے کھڑا ہُوا مَیں
بالائی آدمی ہُوں

☆

گجراؤں آدمی ہُوں
ہر تھاؤں آدمی ہُوں

گُجرات سے زیادہ
گُرگاؤں آدمی ہُوں

خُود دُھوپ میں کھڑا مَیں
اک چھاؤں آدمی ہُوں

اَن دیکھی ، اَن سُنی سی
دُنیاؤں آدمی ہُوں

تُم سر سمجھ رہے ہو
مَیں پاؤں آدمی ہُوں

پہلے گنوار تھا مَیں
اب گاؤں آدمی ہُوں

بدنام ہُوں جہاں مَیں
کیا ناؤں آدمی ہُوں

چُوہیوں سے کھیلتی سی
اک میاؤں آدمی ہُوں

اتیائے کی طرح کا
اک نیاؤں آدمی ہُوں

☆

تنہائی آدمی ہوں
گہرائی آدمی ہوں

ہمدرد ہوں تمہارا
اور ، بھائی آدمی ہوں

بچ کر بھی مجھ سے رہنا
رُسوائی آدمی ہوں

کر سکتا ہوں میں کچھ بھی
سودائی آدمی ہوں

میں دُوسروں ہی جیسا
یکتائی آدمی ہوں

مجبور ہوں بہت ہی
ہرجائی آدمی ہوں

ناتا ہے مچھلیوں سے
دریائی آدمی ہوں

اور، اُس کے ساتھ ہی کچھ
صحرائی آدمی ہوں

نیچے کھڑا ہوا میں
بالائی آدمی ہوں

☆

کجراؤں آدمی ہوں
ہر تھاؤں آدمی ہوں

گجرات سے زیادہ
گُڑگاؤں آدمی ہوں

خود دُھوپ میں کھڑا میں
اک چھاؤں آدمی ہوں

ان دیکھی ، ان سُنی سی
دُنیاؤں آدمی ہوں

تُم سر سمجھ رہے ہو
میں پاؤں آدمی ہوں

پہلے گنوار تھا میں
اب گاؤں آدمی ہوں

بدنام ہوں جہاں میں
کیا ناؤں آدمی ہوں

چوہیوں سے کھیلتی سی
اک میاؤں آدمی ہوں

اتیائے کی طرح کا
اک نیاؤں آدمی ہوں

☆

اُدھیڑ آدمی ہوں
یا ڈیڑھ آدمی ہوں

کچھ بھی نہیں ہوں ، خالی
پھٹریڑ آدمی ہوں

ہے اُلّوؤں کا مسکن
جو پیڑ آدمی ہوں

سیدھا بھی ہوتے ہوتے
اک میڑھ آدمی ہوں

اپنی ہی کوئی جیسے
میں چھیڑ آدمی ہوں

پیچھے لگے ہیں نیچے
اور ، ریڑھ آدمی ہوں

کھلواڑ سے زیادہ
کھلویڑ آدمی ہوں

رُکتا نہیں ابھی میں
وہ ایڑ آدمی ہوں

بھوتی ہوئی ، ظفر ، میں
اک بھیڑ آدمی ہوں

☆

مدقوق آدمی ہوں
مخلوق آدمی ہوں

اپنے وطن کا فاتح
بندوق آدمی ہوں

مجھ پہ نگاہ رکھنا
مشکوک آدمی ہوں

ہرجائی تو ہوں ، لیکن
معشوق آدمی ہوں

تابوت کی طرح کا
صندوق آدمی ہوں

سب کو لگا ہوا میں
اک بھوک آدمی ہوں

امداد بوسہ دے جا
مفلوک آدمی ہوں

دیکھو مرا تماشا
گھر پھونک آدمی ہوں

میں تو ، ظفر ، کبھی کا
متروک آدمی ہوں

☆

ہشاش آدمی ہوں
بشاش آدمی ہوں

خوش باش رہنے والا
قلاش آدمی ہوں

اچھا ہوں اور ذرا سا
اوباش آدمی ہوں

ویسے کوئی دل میں
پرخاش آدمی ہوں

کام آ رہا ہوں میں
پوتاش آدمی ہوں

والد مرا ہے تازہ
عیاش آدمی ہوں

روتا ہوں صرف چھپ کر
خوش باش آدمی ہوں

مجھ کو بڑا نہ سمجھو
خشخاش آدمی ہوں

ساقی نے بھی کہا ہے
بدماش آدمی ہوں

-☆-

پُرجوش آدمی ہوں
مدہوش آدمی ہوں

میں آپ کے گھر کا
پاپوش آدمی ہوں

مارا ہے رحم کھا کر
زرووش آدمی ہوں

فردا نہ ہو سکا تھا
اب دوش آدمی ہوں

کھاتا تو ہوں زیادہ
کم کوش آدمی ہوں

کچھ پاس پاس رہنا
سرگوش آدمی ہوں

خوش ہوں اُسے پہن کر
خوش پوش آدمی ہوں

اہلِ ہنود میں کیا
سنتوش آدمی ہوں

رہتا ہے غل غپاڑا
بدنوش آدمی ہوں

-☆-

مس زوم آدمی ہوں
اک دھوم آدمی ہوں

زندہ تو ہوں ، ذرا سا
مرحوم آدمی ہوں

اور اپنے آپ سے ہی
محروم آدمی ہوں

خاران سے زیادہ
خرطوم آدمی ہوں

رہتا ہوں جیل ہی میں
معصوم آدمی ہوں

پڑھنا کبھی ، ہوا پہ
مرقوم آدمی ہوں

یہ سوچ کر ہی آنا
مُنہ چوم آدمی ہوں

بگڑا ہوا کسی کا
مفہوم آدمی ہوں

بے وزن تو ہوں ، لیکن
منظوم آدمی ہوں

-☆-

بے شرم آدمی ہوں
اور ، نرم آدمی ہوں

کچا مجھے نہ سمجھو
کنفرم آدمی ہوں

وقتی مجھے نہ جانو
کُل ٹرم آدمی ہوں

ہے جُرم میری فطرت
لاجرم آدمی ہوں

سب کتیاؤں کا میں
آشرم آدمی ہوں

تب رزم آدمی تھا
اب بزم آدمی ہوں

ڈوبے ہی ڈوبے اک دن
وہ فرم آدمی ہوں

ٹھنڈے ہیں پانو میرے
سرگرم آدمی ہوں

ماتھے پہ اس ٹکر کے
اک ورم آدمی ہوں

-☆-

نیرنگ آدمی ہوں
بے ڈھنگ آدمی ہوں

کھلنا نہیں ہے مجھ کو
دل تنگ آدمی ہوں

میں جیسے آدمی کا
پاسنگ آدمی ہوں

جو بج نہیں رہا ہے
مردنگ آدمی ہوں

آواز کے علاوہ
آہنگ آدمی ہوں

پرچم سفید اُٹھائے
میں جنگ آدمی ہوں

اوکاڑہ تھا کبھی میں
اب جھنگ آدمی ہوں

ہم شکل کے علاوہ
ہم رنگ آدمی ہوں

میں اپنے آئنے میں
خود زنگ آدمی ہوں

-☆-

تعظیم آدمی ہوں
تکریم آدمی ہوں

اپنے لکھے ہوئے کی
ترمیم آدمی ہوں

اک ٹھاٹ آدمی تھا
اک تھیم آدمی ہوں

تنہا ہی کھیلتا ہوں
اور ، ٹیم آدمی ہوں

برصغیر کی میں
تقسیم آدمی ہوں

ایک آج کل معطل
تنظیم آدمی ہوں

جوڑو کسی طرح سے
دونیم آدمی ہوں

سب کچھ ہے میرے اندر
تقویم آدمی ہوں

غائب ہے جسم ، لیکن
تجسیم آدمی ہوں

-☆-

ایک رنج و ملال بھی تھے ہم
تیرے خواب و خیال بھی تھے ہم

رنگِ پندار بھی تھا رُخ پہ ، مگر
اک مجسم سوال بھی تھے ہم

کچھ نہ تھے، اور، کچھ نہ ہوتے ہُوئے
تیرے شیشے میں بال بھی تھے ہم

یُوں تو کثرت بھی تھی یہاں اپنی
اور ، یہیں خال خال بھی تھے ہم

جیسے باسی کڑھی میں آتا ہے
ایسا ہی ایک اُبال بھی تھے ہم

لااُبالی بھی تھے طبیعت کے
اپنی کچھ دیکھ بھال بھی تھے ہم

نظر آتے تھے جس قدر آسان
اُس سے بڑھ کر محال بھی تھے ہم

لوگ کہتے تھے بے مثال ، مگر
ایک اپنی مثال بھی تھے ہم

خُود کمایا تھا یہ کمال ، ظفر
آپ اپنا زوال بھی تھے ہم

-☆-

کیسے کیسے اُداس بھی تھے ہم
جب ترے آس پاس بھی تھے ہم

تُو نے جب پایمال کرنا تھا
نرم اور سبز گھاس بھی تھے ہم

شوق بھی تھا کسی کے ملنے کا
اُس گھڑی بدحواس بھی تھے ہم

کچھ زمانہ ہمیں سمجھ نہ سکا
کچھ بعید از قیاس بھی تھے ہم

تن پہ تھا جامۂ غبار بھی
جب کبھی خُوش لباس بھی تھے ہم

جہاں جام و سبو لبالب تھے
وہیں خالی گلاس بھی تھے ہم

اپنے اندر تھے ایک دریا بھی
ابدی ایک پیاس بھی تھے ہم

روزِ اوّل سے یہ نہیں صُورت
اہلِ دُنیا کو راس بھی تھے ہم

ہم سے اچھے تھے عام لوگ ، ظفر
ورنہ ، کہنے کو خاص بھی تھے ہم

-☆-

خوش بھی تھے ، اور ملول بھی تھے ہم
سنگ تو تھے ہی ، پھول بھی تھے ہم

لوگ اپنائے بھی رہے ہم کو
ایک شوق فضول بھی تھے ہم

ذمہ دار اور بھی تھی یاد کوئی
کوئی اپنی ہی بھول بھی تھے ہم

اپنے سر پر سوار ہوتے ہوئے
اُس کے قدموں کی دُھول بھی تھے ہم

اُس نے کوشش ہی ٹھیک طرح نہ کی
ورنہ سہل الحصول بھی تھے ہم

مسترد بھی کیے رکھا ہم کو
اور ، اس کو قبول بھی تھے ہم

عرش سے فرش پر پٹخنے کی
ایک شانِ نزول بھی تھے ہم

کوئی رقبہ نکلتا تو سہی
عرض بھی ، اور ، طول بھی تھے ہم

جھکتے رہنے کے باوجود ظفر
ڈھیلی ڈھالی سی چُول بھی تھے ہم

☆

کوشش ناکام کیوں ہوئی ہے
خواہش الزام کیوں ہوئی ہے

تھے یوں تو حلال خور ، ہم پر
وہ شکل حرام کیوں ہوئی ہے

سورج تو ابھی کھڑا ہے ، دیکھو
پھر شہر میں شام کیوں ہوئی ہے

اچھا نہیں لگ رہا تھا کس کو
یہ روک ، یہ تھام کیوں ہوئی ہے

اتنی خاموش رہ کے وہ آنکھ
پھر محوِ کلام کیوں ہوئی ہے

کیسی گمنام تھی محبت
ایسی بدنام کیوں ہوئی ہے

جو خاص تھی ایک عادتِ بد
ہر سمت وہ عام کیوں ہوئی ہے

جینے سے پیشتر ہی آخر
یہ عمر تمام کیوں ہوئی ہے

تھی راہ سفر کی جو ، ظفر ، وہ
اب جائے قیام کیوں ہوئی ہے

☆

پیدا یہ غبار کیوں ہوا ہے
اور ، آخری بار کیوں ہوا ہے

میں کب سے کھڑا ہوں اِس کنارے
دریا مرے پار کیوں ہوا ہے

سب کچھ تبدیل ہوتے ہوتے
شبنم سے شرار کیوں ہوا ہے

دیکھا ہوا راستہ یہ میرا
دُشوار گزار کیوں ہوا ہے

گھیرے میں لیے ہوئے ہوں خود کو
ہر سُو یہ حصار کیوں ہوا ہے

جو پانو پکڑ رہا تھا پہلے
اب سر پہ سوار کیوں ہوا ہے

چھوڑا تھا جو کام دل نے اُس پر
پھر سے تیار کیوں ہوا ہے

پہلے تو نہیں تھا یہ طریقہ
مجمع یہ قطار کیوں ہوا ہے

آبا تو ، ظفر ، نہیں تھے ایسے
پھر شعر شعار کیوں ہوا ہے

☆

محبت کا موسم بدلنے کو ہے
ہوا اور ہی کوئی چلنے کو ہے

رہے گی نہ رنگت زمیں کی یہی
کہیں کوئی چشمہ اُبلنے کو ہے

ہوئیں کچی آبادیاں فکرمند
کناروں سے پانی اُچھلنے کو ہے

بہت دُور پودا اُگ آیا تھا جو
یہاں پھولنے اور پھلنے کو ہے

بُجھا تھا کبھی جو چراغ ہوس
دوبارہ کسی طرح جلنے کو ہے

اندھیرے میں کیوں ہو رہی کمی
بہت دیر سے شام ڈھلنے کو ہے

جو باہر تھا ، اندر نہیں جا سکا
جو اندر نہیں تھا ، نکلنے کو ہے

کسی اور کو راہ دیتی ہوئی
مصیبت مرے سر سے ٹلنے کو ہے

مدارت بھی ہو چکی ہے ، ظفر
سو پھر سے مُسافر بھی چلنے کو ہے

☆

ہوا میں کوئی رنگ بھرنے کو ہے
کہیں ایک صورت اُبھرنے کو ہے

نظر آئیں گے پیڑ پودے تمام
کوئی دم میں پانی اُترنے کو ہے

ہے تبدیل ہونے کو رنگِ زمیں
کوئی اس جگہ پانو دھرنے کو ہے

کُھلی رکھیں آنکھیں ابھی اہلِ شہر
ابھی اک تماشا گذرنے کو ہے

بہت دیر کے بعد قسمت مری
بگڑنے کو ہے یا سنورنے کو ہے

ہوں پیچھے کسی کے جو مَیں بھی پڑا
مرا بھی کوئی کام کرنے کو ہے

مُسافر سے یہ لوگ ہیں بے خبر
کہ چلنے کو ہے یا ٹھہرنے کو ہے

دھماکا کوئی ہونے والا ہے کیا
کسی بات سے خلق ڈرنے کو ہے

اسی حال میں گُم رہے گا ظفر
کہ جینے کو ہے اور نہ مرنے کو ہے

☆

نیا اک زمانہ جو آنے کو ہے
خبر اُس کی سارے زمانے کو ہے

چھپے گا کہاں تک ابھی اور تُو
یہ دُنیا ترا کھوج پانے کو ہے

نہیں شائبہ وصل کا دُور تک
مگر، کوئی بستر بچھانے کو ہے

وہ پتھر کہ جو، پھول ہو، کچھ بھی ہو
خبر اُس کی آئینہ خانے کو ہے

کسی وضع کا پاس شاید کوئی
نئے کو نہ ہو تو پُرانے کو ہے

خبردار رہنا کہ پھر سے یہ وقت
کسی چیز میں کچھ ملانے کو ہے

مَیں کرتا نہیں آب و دانے کی فکر
مری فکر خود آب و دانے کو ہے

مرا وقت ہے راستے میں پڑا
کہ آنے کو ہے اور نہ جانے کو ہے

ظفر نے جھٹک کر گرایا تھا جو
وہی بوجھ سر پر اُٹھانے کو ہے

☆

ابھی ہوتے ہوتے جو ہنسنے کو ہے
تو خود ہی سمجھ لو کہ پھنسنے کو ہے

یہ دل ایک خوشبو سے بھر جائے گا
کلی کوئی اندر بکسنے کو ہے

ہوائیں لگاتی رہیں اپنا زور
یہ بادل یہاں پر برسنے کو ہے

پرانی عمارات گرنے کے بعد
نیا شہر بھی کوئی بسنے کو ہے

نکلنے کو ہے آسمانوں سے کچھ
زمیں میں کوئی چیز دھنسنے کو ہے

تبسم ہوا ہے نمودار ابھی
ابھی مجھ پہ فقرہ سا کسنے کو ہے

ابھی چومنے کو نہیں ہے وہ حسن
ابھی دیکھنے اور ترسنے کو ہے

بالآخر مری آستیں کا یہ سانپ
مجھے ہی کسی روز ڈسنے کو ہے

اُسے توڑنا چاہتے ہو، ظفر
جو انجیر ابھی اور رسنے کو ہے

☆

وہم زر و مال کیوں ہوا ہے
تم کو یہ خیال کیوں ہوا ہے

حملہ آور ہوا جو مجھ پر
اب وہ مری ڈھال کیوں ہوا ہے

میری ہی طرح کا ہونے والا
خود اپنی مثال کیوں ہوا ہے

اور، اتنے زوال کے دنوں میں
ظاہر یہ کمال کیوں ہوا ہے

اتنے بڑے سانحے کا مجھ کو
تھوڑا سا ملال کیوں ہوا ہے

چھوٹی سی بات پر گلی میں
یہ جنگ و جدال کیوں ہوا ہے

مرنا کیوں ہو گیا مصیبت
جینا جنجال کیوں ہوا ہے

اوروں کی ہے یہ بھی کوئی سازش
اپنا یہ حال کیوں ہوا ہے

مشکل ہے ظفر، جواب جس کا
پیدا وہ سوال کیوں ہوا ہے

☆

یہ عام سا، خاص کیوں ہُوا تھا
دل اپنا اُداس کیوں ہُوا تھا

مُشکل آئی تھی کِس وجہ سے
جو دُور تھا، پاس کیوں ہُوا تھا

مِلنا ہی تو اُس سے تھا، مگر میں
محرومِ حواس کیوں ہُوا تھا

میں تھا سب کو ہنسانے والا
رونا مجھے راس کیوں ہُوا تھا

چلنے سے تھی میری زندگانی
رُکنا مجھے راس کیوں ہُوا تھا

پُورا ہی نہ تھا کِسی طرف سے
سو، میرا لباس کیوں ہُوا تھا

بوئی تھی میں نے تو سیاہی
یہ کھیت کپاس کیوں ہُوا تھا

اُس نے جو نکلنا ہی نہ تھا، تو
اِس دل کی بھڑاس کیوں ہُوا تھا

ہونا جو نہ تھا ظفرؔ نے آدھا
پھر سو سے پچاس کیوں ہُوا تھا

☆

یہ زمیں کون تھی، آسماں کون تھا
کوئی بتلائے، اپنا یہاں کون تھا

میں نے ہمراز سب کو بنایا، مگر
شہر بھر میں مرا رازداں کون تھا

گفتگو سب سے تھی، یہ تو معلوم ہو
ہم نفس کون تھا، ہم زباں کون تھا

عُمر بھر جس میں ہم آتے جاتے رہے
وُہ درخت اور وُہ آشیاں کون تھا

طے کِیا جس سے پانی کا سارا سفر
ناؤ تھی کون سی، بادباں کون تھا

سب سے خُوش تھے، کوئی فرق رکھا نہیں
مہرباں کون، نامہرباں کون تھا

ہم جہاں جایا کرتے تھے شام و سحر
کُچھ نہیں جانتے تھے وہاں کون تھا

سُن رہے تھے بھی شوق سے، اور، پھر
پُوچھتے تھے پسِ داستاں کون تھا

کرتے رہتے تھے نقلِ مکاں بھی ظفرؔ
یہ کہیں کیا تھے اور وہ مکاں کون تھا

☆

دیکھتے تھے جدھر کو، اُدھر کون تھا
کوئی تھا بھی تو بارِ دگر کون تھا

شام تک تو فقط میں ہی تھا ہر طرف
اُس کے بعد اس قدر رات بھر کون تھا

کاش اب تو یہ عقدہ کوئی کھول دے
سامنے کون ہے، بام پر کون تھا

حیثیت مرکزی بھی تھی اُس کی یہاں
گھر میں اپنے، مگر، دربدر کون تھا

بند آنکھوں سے ہم اک طرف ہو گئے
کچھ بھی دیکھا نہیں تھا کدھر کون تھا

اُس کے ٹکڑے تو تھے اپنی پہچان میں
یہ نہیں جانتے سربسر کون تھا

جس میں شعلہ نہ تھا آگ تھی کون سی
جس کا سایہ نہیں تھا، شجر کون تھا

جس نے پانی پروں پر نہ آنے دیا
طائرِ آب تھا وہ، مگر، کون تھا

راستہ تھا الگ جس کا ہم سے ظفر
جانتے ہیں کہ وہ ہمسفر کون تھا

☆

میرے اندر وہ میرے سوا کون تھا
میں تو تھا ہی، مگر، دوسرا کون تھا

لوگ بھی کچھ تعارف کراتے رہے
مجھ کو پہلے ہی معلوم تھا، کون تھا

لوگ اندازے ہی سب لگاتے رہے
وہ جبیں کس کی تھی، نقشِ پا کون تھا

مجھ سے مل کر ہی اندازہ ہو گا کوئی
وہ الگ کون تھا، وہ جدا کون تھا

کوئی جس پر نہ تھا موسموں کا اثر
بعد ساون کے بھی وہ ہرا کون تھا

جس کو احوال سارا تھا معلوم، وہ
بے خبر، راستے میں پڑا کون تھا

منتظر جس کی دنیا رہی دیر تک
دور سے کوئی آتا ہوا کون تھا

آئی جس کی مہک اُس سے پہلے کہیں
وہ سوار کمند ہوا کون تھا

ریزہ ریزہ ہی پہچان میں تھا ظفر
جانتے تھے سبھی جابجا کون تھا

☆

گم ہُوا دیکھتے دیکھتے کون تھا
ڈھونڈ کر ہم جسے لائے تھے، کون تھا

کوئی منزل نہیں تھی کہیں سامنے
پھر بھی وُہ راستے راستے کون تھا

جو عقب میں رہا، جانتے تھے اُسے
یہ نہیں کھل سکا، سامنے کون تھا

بام پر جو بھی تھا، مل رہے گا سُراغ
لیکن اُس رات چھت کے تلے کون تھا

تھا اگر کوئی، اُس کی نہیں فکر ہی
وہ نہیں تھا کہیں، اس لیے کون تھا

پہلے آتا نہیں تھا گماں ہی میں وُہ
پھر جو واپس ہُوا خواب سے، کون تھا

اس جہاں سے پرے تھا کوئی، ٹھیک ہے
لیکن اس سے بھی آگے، مرے کون تھا

جس کا ہونا ہی مشکوک ہے آج تک
اُس کے بارے کوئی کیا کہے، کون تھا

اور اس کے سوا پوچھتے کیا، ظفر
یعنی وہ کون تھا، اور، یہ کون تھا

☆

پیغام اُس کا ٹھکرانا ہے یا نہیں
کیا معلوم وہاں جانا ہے یا نہیں

یہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں، اب کی بار
اُس کے سامنے گھبرانا ہے یا نہیں

طور اطوار سے ہی اُس کے کھل جائے گا
بات ہماری وہ مانا ہے یا نہیں

سردی بڑھتی جاتی ہے، کیا حکم ہے اب
محفل کو کچھ گرمانا ہے یا نہیں

پہلے ہی یہ فیصلہ ہونا چاہیے تھا
کام وہ کر کے پچھتانا ہے یا نہیں

ایک بار ہی بیٹھ کے اب یہ طے کر لیں
مل کر رونا اور گانا ہے یا نہیں

ابھی نہیں کہہ سکتے، دیکھ رہے ہیں سب
شہر پہ یہ بادل چھانا ہے یا نہیں

صبح، نکلتے وقت کوئی نہیں جانتا
شام کو واپس گھر آنا ہے یا نہیں

ایک خواب ہے، دیکھیں گے اس میں بھی ظفر
ساتھ اُس کو بھی اُلجھانا ہے یا نہیں

☆

سوچ بھی ہو کب لال
ہو رہا ہے سب لال

جی رہے تھے تب بھی
کچھ نہیں تھا جب لال

نیلگوں تھیں آنکھیں
اور، اُس کے لب لال

اُس نے کر دیے کیا
اپنے روزوشب لال

ہو رہے گا وہ بھی
جو نہیں ہے اب لال

تپے گا بدن جب
ہو سکے گا تب لال

بھسم کر گئی ہے
جب ہوئی طلب لال

سبز شہر میں بھی
کھل گیا ہے سب لال

اب نہائیے بھی
بھر چکا ہے سب لال

☆

ہو رہی زمیں لال
کہیں کم، کہیں لال

لال تھیں فضائیں
لیکن اب نہیں لال

زرد ہے سراسر
تھا جو قبل ازیں لال

گیا ہے جہاں سے
آئے گا وہیں لال

آستاں سے لگ کر
ہو گئی جبیں لال

خواہشیں ہیں جیسی
اس طرح نہ تھیں لال

رنگ تھا کوئی اور
ہُوا جاگزیں لال

تھا مکان سب زرد
اور، تھے مکیں لال

چاہیے ظفر، اب
کوئی سا حسیں لال

☆

تری سمت جاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں
کبھی واپس آتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

ہُوا ہے کبھی اکثراوقات خُود بھی
میں اُس کو تھکاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

تھکا ہُوں میں کارِ محبت میں کیسے
میں سب کو بتاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

کوئی تازہ تعمیر مجھ سے نہ ہو گی
کہ ملبا اُٹھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

سفر کے نہیں میں رہا اب جو قابل
تو رستہ بچھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

کبھی کوئی مجلس، کبھی کوئی جلسہ
سو، دریاں بچھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

مجھے اب تو بننا ہے خُود ہی تماشا
تماشا دکھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

ذرا دیر رونے کی مُہلت عطا ہو
بہت دیر گاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

خُوشامد میں پہنچا ہُوں اس حال کو میں
ظفر، مُسکراتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

-☆-

بگڑتے سنورتے ہُوئے تھک گیا ہُوں
غلط کام کرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

سفر پر روانہ ہُوں، اور، راستے میں
اٹکتے ٹھہرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

مجھے ڈوبنے دو کہ ان پانیوں میں
میں ناحق اُبھرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

مجھے کام اچھے بھی کرنا ہیں کوئی
کہ تاوان بھرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

چڑھائی تو مشکل نہیں تھی کچھ اتنی
مگر، میں اُترتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

کہیں سبزہ گاہ اور بھی کوئی ہو گی
یہاں چگتے چرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

نکالوں کوئی اپنے اندر سے سُورج
جو شب بھر ٹھٹھرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

مجھے لے چلو زندگی ہی میں واپس
کہ میں روز مرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

ظفر، شاید اب کے پلٹ جائے بازی
میں ہر بار ہرتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

-☆-

نہیں یہ کہ چلتے ہوئے تھک گیا ہوں
میں رستے بدلتے ہوئے تھک گیا ہوں

کُھلے میں کہیں مجھ کو پھیلاؤ جا کر
کہ خود میں اُبلتے ہوئے تھک گیا ہوں

سُرنگ اب یہی ہو گی میرا ٹھکانا
میں باہر نکلتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے برف ہونے سے روکے نہ کوئی
جو آتش اُگلتے ہوئے تھک گیا ہوں

پشیماں نہیں ہوں کسی بات پر میں
بہت ہاتھ ملتے ہوئے تھک گیا ہوں

ہے وقفہ یہ آرام کا بھی ضروری
کہ گرتے سنبھلتے ہوئے تھک گیا ہوں

کھلونے مرے کام کے اب نہیں ہیں
میں ان سے بہلتے ہوئے تھک گیا ہوں

کوئی اور بھی باغ ہو گا یہاں پر
میں اس میں ٹہلتے ہوئے تھک گیا ہوں

ظفر، چاند اُونچا بہت ہے سخن کا
میں ناحق اُچھلتے ہوئے تھک گیا ہوں

-☆-

سمجھ لو کہ سوتے ہوئے تھک گیا ہوں
میں دراصل ہوتے ہوئے تھک گیا ہوں

نہیں ہے ابھی وقت ہنسنے کا میرا
ابھی تو میں روتے ہوئے تھک گیا ہوں

یہ سوچا تھا مکھن نکلنا ہے اس سے
کہ پانی بلوتے ہوئے تھک گیا ہوں

کوئی فصل اُگتی نہیں ہے یہاں پر
بہت بیج بوتے ہوئے تھک گیا ہوں

نہانا تو قسمت میں شاید نہیں ہے
جو کپڑے ہی دھوتے ہوئے تھک گیا ہوں

گرایا تھا جو راستے میں کسی دن
وہی بوجھ ڈھوتے ہوئے تھک گیا ہوں

وہی سامنے ڈھیر ہے کنکروں کا
یہ موتی پروتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے ڈھونڈنے کے لیے کوئی نکلے
کہ میں خود کو کھوتے ہوئے تھک گیا ہوں

ظفر، کوئی صورت نکالوں گا اب تو
کہ مٹی ہی گوتے ہوئے تھک گیا ہوں

-☆-

گھر میں داخل نہیں لگ رہا
اور شامل نہیں لگ رہا

قائل اُس کو کیا ہے ، مگر
خاص قائل نہیں لگ رہا

کوئی پردہ بھی ہے درمیاں
اور ، حائل نہیں لگ رہا

بات کیا ہے کہ محفل میں وہ
جانِ محفل نہیں لگ رہا

وہ بھی کم حوصلہ ہے بہت
میں ہی بزدل نہیں لگ رہا

فائدہ عشق میں آج تک
مجھ کو حاصل نہیں لگ رہا

دل نے پھیلا بھی رکھا ہے ہاتھ
پھر بھی سائل نہیں لگ رہا

جس پہ ڈوبی تھی قسمت کی ناؤ
یہ وہ ساحل نہیں لگ رہا

قابل اتنا ہے ، لیکن ظفر
تیرے قابل نہیں لگ رہا

☆

فن بھی اب فن نہیں لگ رہا
اور ، یقیناً نہیں لگ رہا

گھر سے باہر نہیں آسماں
گھر میں آنگن نہیں لگ رہا

پیڑ موجود ہیں چارسُو
پھر بھی یہ بن نہیں لگ رہا

ہے یہ گاڑی کھڑی دیر سے
اس کو انجن نہیں لگ رہا

لنچ تیار اگر ہے تو کیوں
کوئی برتن نہیں لگ رہا

ٹھیک ہے برگ و گُل پر ابھی
رنگ گلشن نہیں لگ رہا

ہاضمہ ہے خراب اس قدر
کوئی چورن نہیں لگ رہا

ہے تو بدظن ابھی تک ، مگر
اتنا بدظن نہیں لگ رہا

سیٹھ میں بھی نہیں ہوں ، ظفر
وہ بھی میمن نہیں لگ رہا

☆

کام اعلیٰ نہیں لگ رہا
کچھ نرالا نہیں لگ رہا

جمع پونجی بہت ہے، مگر
مجھ سے تالا نہیں لگ رہا

اندر اندر تو لگتا ہے سب
بالا بالا نہیں لگ رہا

مکڑیاں بھی بہت ہیں، مگر
گھر میں جالا نہیں لگ رہا

سب تلافی تو ہو بھی چکی
کیوں ازالہ نہیں لگ رہا

حق تعالیٰ بھی کچھ روز سے
حق تعالیٰ نہیں لگ رہا

سربسر ہے وہی تو، مگر
پہلے والا نہیں لگ رہا

ہم نے سمجھا جسے اس قدر
تر نوالہ نہیں لگ رہا

چاند بے شک وہی ہے، ظفر
یہ وہ ہالہ نہیں لگ رہا

—٭—

یہ جو بندر نہیں لگ رہا
کیا مچھندر نہیں لگ رہا

یہ جو باہر ہے میلا کوئی
میرے اندر نہیں لگ رہا

رام چندر ہے اصلی، مگر
رام چندر نہیں لگ رہا

اس کو میک اپ ذرا کرنے دو
جو چقندر نہیں لگ رہا

کوئی مسجد نہیں لگ رہی
کوئی مندر نہیں لگ رہا

جل رہا ہے اسی آگ میں
اور سمندر نہیں لگ رہا

فتح کرتا گیا ہند سندھ
جو سکندر نہیں لگ رہا

اچھا خاصا جگندر ہے جو
کچھ جگندر نہیں لگ رہا

ہے قلندر تو پوچھو ظفر
کیوں قلندر نہیں لگ رہا

—٭—

وہ جو اپنا جہاں تھا
وہم تھا کوئی گماں تھا

نیلی ہو گئی تھی زمیں
نیلا ہی آسماں تھا

نیچے نیچے دُھند سی
اُوپر اُوپر دُھواں تھا

نئے محلے میں کہیں
ایک پُرانا مکاں تھا

جو ہونا تھا آخرش
پہلے ہی سے عیاں تھا

برفیلی تہہ کے تلے
پانی سا اک رواں تھا

منع کیا تھا جہاں سے
میں پھر شاید وہاں تھا

جس سے ہوئے تھے منحرف
وہی تو اپنا بیاں تھا

کہاں کھو گیا ہے ظفر
ابھی ابھی تو یہاں تھا

☆

شب بھر یا دن بھر ہونے دے
کچھ کام برابر ہونے دے

کاٹی ہے قید بہت اب تک
اندر سے باہر ہونے دے

موقع دے اور بھی لوگوں کو
نیچے سے اُوپر ہونے دے

یونہی ڈھارس نہ بندھایا کر
حالات کو بہتر ہونے دے

یہ دخل اندازی ٹھیک نہیں
ہوتا ہے جو ابتر، ہونے دے

بن جائے گی تصویر نئی
منظر بے منظر ہونے دے

اس طرح گزارہ کب ہو گا
حالات کا خوگر ہونے دے

مہنگائی ماروں کو کچھ دن
ہر چیز میسر ہونے دے

جو کچھ بھی بچا کچھا ہے ظفر
میرا ہی مقدر ہونے دے

☆

سارے کا سارا ہونے دے
کچھ کام دوبارہ ہونے دے

اس رات اندھیری کی خاطر
یہ سوچ ستارہ ہونے دے

اچھے دن بھی آئیں گے کبھی
جیسا ہے گزارہ ہونے دے

یہ کاروبار ہی ایسا ہے
ہوتا ہے خسارہ، ہونے دے

کچھ انتظار میں کرتا ہوں
کچھ تو بھی اشارہ ہونے دے

جو کام غلط ہی تھا اتنا
اس کا کفارہ ہونے دے

اچھا بھی لگے گا کبھی تجھے
فی الحال گوارا ہونے دے

تو بیچ میں مت آ جانِ ظفر
یہ کام ہمارا ہونے دے

یہ رکنے والا نہیں، ظفر
فن کو فوارہ ہونے دے

☆

کم ہو کہ زیادہ، ہونے دے
ہوتا ہے جتنا ہونے دے

ایسے مت مار محبت کو
پہلے اسے پیدا ہونے دے

پابندی بھی لگوا لینا
کچھ دیر تماشا ہونے دے

چارہ ہی نہیں ہے اس کے سوا
یہ خون خرابہ ہونے دے

کچھ فرق تو پڑے گا ہی آخر
سونے پہ سہاگا ہونے دے

پہلے بھی بے شک ہوا سہی
وہ کام دوبارہ ہونے دے

جیسا تیسا ہونے کے لیے
کچھ ایسا ویسا ہونے دے

کافی بھی ہوتا جائے گا
پہلے اگر اتنا ہونے دے

خودکش بمبار ہی سہی ظفر
تھوڑا سا دھماکا ہونے دے

☆

اب تو یکجائی ہونے دے
ہونے دے، بھائی! ہونے دے

عزت بھی بہت کمائی ہے
اب کچھ رسوائی ہونے دے

اس جھوٹ کی تہ میں بھی ہے کچھ
ظاہر سچائی ہونے دے

کچھ آبادی میں اضافہ ہو
دو سے اب ڈھائی ہونے دے

آنا جانا ہی رہے ذرا
اتنی تو صفائی ہونے دے

کچھ آج تو زیریں حصے کو
تھوڑا بالائی ہونے دے

اب کوئی حلال حرام نہیں
جیسی ہے کمائی ہونے دے

آسانی سے مت شعر بنا
کچھ مغز کھپائی ہونے دے

گھٹنے ٹکوا اپنے بھی، ظفر
اس کی بھی پٹائی ہونے دے

☆

وہ تحریر سے یا زبانی کھلا
سو کر کے بہت مہربانی کھلا

ہنسا تو سہی وہ بت بدگماں
کوئی رنگ تو زعفرانی کھلا

وہاں اب تو رہنا ہے جا کر جہاں
ہوا صاف ہو اور پانی کھلا

ہوئیں بند راہیں سبھی جس گھڑی
تو اک راستہ رائیگانی کھلا

خریدیں گے کچھ بیچ کر ہی یہاں
کہ بازار شہر گرانی کھلا

ملا خواب ہستی کی گتھی کا حل
نہ ہی راز دنیائے فانی کھلا

سفر کے لیے پھر سے درپیش ہے
سمندر وہی بادبانی، کھلا

اسی طرح رکھنا ہے راز سخن
وہی لفظ تنگ اور معنی کھلا

ہے دوزخ نہ جنت ظفر کے لیے
پھرے گا کہاں آنجہانی کھلا

☆

وہی ہے تماشے کا مضمون بند
مداری کُھلا اور بابون بند

مراعات آدھی ہی اب رہ گئیں
ہے نسوار جاری تو افیون بند

خرچنے سے جو ختم ہوتا نہیں
خزانہ ہے وہ حُسنِ قارون بند

بُخارات ہیں اس قدر پیٹ میں
کہ مشکل سے ہوتی ہے پتلون بند

جو بھیجی تھی فتحِ مُبیں کے لیے
نظر آئی پھر وہ پلاٹون بند

جو ہے دائم آباد زندانِ دل
ہمیشہ رہی کوئی خاتون بند

نہیں جانتا کوئی اُس میں ہے کیا
کہ آیا ہے ڈبا یہ رنگون بند

مرض بڑھتا جاتا تھا حد سے سوا
سو، کی ہے محبت کی معجون بند

ہیں کھلیان غلّے سے عاری، ظفر
تو بھیڑوں پہ اُگنا ہُوئی اُون بند

☆

پڑھ غزل
اور چل

بے نوا
بے عمل

بات سُن
ساتھ چل

ہو کہاں
آج کل

بج چکا
ہے بگل

رُک تو جا
ایک پل

موت ہی
تھی اٹل

ہو گئے
پانو شل

تھا ظفر
بے بدل

☆

پیچ و خم
زیر و بم

ہیں کدھر
آپ ہم

ہنس پڑی
شامِ غم

مَیں بھی ہوں
بیش و کم

رنگ و بُو
کیف و کم

کُھل چکا
ہے بھرم

دل ہی تھا
جامِ جم

بڑھ نہیں
رہے قدم

تھا ظفرؔ
خود صنم

☆

بات کر
مختصر

آئے گا
راہ پر

ہو چکے
در بہ در

بات ہے
بے اثر

جا رہے
ہو کدھر

مُولیاں
یا مٹر

شاخ بھی
ہے شجر

دم بہ دم
سر بہ سر

کون ہو
اے ظفرؔ

☆

گفت گو
کو بہ کو

ہیں کہیں
مَیں نہ تُو

اک دُھواں
چار سُو

رہ گئی
آبرُو

ہے وہی
ہُو بہ ہُو

اُڑ گئے
رنگ و بُو

تھی کوئی
جستجو

عید ہے
یا عدو

تھا ظفر
بے وضو

☆

تم جہاں
ہم وہاں

نارووال
پھُونیاں

بارشیں
الاماں

ختم ہے
داستاں

قبل ازیں
بعدازاں

کر رہا
ہُوں نہ ہاں

لاشریک
لامکاں

بات سُن
او میاں

ہے ظفر
بے زباں

☆

جو کیا ہے اس انتظام کو دیکھ
نام کو چھوڑ ، میرے کام کو دیکھ

یہ اندھیرا بھی ہے ، اُجالا بھی
رات پر خاک ڈال ، شام کو دیکھ

کتنا بے رنگ ہے یہ آبِ حلال
اک نظر بادۂ حرام کو دیکھ

اور تو کچھ نہیں مجھے دعویٰ
روز کی اس دُعا سلام کو دیکھ

پختہ کاری مری بجا ، لیکن
آج اِن خواہشاتِ خام کو دیکھ

سربسر یہ بھی جامِ شیریں ہے
پیڑ لگنے سے پہلے آم کو دیکھ

پھنس بھی سکتا ہوں میں کبھی ، لیکن
ڈھیلے ڈھالے سے اپنے دام کو دیکھ

خاص باتیں سنا چکا ہوں بہت
آج میری صلائے عام کو دیکھ

کس میں کیا کیا ملا رکھا ہے ظفر
اک ذرا اپنے انضمام کو دیکھ

☆

تھک گیا ہوں ، چلا نہیں جاتا
راہ سے بھی ہٹا نہیں جاتا

شہر تو ہے وہ لیکن اُس کی طرف
اب کوئی راستہ نہیں جاتا

آسماں تک ہے خواہشِ پرواز
اور ، زمیں سے اُٹھا نہیں جاتا

حق تو وہ ہے جو چھین لو بڑھ کر
ہاتھ سے یہ دیا نہیں جاتا

دُوسرے کس لیے ہیں ، جانِ عزیز
کام خُود تو کیا نہیں جاتا

بسترِ ناز تک تو پہنچا ہوں
اس سے آگے بڑھا نہیں جاتا

پھر رہا ہے جو اردگرد ابھی
ابر کیوں سر پہ چھا نہیں جاتا

توڑتا جا رہا ہوں سب چیزیں
ایک بھی جوڑتا نہیں جاتا

یہ تماشا رُکا رہے گا ، ظفر
یعنی جب تک وہ آ نہیں جاتا

☆

دل سے اس کا دھواں نہیں جاتا
مُفت کا میہماں نہیں جاتا

جانتا ہُوں یہاں نہ آئے گا
تُو وگرنہ کہاں نہیں جاتا

اُس سے کہتا ہُوں جا رہا ہُوں ابھی
اور، پھر بعدازاں نہیں جاتا

جس میں رہنے کو ہم ترستے رہے
یاد سے وہ مکاں نہیں جاتا

وہ نہیں ہے، یقین ہے، لیکن
دل سے اُس کا گُماں نہیں جاتا

وہیں ڈھونڈو مجھے کہیں نہ کہیں
آج کل میں جہاں نہیں جاتا

زخم ہوتا ہے مندمل آخر
لیکن اُس کا نشاں نہیں جاتا

پانو سے تو نکل رہی ہے زمیں
سر سے یہ آسماں نہیں جاتا

ظفر، اہلِ زباں بُلاتے ہیں
اور، یہ بے زباں نہیں جاتا

☆

اس قدر بے خبر نہیں جاتا
جانے والا جدھر نہیں جاتا

چھانو بھی ہو تو یہ مسافرِ دل
راستے میں ٹھہر نہیں جاتا

راستہ ڈھونڈتا ہے دائیں بائیں
درمیاں سے گذر نہیں جاتا

لاکھ وہ مہرباں بھی ہو، لیکن
میرے اندر کا ڈر نہیں جاتا

بات آئی گئی بھی ہو جائے
لیکن اُس کا اثر نہیں جاتا

جائے گا یکدم، اعتبار، کہ یہ
مختصر مختصر نہیں جاتا

لاپتا ہی رہوں گا جب تک میں
اپنے اندر بکھر نہیں جاتا

لوگ کترا رہے تھے پہلے ہی
اب تو میں بھی اُدھر نہیں جاتا

کوئی آخر مذاق میں تو، ظفر
اس قدر کام کر نہیں جاتا

☆

جیسے تیسے رہ جاتا ہے
سب کچھ ایسے رہ جاتا ہے

لاش اُبھر آتی ہے اُوپر
پانی نیچے رہ جاتا ہے

مَیں ہی نکل جاتا ہُوں آگے
قاری پیچھے رہ جاتا ہے

کام جو وقت پہ کیا نہ جائے
رہتے رہتے رہ جاتا ہے

رہنے پر آ جائے تو وہ
کسی بہانے رہ جاتا ہے

سوچ سمجھے وہ نہ رہے تو
بھولے بھٹکے رہ جاتا ہے

جاتے جاتے بھی وہ دُھواں سا
اندرخانے رہ جاتا ہے

تیز بہت چلنے والا بھی
آدھے رستے رہ جاتا ہے

بات وہ کیا ہے جسے، ظفر، تُو
کہتے کہتے رہ جاتا ہے

☆

جان لو، اُن کے کیا ارادے ہیں
یہ بظاہر جو سیدھے سادھے ہیں

دے بھی سکتے ہیں آپ کو شہ مات
یہ جو بےحیثیت پیادے ہیں

بھوکی ننگی ہے قوم، اور، ان کے
کیا تن و توش، کیا لبادے ہیں

کتنے ہمدرد ہیں غریبوں کے
یہ جو دس بیس خانوادے ہیں

کھا رہے ہیں حرام کی روزی
اور، سارے حلال زادے ہیں

کچھ سُکڑتی بھی جا رہی ہے زمیں
اور، کچھ لوگ بھی زیادے ہیں

یہ جو مُشکل کُشا ہمارے تھے
بوجھ اپنا بھی ہم پہ لادے ہیں

تن پہ خوابوں کے چیتھڑے ہیں، مگر
وہ بھی پُورے نہیں ہیں، آدھے ہیں

ہو رہی ہے، ظفر، گذر جن پر
کُچھ اُمیدیں ہیں، چند وعدے ہیں

☆

وہم سا اعتبار میں دیکھا
کیا ہے جو آر پار میں دیکھا

نظر آتا وہ کیا کہ میں نے اُسے
جب بھی دیکھا غُبار میں دیکھا

وہ مُلاقات میں بھی تھا نہ کہیں
جو مزہ انتظار میں دیکھا

سبھی شکلیں تھیں ایک ہی جیسی
ہم نے اُس کو ہزار میں دیکھا

اس سے پہلے کہیں نہ تھا موجُود
رنگ جو رنگ وار میں دیکھا

خامشی آبشار سے نکلی
شور سا کوہسار میں دیکھا

جو دکھائی دیا شُروع میں ہی
وہی پایانِ کار میں دیکھا

تھا خزاں میں بھی زور شور وہی
جو کرشمہ بہار میں دیکھا

کسی گنتی ہی میں نہ تھا جو، ظفرؔ
وہ شُمار و قطار میں دیکھا

-☆-

ترے آسماں کی زمیں ہو گیا ہوں
ہُوا ہوں تو اپنے تئیں ہو گیا ہوں

ملی ہے جگہ دل میں تھوڑی سی اس کے
سمجھ لو کہ گوشہ نشیں ہو گیا ہوں

یہاں پر میں ہونا نہیں چاہتا تھا
مگر، ہوتے ہوتے یہیں ہو گیا ہوں

ترے پانو پڑنے سے انکار کر دوں
میں اتنا تو خُودسر نہیں ہو گیا ہوں

جہاں مُجھ کو ہونے سے روکا تھا اُس نے
نہیں باز آیا، وہیں ہو گیا ہوں

مکاں جس کا نقشہ ابھی بن رہا ہے
میں فی الحال اس کا مکیں ہو گیا ہوں

توجّہ کا طالب ہوں اس طرح سے بھی
اگر آپ کا نکتہ چیں ہو گیا ہوں

بُڑھاپے سے اگلی یہ منزل ہے کوئی
جواں ہو گیا ہوں، حسیں ہو گیا ہوں

اسے بھی، ظفرؔ، میری ہمت ہی سمجھو
کہیں ہو نہ پایا، کہیں ہو گیا ہوں

-☆-

سفر میں ہوں، گردِ سفر ہو گیا ہوں
مبارک ہو سب کو اگر ہو گیا ہوں

نکالا ہے اخبار میں نے بھی اپنا
اور، اپنی ہی کوئی خبر ہو گیا ہوں

ہوا میرے نیچے، ہوا میرے اوپر
بہت آج زیروزبر ہو گیا ہوں

اضافہ ہوا میری مقبولیت میں
کہ جب سے بہت بے اثر ہو گیا ہوں

مجھے کوئی گولائی درکار تھی، اور
اسی جستجو میں صفر ہو گیا ہوں

بہت سامنے سب کے ہونا پڑا تھا
جبھی آج صرفِ نظر ہو گیا ہوں

محبت کوئی روشنی تھی کسی کی
جسے اوڑھ کر دربدر ہو گیا ہوں

جو ہوتا تو خود کو دکھائی بھی دیتا
کہاں ہو گیا ہوں، کدھر ہو گیا ہوں

نکلتا نہیں ہوں، ظفر، خود سے باہر
کوئی مستقل اپنا گھر ہو گیا ہوں

-☆-

میں سوکھا ہوا تھا، ہرا ہو گیا ہوں
ذرا دیکھنا، کیا سے کیا ہو گیا ہوں

کسی بھی طرف جو نکلتا نہیں ہے
کچھ اس طرح کا راستہ ہو گیا ہوں

میں کل تک جو اس عالمِ آرزو میں
کہیں بھی نہ تھا، جابجا ہو گیا ہوں

جو ٹلتی دکھائی نہیں دے رہی ہے
سروں پر اک ایسی بلا ہو گیا ہوں

مرے چار سو تھی جو دیوارِ دنیا
گرا دی ہے، اور، اب کھلا ہو گیا ہوں

کہیں پر اٹکتی ہوئی روشنی سی
کہیں سے گذرتی ہوا ہو گیا ہوں

کسی بات کی انتہا ہوتے ہوتے
اسی بات کی ابتدا ہو گیا ہوں

کوئی بندوبست اب تو کرنا پڑے گا
بہت آج کل سرپھرا ہو گیا ہوں

بہت شور میں نے مچایا ہوا تھا
بالآخر، ظفر، بے صدا ہو گیا ہوں

-☆-

بہت پوچھ بیٹھے ہو، کیوں ہو گیا ہوں
میں اب آپ سے کیا کہوں، ہو گیا ہوں

جگہ کوئی خالی ہوئی تھی کہیں پر
کسی نے تو ہونا تھا، یوں ہو گیا ہوں

مجھے کوئی اعزاز بھی چاہیے ہے
بہت اب تو خوار و زبوں ہو گیا ہوں

کوئی آج ہی منہدم ہونے والی
عمارت ہے جس کا ستوں ہو گیا ہوں

وہ جس دن سے روز آ کے ملنے لگا ہے
میں تب سے بہت بے سکوں ہو گیا ہوں

مرا ہوں کہ اب تک بہت جی چکا تھا
بہت گھٹ گیا تھا، فزوں ہو گیا ہوں

زباں ایک چلتی ہوئی تھا کبھی جو
رگوں میں رکا کوئی خوں ہو گیا ہوں

کہیں درمیاں میں نہیں ہو سکا میں
دروں ہو گیا ہوں، بروں ہو گیا ہوں

ظفر، کوئی مانے نہ مانے مجھے اب
کہ مجبور ہوں، کیا کروں، ہو گیا ہوں

☆

میں وہ ہو گیا ہوں کہ یہ ہو گیا ہوں
سو، جو کچھ ہوں، تیرے لیے ہو گیا ہوں

مجھے آپ تو کوئی دعویٰ نہیں ہے
اُسے جا کے پوچھو جسے ہو گیا ہوں

چلا تھا تو کچھ ہو گیا تھا وہیں پر
سو، کچھ راستے راستے ہو گیا ہوں

وہی ایک ہوں اور نہیں ہوں گوارا
بھلا میں کوئی چار چھ ہو گیا ہوں

کوئی خاص کر تو نہ تھا میرا ہونا
جہاں اور بھی لوگ تھے، ہو گیا ہوں

بہت میرے ہونے کے بھی منتظر تھے
کوئی مجھ کو آواز دے، ہو گیا ہوں

مجھے اب جہاں بھی کہیں بھیج دے تُو
کہ اب میں تو حاضر ترے ہو گیا ہوں

ترے پاس ہونے ہی کی آرزو ہے
میں اتنا جو تجھ سے پرے ہو گیا ہوں

ظفر، میرا انجام ہونا ہی تھا
کہ پہلے بہت وقت سے ہو گیا ہوں

☆

زمانے سے پھر دوبدو ہو گیا ہوں
اور، اس بار تو ہوبہو ہو گیا ہوں

کہاں ہیں مرے منتشر کرنے والے
بڑی دیر بعد ایک سُو ہو گیا ہوں

مجھے اپنی ہمت پہ حیرت نہ ہو کیوں
اچانک ترے رُوبرُو ہو گیا ہوں

کہیں رہنے والی مصیبت ہوں یکسر
کہیں بہنے والا لہُو ہو گیا ہوں

مرے زخم رہتے ہیں تازہ جو ہر دم
اسی باغ کے رنگ و بُو ہو گیا ہوں

ملاقات پہ اب اجارہ ہے میرا
کہ جب میں نے چاہا ہے تُو ہو گیا ہوں

یہاں یہ بھی فی الحال کافی ہے مجھ کو
اگر تتمۂ گفتگو ہو گیا ہوں

یہیں بھیڑ میں کھو گیا تھا کسی دن
میں اپنی ہی اب جستجو ہو گیا ہوں

ظفر، کوئی باغی تھا سیلاب کا میں
جو یوں دربدر، کوبکو ہو گیا ہوں

☆

عجب کوئی زورِ بیاں ہو گیا ہوں
رکا ہوں تو پھر سے رواں ہو گیا ہوں

بہت گرد اُڑنے لگی میرے پیچھے
اکیلا ہی میں کارواں ہو گیا ہوں

سبھی میرے ہونے پہ خوش ہو رہے ہیں
مجھے بھی بتاؤ، کہاں ہو گیا ہوں

کنارے نکل آئے ہیں میرے اندر
بظاہر تو میں بےکراں ہو گیا ہوں

کسی کام سے شادماں ہوتے ہوتے
کسی بات سے بدگماں ہو گیا ہوں

کسی کے لیے واقعہ ہوں یہاں پر
کسی کے لیے داستاں ہو گیا ہوں

میں باہر تو محفوظ تھا ہر طرح سے
گھر آیا ہوں اور بے اماں ہو گیا ہوں

جو پڑنے لگی تھی بہت میری قیمت
ہوں شرمندہ، اور، رائیگاں ہو گیا ہوں

ظفر، کام لوں اب اشاروں سے کب تک
زباں توڑ کر بےزباں ہو گیا ہوں

☆

ہر روز چٹخنیاں کہ فلک سے اُترنیاں
دیکھے جو کوئی آ کے مری کام کرنیاں

کچھ یاد بھی ولا کے نہیں اپنی سرنیاں
تجھ سے بھی تیز تر یہ تری کہہ مُکرنیاں

مُنہ زور چلنیوں سے زیادہ ٹھہرنیاں
خواب رواں سے جاگنیاں اور ڈرنیاں

ساکت ہیں آسمان و زمیں ، اور ، دم بخود
اِس دل کی خاک پر یہ تری پانو دھرنیاں

آنکھوں کو انتظار ہی رہتا ہے ، اور ، پھر
اس رہگزار سے تری اکثر گذرنیاں

منزل تو سربسر کہیں پیچھے ہی رہ گئی
اب کے کچھ اس طرح کی تھیں اپنی سفرنیاں

پانی بھی پینیاں ہیں کسی اور طرح کی
اپنی ہی طرز کی ہیں یہاں گھاس چرنیاں

جاری ہیں ، کچھ مُراد بھی ملتی ہے یا نہیں
اپنے ہی آستانے پہ اپنی پسرنیاں

کرتے ہیں کام سوچ سمجھ کر ہی اب ، ظفرؔ
ہرگاہ کرنیوں سے بھی آگے ہیں بھرنیاں

-☆-

جُدائی میں اپنی قرار انتظاری
خزاں میں ہے کیسی بہار انتظاری

کہیں قافلہ کھو چکا تھا ہمارا
کئی روز سے تھی غبار انتظاری

دمادم خسِ خواب کا وہ لرزنا
بہت اوج پر تھی شرار انتظاری

کنارے پہ آتے ہیں ناچار سارے
پہنچتی ہے دریاؤں پار انتظاری

ہجومی تماشا ہی کرتے ہیں اکثر
نہیں ہم میں کوئی قطار انتظاری

ابھی نااُمیدی ہے اور نامُرادی
کیے جائیے اختیار انتظاری

کسی کے بھی آنے کا امکاں کیا ہو
یہ ہے اصل میں انتظار انتظاری

کبھی اپنی ناکام پرواز کا غم
کبھی ہم کو اس کی اُتار انتظاری

ظفرؔ ، آج ممکن نہیں اُس کا آنا
کیے جاؤ بیٹھے ہزار انتظاری

-☆-

خیال انتشاری ، گمان ، انتظاری
زمیں پر رہی آسمان انتظاری

صدائیں تھیں گہرے سمندر کے اندر
ہوائیں تھیں اور بادبان انتظاری

سُنا ہی نہیں واقعہ تو کسی نے
ابھی ہے وہی داستان انتظاری

ترا خواب ہے نیند سے آگے آگے
مرا جسم ہے اور جان انتظاری

کوئی آنے والا بھی ہے یا نہیں ہے
جدھر دیکھیے ہے جہان انتظاری

وہاں دن تو ڈوبا ہُوا تھا کبھی کا
بہت دیر سے تھی اذان انتظاری

مکانوں سے باہر مکیں رہ رہے تھے
مکینوں کے اندر مکان انتظاری

عدو سے امیدیں لگائے ہوئے تھے
کسی کو نہ تھی مہربان انتظاری

ظفر، کب سے خاموش بیٹھا ہُوں جانے
یہی کیفیت ہے بیان انتظاری

☆

ہر گھڑی رُخ بدلتیاں میری
گرتیاں اور سنبھلتیاں میری

اُس کو ناراض کرتیاں اک دن
اور ، پھر ہاتھ ملتیاں میری

اُس کی محفل کی سمت جاتے ہُوئے
رُکتیاں اور چلتیاں میری

جلوہ گاہِ خیال و خواب میں وہ
شمع کی طرح جلتیاں میری

ایک سانچے سے باہر آ کر وہ
نئے سانچے میں ڈھلتیاں میری

کسی تازہ ہَوا کی حسرت میں
گھر سے باہر نکلتیاں میری

چھوڑتے پانو میری مٹی نے
اور ، فلک تک اُچھلتیاں میری

خوب ہیں خود ہی میری اپنے خلاف
روز یہ زہر اُگلتیاں میری

اور ، کسی کام کے بغیر ، ظفر
اُس گلی میں ٹہلتیاں میری

☆

کبھی دیکھو کے آنیاں میری
اور، پھر بھاگ جانیاں میری

کبھی دھوکے فریب سے یکسر
پاس اُس کو بٹھانیاں میری

کرسیاں ڈالنی وہ جلسے میں
اور، دریاں بچھانیاں میری

دیکھتے آپ بھی کبھی آ کر
اُس کو آنکھیں دکھانیاں میری

لوگ اکثر ہی بھول جاتے ہیں
جھوٹی خبریں اُڑانیاں میری

کہیں آنکھیں لگانیاں دیکھو
کہیں آنکھیں چُرانیاں میری

آگے بڑھنے سے پیشتر خُود کو
راستے سے ہٹانیاں میری

سخت شرمندہ کر گئیں مُجھ کو
یہی دُھومیں مچانیاں میری

نئے لوگوں کے سامنے ہیں، ظفر
وہی باتیں پُرانیاں میری

-☆-

چوری چوری وہ تکنیاں تیری
اور، آنکھیں جھپکنیاں تیری

کچھ مرے گھر کی سمت آتے ہُوئے
راستے میں اٹکنیاں تیری

اور، اک دن نظر بچاتے ہُوئے
دل کی گٹھڑی اُچکنیاں تیری

شام کے انتظار لمحوں میں
بام و در سے جھلکنیاں تیری

آج بھی ہیں اسی طرح موجود
پہلی پہلی جھجکنیاں تیری

چاہنا بھی کہ ہو سکے کچھ تو
اور، کچھ کر نہ سکنیاں تیری

کس جگہ جا کے اب کھلا ہے تُو
اور، کہاں ہیں مہکنیاں تیری

آج دل میں بہت اندھیرا ہے
چاہیے ہیں چمکنیاں تیری

یاد ہیں ساری ساری رات، ظفر
شہر میں وہ بھٹکنیاں تیری

-☆-

رونق گھر میں کرنیاں اُس کی
بام و در سے اُترنیاں اُس کی

دل کو دھڑکائیں ساتھ ساتھ مرے
چلنیاں اور ٹھہرنیاں اُس کی

اُس کے وعدے پہ اتنے خوش نہ پھرو
ہیں یہ سب کہہ مکرنیاں اُس کی

آتے جاتے کبھی کسی لمحے
دل پہ وہ پانو دھرنیاں اُس کی

کوئی خوشبو ہے خوشبوؤں سے الگ
اور، کوئی بکھرنیاں اُس کی

اُس کی مرضی پہ منحصر ہیں بہت
اب یہاں سے گذرنیاں اُس کی

شاخ کی طرح وہ لرز اُٹھنا
کسی آہٹ سے ڈرنیاں اُس کی

کسی دیوار کی طرح سے کہیں
دل کے اندر اُسرنیاں اُس کی

تھا عجب سوءِ اِتفاق، ظفر
کرنیاں میری، بھرنیاں اُس کی

☆

چپکی ہوئی رات کو سیاپا
خود کو جب موت سے نکاحا

جو بات دکھائی دی یقینی
اُس کو بھی کسی طرح مبایا

بیٹی کو سکھائی دایہ گیری
بیٹے کو فوج میں سپایا

لاچار کیا جو خامشی نے
اُس کو بندوق سے ہی ٹھایا

جس کی نہ ملی کبھی اجازت
کیوں کر کرتے نہ خواہ مخواہا

ہجرت کروائی شہریوں سے
اس طرح سے شہر کو رفایا

کرتا رہا میں بھی خوب گمراہ
کچھ آپ نے قوم کو فلاحا

مٹی ہی سیم تھور نکلی
مشکل سے کھیت کو کرایا

خود بھی، ظفر، ایسا چاہتے تھے
جن کو میں نے یہاں گرایا

☆

جب بھی کسی خواب کو کھنگالا
اپنے ہی کمال کو زوالا

اندر سے لاش ہی تھی غائب
جس جس کی قبر کو کھُدالا

تھا اُس کا جواب سخت مُشکل
میں نے آسان ہی سوالا

میں نے بھی دیا نکھار اُس کو
اللہ نے بھی اُسے جمالا

بے حال کیا ہُوا تھا اُس نے
خُود کو مُشکل سے ہی بحالا

اپنے تو فتور تھا ہی سر میں
اُس کا بھی دماغ اختلالا

نکلی کچھ اور صورتِ حال
جو بھی کبھی ہم نے احتمالا

کچھ اور بھی گھٹ گیا تھا اس بار
دل کا رقبہ جو اِشتمالا

برسوں ظفر، ایڑیاں رگڑتے
صد شکر کہ آج انتقالا

☆

کچھ امکاں تو تھے ہی ملاقات کے
مگر، اور تیور تھے حالات کے

بتا، اصل میں تیرا مطلب ہے کیا
معانی کئی ہیں تری بات کے

رُکا بیچ میں خواب کا سلسلہ
چلے تند جھونکے خیالات کے

کُھلیں گے پُرانی زمینوں کے راز
کٹے گا سفر ساتھ ہی ساتھ کے

وہی چارسُو سبز ہے یہ زمیں
وہی ہیں کرشمے نباتات کے

اُٹھے گا ابھی آسماں کا نقاب
ابھی رنگ برسیں گے برسات کے

کی کوئی پہیلی ہے چاروں طرف
یہ سب شاخسانے ہیں بہتات کے

ان آبادیوں سے نکل جایئے
یہاں پر ٹھکانے ہیں آفات کے

ظفر، سخت کیشی بھی ہے ایک وضع
کہ ہوتے ہیں کچھ لوگ ہی دھات کے

☆

ہیں مجبور باہر نکلنے سے ہم
سو، معذور تھے ساتھ چلنے سے ہم

سنبھل سے گئے گرتے گرتے کبھی
کبھی گر پڑے ہیں سنبھلنے سے ہم

کسی طور تجھ سے ہوئے سُرخرو
لہُو مُنہ پہ اپنا ہی ملنے سے ہم

تر و تازہ کرتی ہے پھر آ کے شام
اُبھرتے ہیں سورج کے ڈھلنے سے ہم

نہ تھا دور یہ آسماں بھی بہت
کوئی کام لیتے اُچھلنے سے ہم

رہی دوسروں کو بدلنے کی دُھن
کہ منکر تھے خود کو بدلنے سے ہم

جمی تھی بہت برف اندر کہیں
سو، بچ ہی گئے ہیں پگھلنے سے ہم

کہ یہ راکھ ہی اپنی اکسیر ہے
بچاتے نہیں خود کو جلنے سے ہم

زمیں دیکھ کر باز آئے، ظفر
یہاں پھولنے اور پھلنے سے ہم

☆

پڑے تنگ جب ناز اٹھانے سے ہم
نکل آئے تیرے زمانے سے ہم

بس اب منزلِ شوق نزدیک ہے
یہ سمجھے ترے مسکرانے سے ہم

بہت دور ہونا پڑے گا کبھی
سو، ڈرتے رہے پاس آنے سے ہم

ذرا دور آگے تو پہنچے کہیں
رکاوٹ تمھاری ہٹانے سے ہم

کچھ اس طرح کے نقشِ دیوار تھے
نمایاں ہوئے ہیں مٹانے سے ہم

عجب تو یہ ہے، آپ گم ہو گئے
سُراغ اُس کا تھوڑا سا پانے سے ہم

وہیں تیر کھا کر پڑے ہیں نڈھال
بہت دور تھے جب نشانے سے ہم

عبث ایک دُنیا سے لی دشمنی
سو، باز آئے دھومیں مچانے سے ہم

بھرم کھول بیٹھے ہیں سارا، ظفر
یہ اُلٹا تماشا دکھانے سے ہم

☆

اگر بچ رہے پانو دھرنے سے ہم
تو ڈوبے ترے پار اُترنے سے ہم

محبت کی محنت گئی رائگاں
جو کچھ اور خالی ہیں بھرنے سے ہم

کوئی بات اس طرح کی ہو گئی
کہ پیاسے ہی لوٹ آئے جھرنے سے ہم

ہمارے لیے راستہ کُھل گیا
تو منکر تھے خود ہی گذرنے سے ہم

زیادہ ہی تکلیف میں رہ گئے
اِدھرنے کی نسبت اُدھرنے سے ہم

سفر میں تو خود ہی رواں تھے ، مگر
بہت تھک گئے ہیں ٹھہرنے سے ہم

طبیعت ہی اس طرح کی پائی ہے
جو یکسو ہُوئے ہیں بکھرنے سے ہم

بڑے شوق سے آج کی خودکشی
بہت ڈرتے آئے تھے مرنے سے ہم

ظفر ، اس طرح کی ہی تھی واردات
کہ پکڑے گئے ہیں نہ کرنے سے ہم

☆

بہت خوف رکھتے ہیں سونے سے ہم
کسی خواب کا بیج بونے سے ہم

اگر تو نہ ہوتا تو جاتے کہاں
تسلی میں ہیں تیرے ہونے سے ہم

کبھی خوش ہُوئے دھوپ میں بیٹھ کر
کبھی مینہ میں کپڑے بھگونے سے ہم

لطیفہ نہ کوئی سناؤ ابھی
کہ فارغ نہیں رونے دھونے سے ہم

پریشان ہیں ، خود پہ حیران ہیں
کنارے پہ کشتی ڈبونے سے ہم

رہے دُور تر اس عمارت سے جب
تو واقف ہوئے کونے کونے سے ہم

یہ حالت ہُوئی ہے کہ ہیں مطمئن
نہ پانے سے کچھ اور نہ کھونے سے ہم

یہی تھا بہت ، اور کیا کھیلتے
محبت کے مہنگے کھلونے سے ہم

گزارہ کیے جا رہے ہیں ، ظفر
محبت کے میلے بچھونے سے ہم

☆

یہ زمین آسمان کا ممکن
نہیں سارے جہان کا ممکن

عقل کی خارزار وادی میں
رکھ لیا ہے گمان کا ممکن

کچھ مرے حال زار کا امکاں
کچھ تری آن بان کا ممکن

ہیں وہی نارسائی کے نغمے
اور ، وہی مہربان کا ممکن

کچھ زیادہ تباہ کر نہ سکے
جسم کے ساتھ جان کا ممکن

آگے آگے ہوں میں ، مرے پیچھے
ہے مرے قدردان کا ممکن

دُور تر ہے سُراغ کا ساحل
دُھند میں ہے نشان کا ممکن

لامکانی ہی لامکانی ہے
کھو چُکا ہے مکان کا ممکن

اس بڑھاپے میں بھی ، ظفر ، آ کر
کوئی دیکھے جوان کا ممکن

☆

تھا پشیمان دریچے کے قریب
کوئی مہمان دریچے کے قریب

کچھ مرا جسم پڑا ہے باہر
کچھ تری جان دریچے کے قریب

ایک لمحے کے لیے آ ، بے شک
بات مت مان ، دریچے کے قریب

کچھ تعارف ہُوا دروازے پر
جان پہچان دریچے کے قریب

وہ بھی ششدر سا کھڑا تھا جیسے
مَیں بھی حیران دریچے کے قریب

ڈھونڈتے تھے جسے دیوار کے پاس
تھا وہ امکان دریچے کے قریب

منتظر تھا مرا گھر آنے پر
کوئی طوفان دریچے کے قریب

بھاگنے کے لیے رکھا ہُوا تھا
سارا سامان دریچے کے قریب

کسی باہر کی ہوا کا تھا ، ظفر
کوئی گھمسان دریچے کے قریب

☆

اندھیرے بھی ہیں کچھ خواب
کہ میرے بھی ہیں کچھ خواب

یہ مچھلی کے شکاری
مچھیرے بھی ہیں کچھ خواب

سب آپس میں ملا دیں
جو تیرے بھی ہیں کچھ خواب

یہ بادل کی طرح کے
گھنیرے بھی ہیں کچھ خواب

کہیں چل نہیں سکتے
بسیرے بھی ہیں کچھ خواب

نہیں دیکھتے دن رات
لٹیرے بھی ہیں کچھ خواب

یہیں بین بجاتے
سپیرے بھی ہیں کچھ خواب

اس رات کے اندر
سویرے بھی ہیں کچھ خواب

وعدہ تھا، ظفر، اُس سے
سو، پھیرے بھی ہیں کچھ خواب

☆

کوئی پتھر سے نہ کر دے یہ فضا ویراں
سلیماں دم بخود ہو اور سبا ویراں

چمن میں سبزۂ پامال کے اُوپر
بھٹکتے ہیں وہی صبح و صبا ویراں

اُسی صورت ہوس کے تانے بانے تھے
وہی ہر سُو محبت ماجرا ویراں

الگ برباد ہیں آبادیاں دل کی
کہیں شہرِ تماشا ہے جُدا ویراں

ہزاروں بار پتھر سے ہمہما اُٹھا
ہزاروں بار یہ منظر ہُوا ویراں

دکھائی دے گی کل یکسو کوئی صورت
نظر آیا ہے جو اب جابجا ویراں

فرشتے عرش پر آباد ہیں، لیکن
زمیں پر مَیں ہُوں اور میرا خدا ویراں

خرابے ہیں مری آواز کے ہر سُو
یہیں ہوتی رہی مری صدا ویراں

تمھارے سامنے ہی ہونے والا ہے
ظفر صاحب تمھارا نقشِ پا ویراں

☆

آ سکے گا نہ پہچان میں اجنبی
یہ جو رہتا ہے انسان میں اجنبی

بہت مشکلوں میں ہے ڈالا ہُوا
کبھی آؤ آسان میں ، اجنبی

اب جہاں جائیں گے ، حال ہوگا یہی
یہ جو ہیں آپ ایران میں اجنبی

کچھ نئی طرح کے طور اطوار ہیں
آن میں آشنا ، آن میں اجنبی

سب تکلف دھرے کا دھرا رہ گیا
بندھ گئے عہد و پیمان میں اجنبی

دیکھا دیکھی بھلا بھی کرو گے ہمیں
رہ سکو گے نہ گنجان میں اجنبی

آ کے منزل پہ کیا ڈھونڈتے ہو مجھے
رہ گیا اپنے سامان میں اجنبی

یہ مُعمّا سمجھ میں نہیں آ رہا
پھول میں آپ ، گلدان میں اجنبی

یوں ظفر سے نہ صرفِ نظر کیجیے
یہ بھی ہے ایک اِمکان میں اجنبی

☆

اُس گلی جاتے ہیں اور آتے ہیں ہم
ایک ہی اُلجھن کو سُلجھاتے ہیں ہم

جو یہاں نایاب و ناموجود ہے
پھر بھی اُس کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں ہم

جی نہیں اُٹھتے ہیں ، لیکن ، اپنے آپ
اپنی مرضی سے تو مر جاتے ہیں ہم

بھول جانا ہے محبت کا سبق
چاہیے اس کو روز دُہراتے ہیں ہم

دے رکھا ہے خُود زمانے کو فریب
اب کبھی دھوکا نہیں کھاتے ہیں ہم

پختگی سی آ گئی ہے طبع میں
شرم آتی ہے نہ شرماتے ہیں ہم

ختم ہونے کو ہے یہ عہدِ ستم
کیسے کیسے دل کو بہلاتے ہیں ہم

لفظ کو سیدھا ہی رکھتے ہیں ، اسے
وقت پڑنے پر ہی اُلٹاتے ہیں ہم

بے وفا سے جان تو چھوٹی ، ظفر
آج کل روتے نہیں ، گاتے ہیں ہم

☆

تلوار کو نیام دے رہا ہوں
معنی کو لگام دے رہا ہوں

بے کار نہ بیٹھ، عشق ہی کر
اُس کو یہ پیام دے رہا ہوں

اک یاد رکھی ہے دل کے اندر
بے کار کو کام دے رہا ہوں

اس پر کوئی حق نہیں ہے جس کا
اُس کو یہ مقام دے رہا ہوں

وہ مال کبھی نہیں ملے گا
جس کے لیے دام دے رہا ہوں

کب تک یہ دھوپ سے جھلسنا
دوپہر میں شام دے رہا ہوں

دیتا ہوں دعائیں بھی کبھی میں
دشنام تو عام دے رہا ہوں

شرمندہ ہوں آج بھی کہ آخر
کیا طرزِ کلام دے رہا ہوں

جو بھی ہے، ظفر، بُرا بھلا کچھ
تجھ کو ترا نام دے رہا ہوں

☆

زاہد کو شراب دے رہا ہوں
اندھے کو کتاب دے رہا ہوں

جو رنج اُٹھا چکا ہوں اب تک
اُس کا بھی حساب دے رہا ہوں

بڑھتا گیا اور بھی اندھیرا
ایسی تب و تاب دے رہا ہوں

مُجھ سے جو سوال ہی نہیں تھا
مَیں اُس کا جواب دے رہا ہوں

باندھی ہے اُمیدِ وصل پھر سے
خُود کو یہ عذاب دے رہا ہوں

خُود تنگ دھڑنگ ہوں سرِ راہ
اور درسِ حجاب دے رہا ہوں

ہر روز چلاؤں گا ہوا میں
تلوار کو آب دے رہا ہوں

اچھا تو خراب کو دیا تھا
اچھے کو خراب دے رہا ہوں

دے کر، ظفر، آندھیوں کو دعوت
خیمے کو طناب دے رہا ہوں

☆

چاند پیچھے، بام سے آگے ہوا
اب ملے گی شام سے آگے ہوا

کچھ غبارِ خواب کے اندر رہی
کچھ خیالِ خام سے آگے ہوا

دل سے باہر ہے ابھی کہرامِ دل
اور ہے کہرام سے آگے ہوا

اک تمہارے نقش کے پیچھے ہوس
اک تمہارے نام سے آگے ہوا

پھر وہی حبسِ محبت رات بھر
پھر دلِ ناکام سے آگے ہوا

جامۂ احرام سے پیچھے تھے لوگ
جامۂ احرام سے آگے ہوا

تازہ دم ہونے کی خاطر جب رُکے
چل پڑی آرام سے آگے ہوا

بچ سکوں شاید بکھرنے سے کبھی
کام ہے اور کام سے آگے ہوا

چل رہا ہوں کوئی پنکھا سا، ظفر
پھینکتا ہر گام سے آگے ہوا

☆

جس طرح سیلاب سے آگے ہوا
خواب ہے اور خواب سے آگے ہوا

اُس کی صبح و شام کے پردے ہلائے
اُس کی آب و تاب سے آگے ہوا

ہوتے ہوتے جو یہاں تک آ گئے
ڈھونڈیے نایاب سے آگے ہوا

فاصلہ اب تو کوئی باقی نہیں
ہے اگر پایاب سے آگے ہوا

ہو گیا پانی اندھیرا دفعتاً
بُجھ گئی تالاب سے آگے ہوا

ایک تو سُرخاب کے ہمراہ تھی
دوسری سُرخاب سے آگے ہوا

وادیِ شاداب کے اندر تھی
وادیِ شاداب سے آگے ہوا

پانی پانی ہو کے واپس آئی ہے
کیا گئی مہتاب سے آگے ہوا

راستے میں رُک نہیں سکتی، ظفر
ہے دلِ بے تاب سے آگے ہوا

☆

اس گل و گلزار سے آگے ہوا
چل رہی تھی پیار سے آگے ہوا

پھنس نہ جائے ٹہنیوں کے درمیاں
جائے گی اشجار سے آگے ہوا

پھر کسی کو بھی نہیں آئی نظر
کھو گئی دیوار سے آگے ہوا

سب سے ہی آگے ہُوا کرتی تھی جو
اب ہے بس دو چار سے آگے ہوا

تیرگی کی لہر سے پیچھے تھے ہم
روشنی کی دھار سے آگے ہوا

دھول سی اڑنے لگی چاروں طرف
تھی کوئی انکار سے آگے ہوا

کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ تھی
آر سے یا پار سے آگے ہوا

ایک پھولوں اور شاخوں سے الگ
ایک برگ و بار سے آگے ہوا

کیا بتائیں کس قدر تھی، اے ظفر
کوششِ بسیار سے آگے ہوا

☆

ڈھونڈتا ہوں رات سے آگے ہوا
تھی تمھاری بات سے آگے ہوا

بادلوں کو ساتھ لے کر اڑ گئی
تھی بہت برسات سے آگے ہوا

کچھ ترے باغات کے چاروں طرف
کچھ ترے باغات سے آگے ہوا

گھات میں تھی رات کے صبحِ جمیل
اور اس کی گھات سے آگے ہوا

مَیں نے ہی روکی ہُوئی تھی ہاتھ سے
جا رہی تھی بات سے آگے ہوا

پیچھے پیچھے میں بھی تھا حالات کے
اور مرے حالات سے آگے ہوا

ہر نفس پسماندگی میں ہے وہی
اور موجودات سے آگے ہوا

شہر میں کیوں کرتے پھرتے ہو تلاش
ہے اگر دیہات سے آگے ہوا

سانس اُکھڑتی جا رہی تھی، اے ظفر
تھی جو اپنی ذات سے آگے ہوا

☆

زندگی کچھ نہیں ، مرے بھائی
موت بھی کچھ نہیں ، مرے بھائی

ہے توجہ کی دُوسری صُورت
بے رُخی کچھ نہیں ، مرے بھائی

رنج بھی ایک عارضی شے ہے
اور ، خوشی کچھ نہیں ، مرے بھائی

ظلم توڑے گا اور بھی وہ بہت
یہ ابھی کچھ نہیں ، مرے بھائی

یہ اندھیرے کی آخری حد ہے
روشنی کچھ نہیں ، مرے بھائی

ایک درپردہ دُشمنی کے سوا
دوستی کچھ نہیں ، مرے بھائی

جس کی لاٹھی ہو بھینس اُسی کی ہے
منصفی کچھ نہیں ، مرے بھائی

قافیہ قافیے سے جوڑتے ہیں
شاعری کچھ نہیں ، مرے بھائی

ایک ہی بار بار ہے وہ ظفؔر
دُوسری کچھ نہیں ، مرے بھائی

-☆☆-

آن و ایں کچھ نہیں ، مرے بھائی
اب کہیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

آسمانوں ہی کا تسلّط ہے
یہ زمیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

اُوپر اُوپر ہی جو بھی کچھ ہے یہاں
تہ نشیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

اصل شے ہے یہ لمحۂ موجود
بعدازیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

سب گماں ہی گماں ہے چاروں طرف
اور ، یقیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

کچھ تو ہے ، وہ مکان ہے غائب
یا مکیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

اس طرح مارے مارے پھرنا کیا
جب نہیں ، کچھ نہیں ، مرے بھائی

اور تو ہر جگہ بھی کچھ ہے
کیوں یہیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

ڈھونڈ امکان و انتظار ، ظفؔر
جاگزیں کچھ نہیں ، مرے بھائی

-☆☆-

ہو بہو کچھ نہیں، مرے بھائی
چار سُو کچھ نہیں، مرے بھائی

میری ہستی سراب ہے سارا
اور تُو کچھ نہیں، مرے بھائی

غیبتِ دوستاں ہے شام و سحر
گفتگو کچھ نہیں، مرے بھائی

ہے خیالی بہار کا موسم
رنگ و بُو کچھ نہیں، مرے بھائی

پسِ پردہ ہی رابطہ ہے ممکن
دُوبدُو کچھ نہیں، مرے بھائی

دیکھنا بھی ہُوا ہے لاحاصل
رُوبرُو کچھ نہیں، مرے بھائی

ماسوائے خیال و خوابِ ہوس
آرزو کچھ نہیں، مرے بھائی

دشمنِ جاں ہیں آپ ہی اپنے
اب عدُو کچھ نہیں، مرے بھائی

شہر سنسان ہو چکا ہے، ظفر
کُو بہ کُو کچھ نہیں، مرے بھائی

☆☆

روز و شب کچھ نہیں، مرے بھائی
اور طلب کچھ نہیں، مرے بھائی

رونقیں تھیں یہاں پہ کیا کیا کچھ
لیکن اب کچھ نہیں، مرے بھائی

کچھ اگر ہے تو ہے فسادِ نظر
رنگِ لب کچھ نہیں، مرے بھائی

خواب دیکھا ہے کوئی ورنہ یہاں
اب نہ تب کچھ نہیں، مرے بھائی

اپنی محنت سے ہے یہ لوٹ کھسوٹ
فضلِ رب کچھ نہیں، مرے بھائی

غور سے دیکھ عالمِ اسباب
بے سبب کچھ نہیں، مرے بھائی

نیستی ہی کا عہد ہے آغاز
ورنہ کب کچھ نہیں، مرے بھائی

کچھ نہ کچھ تھا تو میرے چاروں طرف
آج سب کچھ نہیں مرے بھائی

کس کی موجودگی ہے پھر بھی، ظفر
یعنی جب کچھ نہیں، مرے بھائی

☆☆

جابجا کچھ نہیں ، مرے بھائی
یہ خلا کچھ نہیں ، مرے بھائی

میری فردِ عمل میں تیرے لیے
اے خدا ، کچھ نہیں ، مرے بھائی

روشنی ہے فقط نظر کا فریب
اور ، ہوا کچھ نہیں ، مرے بھائی

پسِ پردہ جو ہو تو ہو شاید
رُونما کچھ نہیں ، مرے بھائی

بات وہ ہے جو ہو اشاروں میں
برملا کچھ نہیں ، مرے بھائی

جو بھی کہہ جایئے ، روا ہے یہاں
ناروا کچھ نہیں ، مرے بھائی

مفت ہی میں اُدھڑ رہے ہیں بدن
خون بہا کچھ نہیں ، مرے بھائی

اِدھر آنے کا فائدہ اب کیا
جب رہا کچھ نہیں ، مرے بھائی

کام پہلے سے ہی چلے گا ، ظفر
دُوسرا کچھ نہیں ، مرے بھائی

☆

سربسر کچھ نہیں ، مرے بھائی
اب اُدھر کچھ نہیں ، مرے بھائی

دیکھ تفصیل سے اُسے ، ورنہ
اک نظر کچھ نہیں ، مرے بھائی

کام نکلے گا خامشی سے یہاں
شور و شر کچھ نہیں ، مرے بھائی

ایک ہی بارگاہ کا ہو جا
دربدر کچھ نہیں ، مرے بھائی

بات کو اور طول دے بے شک
مختصر کچھ نہیں ، مرے بھائی

یہ اُڑاتا ہے زور اندر کا
بال و پر کچھ نہیں ، مرے بھائی

راستہ خود تراش اپنے لیے
رہگذر کچھ نہیں ، مرے بھائی

شاعری میں بھی کر چکا ہوں بہت
یہ ہنر کچھ نہیں ، مرے بھائی

اے ظفر ، چھوڑ یہ دوادارو
کارگر کچھ نہیں ، مرے بھائی

☆

''اب تک''

''اب تک'' عہدِ رواں کے منفرد شاعر جناب ظفر اقبال کی کلیات کا نام ہے، جسے تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل چار جلدوں میں شائع کرنے کا اہتمام ملٹی میڈیا افیئرز نے کیا ہے، جن کا کہنا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی متازع اور اکیسویں صدی کی مُسلّمہ شاعری ہے۔ کلیات کی جلد چہارم میں شامل کتابیں ''تجاوز، تحلیل، تشکیل، تخفیف، ترکیب، تکنیک'' اس سے قبل تیسری جلد میں ''تجدید، تقویم، تشکیل، تجاوز، تواردہ، تساہل'' اور اس سے بھی پہلے دوسری جلد میں ''وہم و گماں، اطراف، سے ہوماں، تفاوت، ترتیب، تماشا'' جب کہ ''آبِ رواں، گلافتاب، رطب و یابس، غبار آلود سمتوں کا سراغ، سرعام، عیب و ہنر'' پر مشتمل جلد اول دیدہ زیب سرورق سے مزین تھی۔ خلیپ فہمیدہ ریاض اور پس سرورق ڈاکٹر وحید قریشی کی آراء سے آراستہ اور دیباچہ نامور نقاد و تنقید نگار شمس الرحمٰن فاروقی کا تحریر کردہ تھا۔ دوسری جلد کا دیباچہ مشفق خواجہ، فلیپ احمد ندیم قاسمی اور پسِ آہو جانے لکھا۔ تیسری جلد کا دیباچہ ڈاکٹر سعادت سعید، ابتدائیہ قاضی افضال حسین اور فلیپ گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تحریر کیا، اور پھر چوتھی جلد کا دیباچہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور فلیپ عبداللہ حسین، کشور ناہید اور نذیر قیصر نے رقم کیے ہیں۔

کلیات کی ہر جلد میں چھے کتابوں کو یکجا پڑھ کر قند مکرر کا لطف آیا ہے اور یوں لگا کہ ظفر اقبال تو کوزہ گر ہیں۔ الفاظ گیلی چکنی مٹی کی طرح اُن کے سامنے رکھے ہیں اور ان کے مشاق ہاتھ چابکدستی کے ساتھ اس رضامند اور حقیقی مٹی کو نئی نئی شکلوں میں ڈھال رہے ہیں، گیلے، سوکھے، جام، اوک، مانوس اور نامانوس ظروف یوں ہر طرف رکھے ہیں جیسے کوئی بستی بسائی گئی ہو اور گلی کوچوں میں جو طبقات آباد ہیں، وہ ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے بھی۔ مجھے ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے جیسے لفظوں نے اپنی پوری رضامندی کے ساتھ خود کو ان کے سپرد کر دیا ہے کہ جیسے چاہیں کھیلیں، برتیں، موڑیں، اچھالیں اور کیچ کریں۔

ظفر اقبال کی شاعری پر کہی جانے والی اکثر آرا میں الفاظ کے ساتھ ''زور آزمائی''، ''اکھاڑ پچھاڑ'' اور ''زبان پر تشدد'' جیسے الفاظ پڑھنے میں آتے ہیں، جب کہ مجھے یہ سارا اتفاق اور رضامندی کا کھیل نظر آتا ہے۔ بعض لوگوں کے اشعار یا نثر پارے پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ لفظ اس بزم میں شامل تو ہیں لیکن روٹھے روٹھے سے ہیں جیسے منت کر کے بٹھائے گئے ہوں لیکن ظفر اقبال کے اشعار میں یہ تاثر مختلف ہے۔ گویا جس لفظ کو جو نشست دی گئی ہے وہ اس پر دل و جاں سے خوش ہے، پوری رضامندی اور توجہ سے بیٹھا مزید کسی حُسنِ سلوک کا منتظر ہے۔ چشمِ تصور میں ایک منظر مجسم ہوتا ہے کہ غزل کی روانی میں رواں الفاظ ایک طاقت ور دھارے کے بہاؤ پر خود کو چھوڑ دینے کا لطف لے رہے ہیں۔ جس یوں لگتا ہے کہ الفاظ خود ہی اپنے تنے پن کو دیکھ کر سرشار ہو رہے ہیں۔

ظفر اقبال نے روایتی استعاروں کو نئے معانی کا لباس بھی پہنایا ہے لیکن یوں نہیں کہ ریشم و حریر کی جگہ پیوند لگا کھدر پہنا دیا ہو بلکہ ایسا مناسب و موزوں اور خوش رنگ پیرہن دیا کہ جچ گیا۔

1 مثال کے طور پر روایتی معنی میں ''نظارہ'' نظر کی طلب ہے، نظر کا مصرف ہے بلکہ اگر نظارہ دل کے مطلوب و مقصود کا یا اس کی تصویر کا ہو تو نظر کا اعزاز ہے لیکن ظفر اقبال کہتے ہیں:

نہیں، اور آنکھ بھر کے یہ تصویر دیکھ لوں
دل کی خوشی تھی، ورنہ نظر کا زیاں تو ہے

2 اسی طرح ''زخم'' کے ساتھ دُکھ، مرہم، نشتر، مسیحائی وغیرہ کے تلازمے عام ہیں لیکن ظفر اقبال کیا کہتے ہیں؟

چارۂ زخم نہ کر، تازہ ہوا آتی ہے
یہ دریچہ ہی کوئی روز کھلا رہنے دے

3 زخم کو دریچہ قرار دینے والے شاعر نے ''یاد'' کا استعارہ ایک بالکل مختلف تاثر میں استعمال کیا ہے۔

میں وہ بت ہوں کہ تری یاد مجھے پوجتی ہے

4 اسی طرح اُڑتی، لہراتی زُلف کا تصور اردو شاعری میں جا بجا خوب صورت پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ لیکن ظفر اقبال کے ہاں زُلف اُڑنے کے بجائے اُڑا رہی ہے:

وہ زُلف ہے کہ اُڑا دے دھواں بنا کے مجھے

5 لبوں کی رنگت واضح کرنے کے لیے تشبیہ و استعارہ کی رنگا رنگی روایتی شاعری کا حصہ ہے۔ یہ ظفر اقبال ہیں جنھوں نے لبوں کی رنگت کو نئی قسم استعارہ بنایا ہے۔

وہ شعلۂ لب رنگ جمیں ہے مرے دل میں

6 پتوں کی طرح یا پتی کی طرح دل کا، جاں کا، رُوح کا یا پورے وجود کا کانپ جانا روایتی مستعمل تشبیہ ہے۔ ظفر اقبال نے اس کو کیسے استعمال کیا ہے:

میں تیری رُوح کی پتی کی طرح کانپ گیا

اس کے ساتھ دوسرا مصرع ملا کر پڑھنے سے جہانِ معنی کا جو در وا ہوتا ہے وہ ایک طرف..... تنہا مصرع ہی مکمل داستان ہے کہ اپنی کیفیت کے بیان میں مخاطب کی رُوح کو منقول قرار دے کر اس کی مدح کا حق تو ادا کیا ہی، اپنے کانپ جانے کو عام سے خاص بنا کر اس کیفیت کی سطح کو کتنا بلند کر دیا۔

7 روایتی شاعری میں محبوب کا خیال اور اس کا تصور ایک ایسا مہمان ہے جو ہر وقت مطلوب و محبوب ہے خواہ اس کی میزبانی کتنی ہی مشکل یا تکلیف دہ ہو۔ ظفر اقبال نے اس صورتِ حال کو بھی اُلٹ دیا ہے:

سوچتی آنکھوں میں پھر تیرے تصور کی پری
دل بدست آئے گی اور خاک بسر جائے گی

8 روایتی شاعری میں متکلم نے اپنے لیے اکثر ساحر کا کردار چنا ہے۔ کبھی، کہیں، کسی نے رہبر کا عہدہ بھی پسند کر لیا لیکن رہزن کا کردار منفی ہونے کی وجہ سے غیر متکلم کے ساتھ مجبوراً ظفر اقبال کہتے ہیں

اکثر اپنی حسرت کو خود ہی لوٹ لیتا ہوں
جادۂ وفا میں ہوں راہزن بھی، راہی بھی

9 محبوب کو بھول یا پھول سا قرار دینے کے بے شمار رنگ اردو شاعری کا حصہ ہیں لیکن ظفر اقبال نے کہا

ابھی سے پھوم کے ذلفوں میں ٹانک لے، ورنہ
ابھی ہوا چلی اور میں ابھی بکھر بھی گیا

ان مثالوں پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ میں نے روایتی شاعری سے بالمقابل مثالیں پیش نہیں کیں۔ میرا خیال ہے کہ جن مثالوں کو میں نے اٹھایا ہے وہ اس قدر عیاں ہے کہ اردو شاعری کے سنجیدہ قارئین کے ذہن میں ایک سے زیادہ اشعار مثال کے طور پر ابھر سکتے ہیں۔

بڑے شاعر کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی شاعری عوام و خواص دونوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ عموماً شاعری کی اس خوبی کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس پر بات نہیں کی جاتی کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعری اور فنون لطیفہ پر اعلیٰ تربیت یافتہ اذہان کا ہی استحقاق ہے اور عام آدمی کو ان سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ظفر اقبال کی شاعری پر جتنی تنقید میں نے دیکھی ہے، اس پہلو پر کسی نے بات نہیں کی۔ ظفر اقبال کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مختلف ذہنی سطح، مختلف طبقات اور مختلف عمر کے لوگوں میں یکساں مقبول ہے اور ان میں سے چند طبقات کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان اشعار کا خالق کون ہے؟

طالب علم طبقہ کو سکول کے زمانہ میں بیت بازی اور تقاریر کے لیے اشعار کی ضرورت ہوتی ہے۔ کلیات پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ میری بیت بازی کی کاپیوں اور میری یادداشت میں ایک قابلِ ذکر تعداد ظفر اقبال کے اشعار کی ہے۔ گمان ہے کہ نیچر نے کلیاتِ اقبال کے ساتھ آپ رواں دی ہو گی کیوں کہ گلِ مہتاب کی مہک، ۔۔۔ بیٹھو رسوا تو کرو، دیکھتا نہ ہو، بکھرنے سے بچا لے مجھ کو، اور بیگانہ نہ ہو جیسی غزلیں ہماری ٹیم کو از بر تھیں جن کے اشعار پر سامعین سے داد ملتی اور وہ مخالفین کو چت کر دیتا تھا۔

کالج کے طلبائے علم میں ایک حساس اور جذباتی طبقہ ہوتا ہے جنھیں اپنے اساتذہ اور سینیئرز کے نام کارڈ لکھنے کے لیے ایسے اشعار درکار ہوتے ہیں جو ان کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ اس طبقے میں اس قسم کے اشعار مقبولِ عام ہیں۔

پڑھنے بیٹھوں تو ابھر آئے گی ہر صفحے پہ
بات کرتی ہوئی ہنستی ہوئی تصویر تری

....

کاغذ پہ لکھ کے پڑھتے رہتے ہیں اس کا نام
جو خواب میں بھی ہم سے کبھی آشنا نہ ہو

میں ہوں کسی کے رنگِ حنا کا ڈرا ہوا

....

بس ایک بار کسی نے گلے لگایا تھا

....

میں ترے پاس تو ہوں تجھ سے جدا ہو کر بھی
یہی سمجھاتی ہے شب بھر تری تصویر مجھے

طلبہ میں ہی ایک اور طبقہ ڈیبیٹرز کا ہے۔ مباحثے میں کچھ اشعار تو موضوع کی مناسبت سے استعمال کیے جاتے ہیں لیکن ہر ڈیبیٹر کے پاس ایسے اشعار کا ذخیرہ ہوتا ہے جنھیں وہ جا بجا تقریر میں چسپاں کر لیتا ہے۔ میں اپنے ذخیرہ میں سے چند مثالیں پیش کرتی ہوں جن کے بارے میں کلیات پڑھتے ہوئے انکشاف ہوا کہ یہ ظفر اقبال کی تخلیق ہے

اپنے سوئے ہوئے سورج کی خبر لے جا کر
اس کمیں گاہ میں کرنوں کو پکڑتا کیا ہے
جانتا ہے کہ اتر جائے گی دل میں مری بات
ورنہ سن لے تو بتا تیرا بگڑتا کیا ہے

یا

آج تسخیر مہ و مہر کی دھن ہے ان کو
جن سے اس دشت کے ذرے ہی نہ بیدار ہوئے
انھیں اس دور میں دعویٰ ہے مسیحائی کا
ہم جنھیں دور سے ہی دیکھ کے بیمار ہوئے

یہاں میں ایک اور طبقے کا ذکر کروں گی۔ اتفاق سے مجھے اپنی زندگی کے چند سال ایسے ماحول اور حالات میں گزارنے پڑے جہاں میں نے کم خواندہ گھریلو بیبیوں کے ذوقِ مطالعہ کا مشاہدہ کیا، جو پاکیزہ، خواتین، آنچل اور شعاع قسم کے ڈائجسٹوں کا بے چینی سے انتظار کرتی ہیں۔ اس نوع کے 99 فی صد عید نمبروں میں یہ شعر سرِ فہرست نظر آتا ہے

مجھے تیری نہ تجھے میری خبر جائے گی
عید اب کے بھی دبے پاؤں گزر جائے گی

علاوہ ازیں

ملوں اُس سے تو ملنے کی نشانی مانگ لیتا ہوں

پہلا پہلا جھوٹ ہے اُس کو یقیں آ جائے گا

....

خامشی اچھی نہیں انکار ہونا چاہیے

....

غیروں کا غیر تھا جسے اپنا سمجھ لیا

یہ اور اس نوع کی دیگر غزلیں "میرے پسندیدہ اشعار" کے صفحہ پر نظر آتی رہتی ہیں۔ ان طبقات سے تھوڑا اوپر جائیں تو دو قسم کے لوگ شاعری پڑھتے ہیں۔

عام قاری جو کسی عام سی بات کو شعری پیرہن میں دیکھ کر لطف حاصل کرتا ہے ــــ اپنی اُن اندرونی کیفیات کو، جنھیں وہ خود بھی کچھ نہیں پاتا، وہ اُن کو شاعری میں بہت خوب صورتی کے ساتھ عیاں دیکھ کر تسکین محسوس کرتا ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی کے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو شاعری کی صورت میں پڑھ کر اسے یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی ہے جو نہ صرف اس کی طرح سوچتا اور محسوس کرتا ہے بل کہ اس طرح بیان کر سکتا ہے، جس طرح وہ خود نہیں کر سکتا۔ ایسے قاری کے لیے ظفر اقبال کے پاس بہت کچھ ہے۔ اتنی رنگا رنگی ہے کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی رنگ ایسے قاری سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی اس بات کو ظفر اقبال کی خامی گردانے کہ ان کی شاعری میں کم خواندہ گھریلو بیبیوں کے لیے، عید کارڈز پر چھاپنے کے لیے، جذباتیت کا شکار نوجوانوں کے لیے حتیٰ کہ بسوں اور ٹرکوں پر لکھنے کے لیے بھی اشعار مل جاتے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ شاعری کی وسعتِ بیان اور کشادہ فکری کے ایسے حقائق و خارجی مظاہر ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

ظفر اقبال کے بنائے ہوئے ظروف کی قدر و قیمت کا تعین وقت اور نقادوں پر چھوڑتے ہوئے، شاعری کے قارئین ان ظروف کی رنگا رنگی اور ان کے نقش و نگار کے انوکھے پن پر تحیّر کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ دراصل قارئین کے لیے ہلکی ہلکی گدگدی جیسا وہ مزہ اہم ہے جو ظفر اقبال کی شاعری کو پڑھتے ہوئے اوّل تا آخر برقرار رہتا ہے۔

آخر میں شاعری کے نہایت سنجیدہ قارئین کا ذکر ضروری ہے جن پر شعر اپنے پورے امکانات کے ساتھ منکشف ہوتا ہے، جو شعر کی پرتیں کھولتے ہیں، اس کی درجہ بندی کرتے ہیں، اس کی قدر و قیمت اور مقام کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظفر اقبال کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ ان نقادوں اور تجزیہ نگاروں کے لیے ظفر اقبال کا ایک شعر اس مضمون کا اختتامیہ ہے:

میں بھی نہیں ہوں، اسی ویرانے کا اک حصہ ہوں
جو ذرا شوق سے ڈھونڈے، وہی پالے مجھ کو

پروفیسر حمیدہ شاہین

اظہر غوری کے نام

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا وا ہونا آغوش کشائی ہے

غالب

સ્કૂપ

અદમ ટંકારવી

*તરકીબ*નું પ્રકાશન ગુજરાતી ગઝલક્ષેત્રે એક 'સ્કૂપ' છે. સ્કૂપ અનેકાર્થી શબ્દ છે. સ્કૂપ એટલે સનસનાટીજનક બીના છતી કરી તરખાટ મચાવવો. સ્કૂપ એટલે *લેઈટેસ્ટ* - છેલ્લામાં છેલ્લી ઢબનું, નવીનતમ. સ્કૂપ એટલે *ઈક્સ્ક્લુઝીવ* - અનન્ય, અનોખું, વિશિષ્ટ. સ્કૂપ એટલે નસીબજોગે ધંધામાં તડાકો, અણધાર્યો નફો. *તરકીબ* આ બધા જ અર્થોમાં સ્કૂપ છે. મે, ૨૦૦૯માં હું મુશાયરા નિમિત્તે ન્યુજર્સી ગયેલો. ત્યાં આદિલ મન્સૂરી સાથે હરવા ફરવાનું થયું. એક મુલાકાતમાં આદિલસાહેબે ઉલટભેર ઉર્દૂ ગઝલકાર ઝફર ઈકબાલની વાત કાઢી. ઝફર ઈકબાલના સંખ્યાબંધ શેર ટાંકી તેનાં રસ-સ્થળોની ચર્ચા કરી. સામાન્ય રીતે કવિતા વિશે સંયમિત મંતવ્યો પ્રગટ કરતા આદિલસાહેબ ઝફર ઈકબાલ સંદર્ભે ખાસ્સા અભિનિવિષ્ટ જણાયા. ઝફર ઈકબાલ એમને ગમતા કવિ તો ખરા જ, ઉપરાંત નિકટના મિત્ર પણ. છેક ૧૯૬૪માં ઝફર ઈકબાલે એક ગઝલના શેરમાં આદિલને આ રીતે સ્મરેલા :

આદિલકો ભી બુલાયે મરમ્મત કે વાસ્તે
પથ્થર ઉખડ ગયા હૈ ગઝલ કે મઝારકા.

ઝફર ઈકબાલ પ્રયોગશીલ નવી ઉર્દૂ ગઝલના પ્રણેતા છે. એમનાથી ઉર્દૂ ગઝલની કાયાપલટ થઈ. આધુનિક ઉર્દૂ ગઝલમાં એમનું પ્રદાન એવું છે કે, એ *'શાઈરુસ્સોઅરા'* કહેવાય છે. વર્ષો અગાઉ આદિલ મન્સૂરીએ ઝફલ ઈકબાલને સંબોધી લખેલું : નવી ગઝલ શરૂ ગમે ત્યાંથી થઈ હોય, સમાપ્ત તમારા ઉપર થાય છે. ઉર્દૂ ગઝલકારો પર ઝફર ઈકબાલના પ્રભાવનો ઉલ્લેખ કરતાં પ્રેમકુમાર લખે છે : આ એક અજબ *'ફિનોમિનન'* છે કે, તમે એકસાથે ત્રણ પેઢીઓને પ્રભાવિત કરી છે :ન્યુ જર્સી, રસસ્થળો, રગી એક પેઢી જે ખતમ થઈ, એક પેઢી જે ખતમ થઈ રહી છે, અને એક નવી પેઢી જે શરૂ થઈ રહી છે. ઝફર ઈકબાલ સરળ, સહજ બાનીમાં રમતિયાળ શૈલીમાં શેર રચે છે. આનો નિર્દેશ કરતાં એમના મિત્ર ઈફ્તેખાર આરિફ કહે છે : ઝફરભાઈ ! વાત કૈં પણ નથી હોતી અને આપ શેર રચી દો છો, જ્યારે મિત્રો પાસે વાત તો બેશક હોય છે, પણ શેર નથી બનતો.

ઉર્દૂ-ગુજરાતી ગઝલ વિશ્વનો વિશિષ્ટ પ્રયોગ :
ગુજરાતી રદીફોવાળી ઉર્દૂ ગઝલો
સમકાલીન સમર્થ ગઝલકાર

ઝફર ઈકબાલ

બાહર ગલીમેં ચલતે હુવે લોગ થમ ગયે
તન્હાઈયોંકા શોર થા ખાલી મકાનમેં

ઝફર ઈકબાલના આ અને આવા અનેક શેરોથી ઉર્દૂ ગઝલવિશ્વ સુપરિચિત છે. કવિના ૨૭ ગઝલસંગ્રહો તથા ૪ સમગ્ર ગઝલસંગ્રહો ઉર્દૂ ગઝલક્ષેત્રે ધૂમ મચાવી ચૂક્યા છે. લગભગ ચાર દાયકાથીય વધુની તેમની સાથેની મૈત્રીના નાતે તેમને વાત કરી કે " આપ વર્ષોથી પંજાબી, ફ્રેન્ચ, અરબી, સિંધી, હિંદી, સંસ્કૃત શબ્દાવલીનો આપની ઉર્દૂ ગઝલોમાં છૂટથી પ્રયોગ કરી રહ્યા છો તો મારી માતૃભાષા ગુજરાતીનો શો વાંક છે કે આપે તે તરફ ધ્યાન નથી આપ્યું. બે-પાંચ ગઝલો ગુજરાતી રદીફ સાથ ન લખી આપો ?"

પરિણામરૂપે કવિએ જોતજોતામાં ૧૨૧ ગઝલોનો આખો સંગ્રહ ગુજરાતી રદીફ સાથે લખી આપ્યો. ઉર્દૂ અને ગુજરાતી ગઝલક્ષેત્રે આજ સુધી અસંખ્ય સમર્થ ગઝલકારોએ એક બેઠકથી ચાલીસથી ગઝલોની હારમાળા સર્જી છે. અસંખ્ય પ્રયોગો દ્વારા ગઝલના સ્વરૂપની સીમાઓ સતત વિસ્તારી છે.

આધુનિક ઉર્દૂ ગઝલના સમર્થ સમકાલીન પ્રયોગવીર ગઝલકાર ઝફર ઈકબાલની ૧૨૧ તાજા જ તાજા ગઝલો અને તે પણ ગુજરાતી રદીફો સાથે "તરકીબ" નામે પુસ્તકાકારે આપના હાથમાં છે. આ ગઝલો દ્વારા એક નવતર સીમાચિહ્ન ઉમેરાય છે. બન્ને ભાષાઓ, તેના ગઝલકારો વચ્ચે એક વિશિષ્ટ સેતુ રચાય છે. ભાષા અને કવિતાની સીમાઓ વિસ્તરી રહી છે

અમદાવાદના જ એક બીજા સમર્થ સમકાલીન ઉર્દૂ ગઝલકાર મર્હૂમ અલ્વી સાહેબનો એક શેર ઉલ્લેખનીય છે

પતા, નામ ચાહો તો લિખ લો મિયાં
મેરા નામ અલ્વી હૈ, ગુજરાતી હૂં.

ગઝલની ભાષા સંદર્ભે, *ઝુબાં કી પાકીઝગી* - ભાષાની વિશુદ્ધિની આમક માન્યતાએ ગઝલના શબ્દભંડોળને *મહદૂદતર* - વધુ સીમિત કરી દીધું. ગઝલની ભાષા *ઝંગ આલૂદહ* - કટાયેલી થઈ ગઈ. ગઝલમાં પ્રયોજાતા શબ્દનો સિક્કો ઘસાઈ ગયો. ગઝલમાં અમુકતમુક શબ્દો જ પ્રયોજાય આ માન્યતાને ઝફર ઈકબાલે ફગાવી, અને સાબિત કર્યું કે, *હર તરહ કે અલફાઝ ઝુઝવે ગઝલ બન સકતે હૈં.* શબ્દ બજારમાં તેજી આવી. કટાયેલા, ખોટા સિક્કાને ઘસી, ઊજળો કરી ચલણી કર્યો :

રાસ આઈ હૈ મુઝકો ગર્મ બાઝારી મુઝે
લફ્ઝ કી ખોટી ચવન્ની કો ચલા દેતા હૂં મૈં

સ્વરૂપ ચુસ્તતાના દુરાગ્રહને પરિણામે ગઝલ, ઝફર ઈકબાલના શબ્દોમાં, *યક રુખી, યક સતહી, યક પરતી* - એકતરફી, એકસ્તરીય, એક પરિમાણીય થઈ ગઈ. ગઝલ પર *યુબૂસત* - રૂક્ષતા અને *નહૂસત* - અશુભ કાલિમા છવાઈ ગઈ.

અને ઝફર ઈકબાલ ગઝલના પરંપરાગત માળખાને તોડીફોડી એની *આફાક* - ક્ષિતિજોને *વસીઅ* કરવા - વિસ્તારવા પ્રવૃત્ત થયા. એમણે *જદીદ* - નવી ગઝલની ખોજ આદરી. એમની ગઝલોમાં અનુભૂતિની રેન્જ સતત વિસ્તૃત થતી રહી. એમના *તરીકે ઈઝહાર વ બયાં* - અભિવ્યક્તિ અને નિરૂપણશૈલી નાવીન્યપૂર્ણ રહ્યાં. ઝફર ઈકબાલે ગઝલમાં બોલચાલની ભાષા એવી સર્જનાત્મક રીતે પ્રયોજી કે તે *અદબી ઝુબાં* - સાહિત્યિક શૈલીની કક્ષાએ પહોંચી. બોલચાલની ભાષામાં શેર કહેવાનું અત્યંત દુષ્કર છે. વ્યવહારના શબ્દને અભિધાથી મુક્ત કરી એમાં વ્યંજના પ્રગટાવવાનું ભાષાકર્મ સાચો સર્જક જ કરી શકે. ગઝલકાર માટે આમાં ભારોભાર જોખમ છે. શબ્દોના વિનિયોગથી શેરમાં વ્યંજનાપૂર્ણ વિસ્ફોટ થવો જોઈએ. આમ ન થાય તો શેર સુરસુરિયું થઈ જાય, શાયર ભોંયે પછડાય, ઈન્તિઝાર હુસેનના શબ્દોમાં *હડ્ડીપસ્લી* તૂટી જાય, કે હરીશ મીનાશ્રુ કહે છે તેમ, ઢાંઢાં ભાંગી જાય. ઝફર ઈકબાલે આ સાહસ કર્યું. ગઝલમાં નવી ઊંચાઈઓને આંબી અને સહીસલામત નીચે આવી ગયા :

ઉપર આ નહીં સકતે આપ
મૈં હી નીચે આતા હૂં

નીચે આવી એમણે ઉર્દૂ ગઝલના *જદીદતરીન* - નવીનતમ શાયર તરીકે પોતાનું સ્થાન જમાવી દીધું. ઝફર ઈકબાલે ગઝલમાં જે કામ કર્યું તેના માટે એક જ શબ્દ *મુનાસિબ* - ઉચિત, યોગ્ય ગણાય : અપૂર્વ. ઝફર ઈકબાલ નામ ઉર્દૂ નવી ગઝલનો પર્યાય બની ગયું. મુહમ્મદ હનીફ રામે કહે છે તેમ, *ઝફર ઈકબાલ એક*

વાતચીત દરમિયાન આદિલસાહેબના મનમાં એક વિચાર ઝબક્યો. ઝફર ઈકબાલ ગુજરાતી રદીફો પ્રયોજી ઉર્દૂ ગઝલો લખે તો ? સ્વભાવ તરવરિયો એટલે તરત ઝફર ઈકબાલને ફોન જોડ્યો. સામેથી ઝફર ઈકબાલે કહ્યું, અદ્‌ભુત વિચાર. *આઈમ્ ઈક્સાઈટિડ.* ગુજરાતી રદીફો મોકલો, હું કારખાનું શરૂ કરું. પછીના દિવસોમાં આદિલસાહેબને ઈ-મેઈલમાં અઢળક ગઝલો મળવા માંડી.

ઝફર ઈકબાલ પાસે ગુજરાતી રદીફવાળી ઉર્દૂ ગઝલો લખાવવાનું આદિલ મન્સૂરીને જ સૂઝે. આવા પ્રોજેક્ટ વિશે... સંનિષ્ઠ, કવિકર્મ એ જ વિચારી શકે અને એને પાર પાડી શકે.

આ બધાનો હું સાક્ષી. આખી ઘટના મારા માટે એક કૌતુક. સમકાલીન ઉર્દૂ ગઝલનો શ્રેષ્ઠ પ્રતિનિધિ કવિ, ઉર્દૂ ગઝલની સીમાઓ વિસ્તારી આપનાર, ગઝલને નવી બાની અર્પનાર, ઉર્દૂના *'તાઝાતરીન શાઈરોં સે ભી તાઝાતર* શાઇર ગુજરાતી રદીફો પર કેવું કવિકર્મ કરે છે તે મારા કુતૂહલનો વિષય.

❖

ગઝલ સર્જનને આરંભે જ ઝફર ઈકબાલ *તંગના-એ-ગઝલથી* ત્રસ્ત થયેલા. કોઈપણ સંનિષ્ઠ સર્જકને આ સમસ્યા કનડે જ. ગુજરાતી ગઝલક્ષેત્રે હરીશ મીનાશ્રુનું ઉદાહરણ છે. હરીશે ગઝલ લખવાની શરૂઆતના ગાળામાં ગાલિબની પંક્તિના રૂપાંતરે 'ગઝલની તંગ ગલી અમને તંગ રાખે છે'ની ફરિયાદ કરેલી. ગઝલની સ્વરૂપગત મર્યાદાને કારણે જે *'ઘુટન'* - ગૂંગળામણ અનુભવાઈ તેને ઝફર ઈકબાલ આમ વ્યક્ત કરે છે :

કાફિયે કી બન્દ ગલીયોં કા ગદાગર કર દિયા
ઉસને કૈસે કામ પર મુઝકો મુકર્રર કર દિયા

ગઝલની અધકચરી વિભાવના અને પરંપરાગત *પાબન્દીઓએ* ગઝલને *તંગથી તંગતર* બનાવી દીધી. ગઝલનું ભાવવિશ્વ સંકુચિત, સંકીર્ણ, સાંકડું થતું ગયું. એમાં એકવિધતા આવી. જડતા આવી. ગઝલના *મૌઝુઆત* - વિષયવસ્તુ અને *મઝામીન* - વિચારસામગ્રી જીર્ણ, જર્જરિત થઈ ગયા. નવા અવાજો વિલીન થઈ ગયા. ઝફર ઈકબાલના શબ્દોમાં,

કોયલેં મેરી હો ગઈ ખામોશ
મોર બેચાલ હો ગયે મેરે.

આ મૂંગી કોયલને કૂજતી અને પોતાની ચાલ ભૂલી ગયેલા મોરને નાચતો કરવાનું કવિકર્મ ઝફર ઈકબાલના માથે આવ્યું.

આ પતંગિયા પાછળ ભાગતા-દોડતા ઝફર ઈકબાલ હવે ગુજરાતી ગઝલ ઉપવન સુધી આવ્યા છે, ત્યારે આપણા ગઝલસર્જકો, ગઝલભાવકો અને ગઝલવિવેચકોને આ ક્રીડામાં રસ પડશે.

❖

ઝફર ઈકબાલની ગુજરાતી રદીફની ગઝલોમાં એમની સર્જનપ્રક્રિયા કઈ રીતે પ્રતિબિંબિત થાય છે તે તપાસવાનો અહીં ઉપક્રમ છે. કવિ ગઝલના પરંપરાગત બીબાને કઈ રીતે તોડે છે, બોલચાલની ભાષાના સર્જનાત્મક વિનિયોગથી કઈ રીતે કાવ્યત્વ પ્રકટાવે છે, શેરને *જદીદ* બનાવવા અભિવ્યક્તિની તરાહ કઈ રીતે બદલે છે, શબ્દના પ્રચલિત અધ્યાસોને ગાળી કઈ રીતે શબ્દને જ અનુભૂતિ બનાવી દે છે. શબ્દ દ્વારા શબ્દને અતિક્રમી જવાની-ઓળંગી જવાની કવિની મથામણ હોય છે :

અપને લહૂ કી નદિયા હૈ
આજ ઈસે ઓળંગી જા

'ઓળંગી જા' રદીફની ગઝલોમાં ઝફર ઈકબાલના કવિત્વનો સંકેત સુપેરે મળે છે. સામે એકલતાની ખીણ છે. શબ્દના માધ્યમ દ્વારા એને વળોટી જાવ કે અંદર કૂદી મરો એ સિવાય વિકલ્પ નથી :

ખન્દક હૈ તન્હાઈ કી
ગિર મર યા ઓળંગી જા

અને આ ઓળંગી જવા માટેનું પ્રયોજન તો છે જ. સ્વ-ને પામવાનું કે અન્યને પામવાનું.

અપને લીયે નહીં તો ફિર
મેરે લીયે ઓળંગી જા

ગઝલના મકતામાં ઝફર ઈકબાલની લાક્ષણિક હળવાશ પ્રગટ થાય છે :

મુશ્કિલ મેં સો નહીં ઝફર
ઊઠ બૈઠે ઓળંગી જા

'પ્રગટ' રદીફની ચાર ગઝલો છે. અહીં પ્રત્યેક રદીફની એકાધિક ગઝલો મળે છે. ઝફર ઈકબાલની અનુભૂતિની રેન્જ આમાં કારણભૂત છે. 'પ્રગટ'ના એક શેરનું ઊંડાણ અચરજ પમાડે એવું છે. એના ચરણોમાં માથું ટેકવીટેકવી કપાળે આટણ પડ્યું, પણ હવે મારો આ *દાગે જબીં* તેના પગલાની છાપમાં પ્રગટે તો કામ બને :

ઐસા શાઈર હૈ જિસકી બાત ભી નઈ હૈ, લહજા ભી નયા હૈ ઔર ઝુબાં ભી નઈ હૈ. અનીસ નાગી ઝફર ઈકબાલની કવિતાને *નઈ ગઝલ કા દસ્તૂરુલઅમલ* - નવી ગઝલની કાર્યશૈલી કહે છે.

જદીદ ગઝલ ક્યા હૈ ? નવી ગઝલની વિભાવના અને *સેલિઅન્ટ ફીચર્સ* - વિશિષ્ટ લક્ષણોની ચર્ચા મારે મહદ્અંશે ઝફર ઈકબાલના શબ્દોમાં જ કરવી છે. નવી ગઝલની જરૂર શું છે ? એના જવાબમાં ઝફર ઈકબાલ કહે છે. ધડાધડ સંગ્રહો છપાય છે. પરંપરાના માળખામાં ટનબંધી ગઝલો લખાય છે. પણ એમાં ઝાઝી ગુંજાયશ રહી નથી. આજે જે ગઝલો લખાય છે તે *અસાતિઝહ કી રંગારંગ જુગાલી* - ઉસ્તાદોને ભદ્દી રીતે વાગોળવાની પ્રક્રિયા સિવાય કશું નથી. અનુભૂતિ - અભિવ્યક્તિ સંદર્ભે ગઝલ બંધિયાર થઈ ગઈ છે, ત્યારે હવે ગઝલમાં શબ્દનો વૈવિધ્યપૂર્ણ અને નાવીન્યપૂર્ણ વિનિયોગ મૂળભૂત રીતે જરૂરી છે. આ માટે શેર કહેવાનો *સરાસર મુખ્તલિફ પૈરાયહ* - તદ્દન અલગ ઢંગ અપનાવવો પડે.

નવો શેર એટલે એવો શેર જે સીધોસપાટ ન હોય. એ તિર્યક હોય. એમાં *પૈચોખમ* - વળોટ, વક્રતા હોય. સંકુલ હોય.

નવા શેરનું પ્રમુખ લક્ષણ એ કે, એ એકાધિક અર્થચ્છાયાઓ પ્રગટ કરે. એના અર્થઘટનમાં *ઈખ્તિલાફે રાએ* - મતમતાંતરને અવકાશ હોય. એ *કુબુલે આમ* - સર્વસ્વીકૃત ન હોય.

પ્રથમ શ્રવણે, સાંભળતાવેંત ખૂલી જાય તે નવો શેર ન કહેવાય. એમાં એકાદ વાત *અનકહી* - મોઘમ હોય. શેરનો *મકસદ* - પ્રયોજન શું ? કાંઈ નહીં, શેર ખુદ પોતાનું પ્રયોજન છે.

નવા શેરમાં *હૈરત અંગેઝી* - વિસ્મય, આશ્ચર્ય, ચમત્કૃતિ, નિઃસ્તબ્ધતા ભારોભાર હોય, અને આ સદાકાળ હોય. *જો એક બાર જદીદ હૈ વો હમેશાં કે લિયે જદીદ હૈ.*

નવા શેરમાં *તકલીલે ઈઝહાર* - પ્રકટીકરણની ન્યૂનતા હોય. થોડું પ્રગટ હોય બાકીનું પ્રચ્છન્ન.

ઝફર ઈકબાલની ખોજ આવા *જદીદ* શેરની છે. એ હાથતાળી દે છે. હજુ હાથ લાગ્યો નથી. કવિ પોતાની મથામણ આમ વ્યક્ત કરે છે :

મૈં ભાગતા ફિરતા હૂં પે ઢૂંઢ તઆકુબ મેં
વે શેર કી તિતલી હૈ જો હાથ નહીં આતી

મત્લા લિખા વરસાદમાં
સો ઔર ક્યા વરસાદમાં

અને કોઈનો સંગાથ મળી જાય તો :

ફિર લાપતા હો જાયેંગે
મૈં ઔર વો વરસાદમાં

કોઈ કોઈને મળી શકતું નથી એવી હુમન કંડીશનનું નૈરાશ્ય 'પછી શું કરશો ?'માં વ્યક્ત થાય છે. કોઈ આવે પણ નહીં અને તમને કહેણ પણ ન મોકલે તો,

અગર ન આયા પછી શું કરશો
ન હી બુલાયા પછી શું કરશો

આ કોઈ કોઈને મળતું નથી એ વાત એક ઉર્દૂ ગઝલના મત્લામાં ઝફર ઈકબાલ ચોંકાવી દે એટલી સહજતાથી કરે છે :

યહાં કિસી કો ભી કુછ હસ્બે આરઝૂ ન મિલા
કિસીકો હમ ન મિલે ઔર હમકો તૂ ન મિલા

અને મળ્યા પછી પણ :

કરે જો ઘર આકે ભી ઝફર વો
અગર મગર તો પછી શું કરશો

માનવનિયતિની વાત 'બેસી રહો' રદીફની ગઝલના આ શેરમાં આવે છે :

યે ભી હો સકતા હૈ કોઈ ભી ન આયે
ચાહે સારી ઝિન્દગી બેસી રહો

પણ આશા અમર છે તેથી :

શહર પર બરસેંગે ડોલર બેશુમાર
બાદલ એસા છાયેગા બેસી રહો

કોઈ આવશે કે નહીં એ પ્રથમ મૂંઝવણ :

અપના દિયા જલાયે બેઠા છીએ અહીં
વો આયે યા ન આયે બેઠા છીએ અહીં

ક્યારેક આપણા અસ્તિત્વની કોઈ નોંધ જ ન લેવાય. અને એમાં વાંક હોય જોનારના ચશ્માનો :

મેરા દાગે જબીં કભી શાયદ
કુછ તેરે નકશે પા મેં થાય પ્રગટ

અને વળી પાછા 'પ્રગટ' રદીફની અન્ય ગઝલમાં બોલચાલની લઢણ મળે છે :

દૂસરોં સે ન કહેલવા સબ કુછ
આપની ગુફ્તગૂ મેં થાય પ્રગટ

કેટલાક લોકો એવી સિફતથી વાતચીત કરતા હોય છે કે એમના શબ્દો એમનું આવરણ બની જાય છે. એ સ્વયં એમાં વ્યક્ત, પ્રગટ થતા નથી.

'વરસાદમાં' રદીફની ચાર ગઝલો છે. આપણે ત્યાં આદિલે વરસાદમાં 'હવા પલળી જવાની', રમેશ પારેખે 'સાનભાન હાલકડોલક' થવાની, અને હરીશ મીનાશ્રુએ 'મોરના ડાબા ઓગળીને શાહી' બની જવાની વાત કરી જ છે. વરસાદમાં બધાને આવું બધું થતું હોય છે. ઝફર ઈકબાલ કહે છે :

ફિર એક જૈસા હાલ હૈ
મેરા તેરા વરસાદમાં

પ્રિયતમાનો વાયદો પણ ચોમાસામાં વાદળાં થાય એવો. ક્યારે વરસે એની રાહ જોવાની :

મૈંને કહા કબ મિલિયેગા
ઉસને કહા : વરસાદમાં

વરસાદમાં થતી સામાન્ય ઘટનાને બોલચાલની ભાષામાં વ્યક્ત કરીને ઝફર ઈકબાલ એમાં કાવ્યત્વ સિદ્ધ કરે છે. શેરમાં વાત પરદા હટવાની છે, પણ આ માત્ર બારીના પરદા નથી. વરસાદની માદકતા આપણા સંવેદન આડે જે પરદા છે તેને હટાવે છે :

તાને હુએ કબ કે ઝફર
પરદે હટે વરસાદમાં

સામે ચાલી વરસાદમાં પલળવાની મજા ન લઈએ તો ઝડીમાં અનાયાસે પકડાઈ જવાની પણ મજા હોય છે :

અચાનક હુવા પકડે ગયે
તુમ ભી ઝફર વરસાદમાં

કવિ એકલોઅટૂલો હોય તો વરસાદમાં બીજું શું થાય ?

ફુદીનાનું ખેતર ભાંગ થઈ જાય એવી ભંગેડી ઇચ્છા પણ ક્યારેક થતી હોય છે :

ખેત પુદીને કા સારા
ભંગ થઈ જાય તો સારું

બલ્બ ઝગઝગાટ હોય છતાં ઘરમાં અંધકાર છવાયેલો રહે એમ બને :

બલ્બ તો રોશન રહે ઝફર
કચું કર હુવા મકાં અંધકાર

ઝફર ઇકબાલના શેરોમાં ચમત્કૃતિ ભારોભાર છે. એ જેના વિશે જે રીતે શેર કહે છે તે ભાવકને ચોંકાવી દે છે. પોપટ ઊડી જાય એ ઘટના તો સામાન્ય છે, પણ આ કવિ તો અડધા પોપટને જ ઊડવા દે છે. બાકીનો અડધો આપણી આંખો સામે ફફડતો રહે છે :

આધા હી બાકી હૈ ઝફર
આધા પોપટ ઊડી ગયો

પોપટ જ શું કામ ? માણસ પણ અડધોપડધો હોય છે :

સર અગર હૈ તો પાંવ હૈ ગાયબ
પાંવ હોંગે તો સર નહીં હોતું

કોઈનું મોં પણ ન જોવાના સોગંદ ખાધા પછી ઝફર ઇકબાલ આપણને નિઃસ્તબ્ધ કરી દે એવો પ્રશ્ન પૂછે છે :

ઉસકો ન દેખને કી કસમ યું તો ખાઈ હૈ
આયા જો ઉસકા ખ્વાબ તો કોને કહીશ તું ?

ઝફર ઇકબાલની ગઝલોનું એક લક્ષણ બેતકલ્લુફી – અનૌપચારિકતા જેને વિવેચકો લફંગાપણું કહે છે. પોપટ ઊડી જવાનાં અનેક કારણો હોઈ શકે પણ ઝફર ઇકબાલ જે કારણ આપે છે તે,

પોપટીયોં કે તઆકુબમાં
લોફર પોપટ ઊડી ગયો

કવિ પ્રેમનો મહિમા પણ અનૌપચારિક રીતે ગાય છે :

સિગારેટને કુછ મઝા ન દિયા દેર તક મુઝે
કડવા લગા થા પાન તમારા ગયા પછી

ઐનક નઈ લગાઓ બેઠા છીએ અહીં
હમકો જો દેખ પાઓ બેઠા છીએ અહીં

ઝફર ઇકબાલ પરાયા તેજે પ્રકાશવા કે બીજાનાં તેલે પોતાનો દીવો બાળવા તૈયાર નથી :

બાદલ આયે તો ગાયબ હૈ, શામ પડે તો ભી હૈ ગાયબ
અપના રંગ જમાયે રખના, સૂરજનો વિશ્વાસ ન કરવો

ગઝલમાં ગઝલકારનો પોતીકો રંગ પ્રકટે, એની સ્વકીય મુદ્રા અંકિત થાય એ જ મહત્ત્વનું છે. જો આમ ન થાય તો ઝફર ઇકબાલમાંનો વિવેચક ઝફર ઇકબાલમાંના કવિનું સર્જન ઉકરડે નાંખી આવે :

કૂડે પે ફેંક આયા હું મૈં ખુદ ઉસે ઝફર
થા આપકા કલામ મને કંઈ ખબર નથી

માણસ આખો, અકબંધ, સમગ્ર, સાબૂત રહેતો નથી. એ વિચ્છિન્ન થાય છે, તૂટી જાય છે. પોતાની *ડિસિન્ટિગ્રેટ* થવાની પ્રક્રિયાનો સાક્ષી પોતે જ બને છે :

મેરે ટૂકડે સે હોતે રહે દેર તક
ફિર બિખરતા રહા આંખ જોતી રહી

અને જીર્ણશીર્ણ થવાનું તો માણસમાં ઇન-બિલ્ટ છે જ :

મેરે અંદર હી ઇક મેરે જૈસા કોઈ
સડતા ગલતા રહા આંખ જોતી રહી

ગઝલમાં રૂઢ થયેલા ભાવો પણ ઝફર ઇકબાલની નાવીન્યપૂર્ણ અભિવ્યક્તિને લીધે તાજપનો અનુભવ કરાવે છે. પ્રિયતમાની સરખામણીએ પ્રીતમ પોતાને તુચ્છ ગણે છે :

તુમ્હારી કહાની રહી સબસે અચ્છી
હમારા ફસાના વગેરે વગેરે

ક્યારેક માણસ એ રીતે પરવશ થાય છે કે અન્ય માણસ એનું પાંજરું બની જાય :

ફડફડાઉંગા અબ યહાં, કે હૈ
તૂ મેરા કફસ હું કહું તને

માણસ માલિક સામે ન નમે એમાં અહંકાર, આળસ, અજ્ઞાન કારણભૂત હોય પણ ઝફર ઇકબાલ કહે છે :

જિસ્મ અકડા હુવા હૈ સરદી સે
સર તેરે આગે ખમ નહીં હોતું

અહીં પણ અકડ઼ તો છે જ, પણ જુદા પ્રકારની. કોઈ કહે ક્યારેક ઘરે આવો અને આપણે કહીએ કે, તમારું ઘર છેટે છે હવે એટલું ચલાતું નથી, એ વાતમાં કવિ અસલ ઘરનો સંકેત ઉમેરે છે :

કુછ ઇતના સફર સમસે હોતા નહીં
કે ઘર હી તુમ્હારા બહુ દૂર છે

વ્યવહારની વાતને રોજિંદી ભાષામાં મૂકી ઝફર ઇકબાલ કવિતા બનાવે છે. ફિલિપ લાર્કિન કહે છે કે, આજે કવિતામાં *પોએટિક સબ્જેક્ટ* – ઉદાત્ત વિષય કે *પોએટિક ડિક્શન* – કાવ્યમય શૈલીની અપેક્ષા કોઈ રાખતું નથી.

❖

ઝફર ઇકબાલ ગુજરાતી રદીફ પ્રયોજી ગઝલો લખે અને એનો સંચય પ્રગટ થાય એ ઘટનાનું ગુજરાતી ગઝલક્ષેત્રે તાત્પર્ય શું ? એની *સિગ્નિફિકન્સ* – મહત્તા શી ? એના *ઇમ્પ્લિકેશન્સ* – સૂચિતાર્થો શા ? સંનિષ્ઠ ગઝલસર્જકો અને વિવેચકોના મનમાં આવા પ્રશ્નો ઉદ્‌ભવે એ સહજ છે. આંખે ડાબલા બાંધી બેઠેલા ગઝલશાસ્ત્રીઓને આ ઘટના *ગિમિક* – ગતકડું લાગે. રિવાયતની રઢ લઈને કે ઉસ્તાદની કંઠી બાંધીને ન બેઠા હોય તેવા મુક્તાત્માઓને આમાં ગુજરાતી ગઝલની ક્ષિતિજો વિસ્તરતી દેખાય.

ગુજરાતી ગઝલને સવાસો વર્ષ થયાં. આ ગાળા દરમિયાન ગઝલની સ્વરૂપલક્ષી ચર્ચા થઈ તે ઉપરછલ્લી અને ચીલાચાલુ રહી. ઉર્દૂ પ્રેરિત તો ખરી પણ ઉદાહરણોમાં જિગર, ફૈઝથી આગળ નહીં. ગુજરાતી ગઝલની પરંપરામાં બે-પાંચ મળતિયા ગઝલકારોનો ઉસ્તાદ તરીકે ઉલ્લેખ થાય, તેમની આણ અપાય, તેમના પ્રત્યે અહોભાવ પ્રકટ કરી કૃતકૃત્યતા અનુભવાય, પણ તેમના સંદર્ભે ગઝલની તાત્ત્વિક ચર્ચા ન થાય. આવા પરિપાટિયા ગઝલવિવેચકો માટે *તરકીબ* એક આહ્‌વાન બનશે.

રૂઢિદાસો ગઝલ વિશેની પોતાની વિભાવના તથા *ફૂઝ* અને *ડોન્ટ્સ* પોતાના સુધી સીમિત રાખે ત્યાં સુધી વાંધો નહીં. પરંતુ ગઝલના આ ઠેકેદારો

અને પોતાની વિલક્ષણ શૈલીમાં પ્રેમની બીજી શક્યતા પણ ચીંધે છે :

જો આયા થા કરને સલામે મોહબ્બત
ગયા દે કે ગાલી વગેરે વગેરે

ગૃહસંસારની વાસ્તવિકતા તો ઝફર ઇકબાલ આપણે ખાઇએપીએ એટલી સહજતાથી દર્શાવે છે :

પીતે પીતે ચાય વો રોને લગી
ખાતે ખાતે ભાત મૈં હસતો રહ્યો

ઝફર ઇકબાલે ગઝલને *શાઇરાના ઝુબાં* – લલિત, પ્રાસાદિક, કવિતાશૈલીની ભ્રામક માન્યતામાંથી મુક્ત કરી અને બોલચાલની ભાષામાં કાવ્યત્વ સિદ્ધ કરી બતાવ્યું. આ બાનીને લીધે અભિવ્યક્તિ હળવી, સહજ, રમતિયાળ બને છે. શેર વાંચી આપણે વિમાસીએ છીએ કે, કવિ ગંભીર છે કે મજાક કરે છે ? બિલી કોલિન્સ આને *આઇડિયલ પોએમ* – આદર્શ કાવ્યનું લક્ષણ ગણાવે છે. *ધ રીડર કુડ નેવર બી સ્યુઅર ઇફ ધ પોએમ વેર સીરિઅસ્ ઓર ટ્રાઇફ્લિંગ* – કાવ્ય પ્રગલ્ભ છે કે ક્ષુલ્લક ? ઝફર ઇકબાલ પૂછે છે :

ચાહે ઔર હંસ શું કહું તને
ખુદ ગયા હું ફંસ શું કહું તને

કવિ ફસાયા અને આપણે હસવું કે રડવું એની દ્વિધામાં છીએ. આવી જ સ્થિતિ દાદી-પૌત્રીના સંવાદમાં છે :

પોતી ચિલ્લા કર બોલી
દાદી પોપટ ઊડી ગયો

કોઈની ઉપસ્થિતિ કેટલી શીતળ હોય છે તે વાત કવિ હવામાનની વાત કરતા હોય એટલી સહજતાથી કરે છે :

બારિશવાલા બાદલ બનકર
મુઝ પર છાયા ભરબપ્પોરે

ઇચ્છિત વસ્તુ તો હોય છે પણ એ જ્યાં હોય ત્યાં આપણે નથી હોતા એ વિડંબનાને કવિ વાતચીતના લહેજામાં વ્યક્ત કરે છે :

મૈં જો હોતા હું તબ નથી હોતું
વો વહાં વરના કબ નથી હોતું

ગુજરાતી ગઝલમાં આ 'વળાંક' (૧૯૬૩) આદિલ મન્સૂરીથી આવ્યો. મનહર મોદી, મનોજ ખંડેરિયા, ચિનુ મોદી, શ્યામ સાધુ, રાજેન્દ્ર શુક્લ, રમેશ પારેખ, હરીશ મીનાશ્રુ આદિ ગઝલકારોએ ગુજરાતી ગઝલના ભાવવિશ્વને વિસ્તાર્યું. અભિવ્યક્તિમાં આપણી ભાષાની વિવિધ લઢણો, તરાહો પ્રયોજી ગઝલની નિરૂપણશૈલી બદલી. પરંતુ કાળક્રમે નવી ગઝલમાં પણ કેટલાક ભાવો અને અમુકતમુક શબ્દો રૂઢ થતા ગયા. ગઝલોમાં પુનરાવર્તન થવા લાગ્યાં. એકવિધતા આવી. ગઝલ ચોકઠાબંધ થઈ. ગઝલસ્વરૂપની ગુંજાઈશ જાણે ઇગ્ઝોસ્ટ થઈ ગઈ એમ લાગ્યું. નવી ગઝલ નવી ન રહી.

પણ આ ગઝલનો ડેડ્-એન્ડ - રસ્તો બંધ નથી. અનુભૂતિ અભિવ્યક્તિ સંદર્ભે ગઝલસ્વરૂપની શક્યતાઓ અનંત છે. શરત એ કે, સજાગ ગઝલસર્જકો ગઝલના નવસંસ્કરણની પ્રક્રિયા સતત ચાલુ રાખે. પરિષ્કૃત ગઝલની ખોજ સતત ચાલતી રહે. ગઝલને નવીન-નવીનતર-નવીનતમ બનાવવાનો પુરુષાર્થ અવિરત જારી રહે.

જદીદ ગઝલની ખોજ એ જ ઝફર ઈકબાલનું *મિશન*. એમના પોતાના શબ્દોમાં કહીએ તો, *મૈં ખુદ જદીદ શેર કી જુસ્તજુ મેં શુરુઅ હી સે રહા હૂં*. ગુજરાતી ગઝલને જીવંત રાખવા, વાઇબ્રન્ટ ધબકતી રાખવા ઝિંદાબાદ-મુર્દાબાદ નહીં, પણ આવી પ્રયોગશીલ સર્જકચેતના અને *ઇમ્પેશન્ટ્ સ્પિરિટ્* - ઉત્સુક-અધીરો જીવ અપેક્ષિત છે.

સાચો સર્જક ગઝલ એને જે સ્વરૂપે મળી તે અવધારિત વિભાવના સાથે એને સ્વીકારી પૂર્વસૂરિએ આંકેલા *બીટન પાથ* - ટીપાયેલા ચીલે પોતાનું ગાડું ગબડાવે એ શક્ય નથી. એ સ્વરૂપ સાથે મથામણ કરશે, એની *રિજિડિટી* - જડતા તોડશે, એને લવચીક બનાવશે. એની ગુંજાઈશને તાગશે, એની સીમાઓને વિસ્તારશે, ઉસ્તાદોએ આંકેલી *બાઉન્ડરીના* પથ્થર હટાવી એનાથી આગળનું નિશાન તાકશે. આ કવિકર્મને પરિણામે એ ગઝલસર્જનમાં પ્રવૃત્ત થયો ત્યારે એને જેવી ગઝલ મળેલી તેવી જ એ નહીં રહે. ગઝલ બદલાશે. ગઝલનું નવસંસ્કરણ થશે, પુનર્યોજન થશે, સ્વરૂપપરિવર્તન થશે. અજિત ઠાકોરના શબ્દોમાં ગઝલ પરિષ્કૃત થશે. ઝફર ઈકબાલનો શેર છે :

કભી જૈસા વો મિલા થા મુઝકો
ઉસે વૈસા નહીં છોડા મૈંને

બોલ્ટન, યુકે
જાન્યુઆરી ૨૦૦૮

અન્ય પ્રયોગશીલ સર્જકોને પણ ડારતા હોય છે. ગઝલ વિશેની પોતાની વિભાવના અન્યો પર થોપે છે, અને આ લખાય આ ન લખાયનાં હુકમનામા બહાર પાડે છે. ઓગણીસસો પંચોતેરના ગાળામાં એક મુશાયરામાં નવોદિત તરીકે મેં ગઝલ રજૂ કરેલી તેમાં એક શેર આ હતો :

આજ પગલાની છાપ પાડી જા
આજ પીગળ્યો છે રોડનો ડામર

શેરને શ્રોતાઓની દાદ મળી, પણ એક ઉસ્તાદ શાયર ખિજાયા. મુશાયરા પછી એમણે મને કહ્યું કે, ગઝલના શેરમાં ડામર શબ્દ કેમ પ્રયોજે છે? આવા શબ્દપ્રયોગથી ગઝલબાની વિકૃત થાય છે. પછી સત્તાવાહી અવાજે ફરમાવ્યું, આ શેર રદ કરજે. ત્યારે મને ઉસ્તાદના આદેશ સામે કોઈ બચાવ સૂઝેલો નહીં. ત્રણ દાયકા પછી ઝફર ઈકબાલની ગઝલોમાં આનો જવાબ જડ્યો :

મૈંને પૂછા થા : હૈ કોઈ સ્કોપ ?
મુસ્કુરા કર કહા ગયા, નો હોપ

ભાષાકર્મથી અજ્ઞાન વિવેચકોએ કાગારોળ કરી કે, ઝફર ઈકબાલ *શાઇરાના ઝુબાં બિગાડ રહે હૈં. ગઝલગોઈ તર્ક કરકે હઝલગોઈ કર રહે હૈં*. આના પ્રતિભાવરૂપે પોતાની વિલક્ષણ શૈલીમાં ઝફર ઈકબાલે આ શેર કહ્યો :

ઝફર યે વક્ત હી બતલાયેગા કે આખિર હમ
બિગાડતે હૈં ઝુબાં યા ઝુબાં બનાતે હૈં

ઝફર ઈકબાલની ગઝલ ઉર્દૂની *રિવાયતી* ગઝલવિભાવના અને ઉસ્તાદોની આદેશાત્મક ગઝલબાની માટે પડકારરૂપ છે. હવે આ આહ્વાન ગુજરાત સુધી પહોંચ્યું છે. તરકીબ વાંચી આપણા પરંપરાવાદી ગઝલશાસ્ત્રીઓ તથા વિવેચકો કોચલામાંથી બહાર આવે, નાકની દાંડીથી આગળ જુએ અને ગઝલસ્વરૂપ વિશેની પોતાની વિભાવના તથા જડબેસલાક ગૃહીતોની ફેરતપાસ માટે પ્રવૃત્ત થાય એવી અપેક્ષા જાગે છે.

ગઝલવિવેચન પ્રભાવિત થાય એ તો આ સંગ્રહની ઉપપેદાશ ગણાય. આપણી મૂળ નિસબત તો ગઝલસર્જન સાથે. કવિતા ખોજ છે, પ્રવાસ છે. આ પ્રવાસ સીધી લીટીમાં નથી, તિર્યક છે. ઝફર ઈકબાલ કહે છે તેમ, એમાં દિશા બદલાય છે, વળાંક આવે છે :

યે સફર વો હૈ કે હૈ ઇસકે તકાઝે ભી નયે
કભી રહબર, કભી રસ્તા, કભી રફ્તાર બદલ

اولے پڑے ورساد ماں
سر کیا منڈے ورساد ماں

اُس نے مجھے کچھ جس میں
میں نے اُسے ورساد ماں

بیمار ہیں جو گئے تھے
اچھے بھلے ورساد ماں

میں ہجر کاٹا ہے بہت
آ جایئے ورساد ماں

اک دوسرے کی لیں خبر
فرصت کے ورساد ماں

بجلی کڑکتی ہے تری
میرے لیے ورساد ماں

یہ چاند کیوں روشن ہے، جب
تارے چھپے ورساد ماں

پھر دیر تک نکلے نہیں
ایسے چھپے ورساد ماں

تانے ہوئے کب کے، ظفر
پردے بٹے ورساد ماں

☆

ورساد ماں: برسات میں

ڈوبا ہے شہر ورساد ماں
کچھ تو بھی کر ورساد ماں

بادل کے ہی ساتھ آئے گی
اُس کی خبر ورساد ماں

اس طرح سے ہی کٹے گا
سارا سفر ورساد ماں

پانی رکا تو آؤ گے
تم بھی نظر ورساد ماں

کچھ تو بھگو لیں جان و دل
کچھ تو ٹھہر ورساد ماں

بوسے میں پانی مل گیا
آغوش بھر ورساد ماں

میں گو بگو آندھی میں ہوں
تُو در بہ در ورساد ماں

میں ہوں اِدھر بوچھار میں
تُو ہے کدھر ورساد ماں

اچھا ہوا، بچھڑے گئے
تم بھی، ظفر، ورساد ماں

☆

خود ہی وہ آ جائے گا، بے سی رہو
ساتھ خوشیاں لائے گا، بے سی رہو

ڈیٹ مارے گا تمھارے ساتھ بھی
چار دن شرمائے گا، بے سی رہو

ساتھ خود ہی لائے گا وایاگرا
یوں تشفی پائے گا، بے سی رہو

شہر پر برسیں گے ڈالر بے شمار
بادل ایسے چھائے گا، بے سی رہو

انتظار اچھا ہے، کرنا چاہیے
ایک دن تو آئے گا، بے سی رہو

گم نہیں کرنا تو پھر ملنا ہے کیا
کھوئے گا، سو پائے گا، بے سی رہو

ظلم کرتا ہے تو سہ جاؤ کہ وہ
آپ ہی پچھتائے گا، بے سی رہو

راہ پر آتا ہے اُس کو ایک دن
چار دن ترخائے گا بے سی رہو

رو رہا ہے اپنا رونا ہی ظفرؔ
روتے روتے گائے گا، بے سی رہو

☆

بے سی رہو: بیٹھے رہو

کچھ ہو نہ ہو ورساد ماں
بے سی[1] رہو ورساد ماں

کیسی بہانے بازیاں
کیا گومگو ورساد ماں

کوئی اشارہ ہی سہی
کچھ تو کہو ورساد ماں

گھر میں سکھا لیں گے کہیں
بھیگا ہے جو ورساد ماں

آتا ہوں وحشت میں بہت
مجھ سے بچو ورساد ماں

گھر میں چھپا بیٹھا ہوں اب
میں آپ تو ورساد ماں

یا جاگ باہوں میں مری
یا ساتھ سو ورساد ماں

پھر لاپتا ہو جائیں گے
میں اور وہ ورساد ماں

ہم تو روانہ ہیں، ظفرؔ
تم بھی چلو ورساد ماں

☆

۱۔ بے سی: بیٹھے

کیسی جلدی ہے کوئی ، بے سی رہو
اور تھوڑی دیر ابھی بے سی رہو

وقت ایسے ہی کٹے گا آج تو
اُٹھ کھڑے ہو اور کبھی بے سی رہو

میں جو بیٹھا ہوں زمانوں سے یہاں
اس طرح سے آپ بھی بے سی رہو

یہ بھی ہو سکتا ہے کوئی بھی نہ آئے
چاہے ساری زندگی بے سی رہو

اور تو سارے کھسکنے کو ہیں اب
چند لمحے آپ ہی بے سی رہو

چل دیے ہو اُٹھ کے اُس کی ڈانٹ پر
اس میں کیا شرمندگی، بے سی رہو

تھک گئے تو لیٹ بھی سکتے ہو تُم
ورنہ بہتر ہے یہی ، بے سی رہو

گھوم پھر کر پھر یہیں آ جائیں گے
ہم تو جاتے ہیں ، تُمھی بے سی رہو

کُچھ نہ کُچھ ہونے ہی والا ہے ، ظفر
صرف دم سادھے ذری بے سی رہو

☆

کون آیا ہے آدھی راتے
در بُلایا ہے آدھی راتے

شام سے مُنہ پھُلائے بیٹھا تھا
مُسکرایا ہے آدھی راتے

جیسے دل کھول کر برستا ہو
مجھ پہ چھایا ہے آدھی راتے

شام سے پہلے اُس کا باوا تھا
اُس کا تایا ہے آدھی راتے

کُچھ بگاڑا ہے ، اور ، اُس کے بعد
کُچھ بنایا ہے آدھی راتے

اور خاموش رہ نہ سکتے تھے
غل مچایا ہے آدھی راتے

زورشور اپنا تو رہا قائم
سر جھکایا ہے آدھی راتے

حسبِ دستور پھر کسی شے میں
کُچھ ملایا ہے آدھی راتے

ایک پودا سا اس زمیں پہ ، ظفر
کیا اُگایا ہے آدھی راتے

☆

آدھی راتے : آدھی رات کو

یہ جو باہر ہے آدھی رات
وُہی اندر ہے آدھی رات

آئنہ خانہ تماشا کو
دل ہی پتھر ہے آدھی رات

شام تک جو کہیں نہ تھا یکسر
وُہ برابر ہے آدھی رات

مجھے اس کا یقین کیوں کر آئے
وُہ مرے گھر ہے آدھی رات

درد کم ہو رہا ہے شام کے بعد
حال بہتر ہے آدھی رات

میری مرضی سے پھوٹتا ہے جو خون
تُو وُہ نشتر ہے آدھی رات

جس کا ہونا تھا اس قدر مشکوک
وُہ سراسر ہے آدھی رات

میں کسی پر سوار ہوں، لیکن
بوجھ مجھ پر ہے آدھی رات

کوئی تصویر بن رہی ہے، ظفر
کوئی منظر ہے آدھی رات

☆

کس کو آنا ہے آدھی رات
اُس کا طعنہ ہے آدھی رات

کیا زمین آسمان ہیں غائب
کیا زمانہ ہے آدھی رات

وُہ نہ جانے کہیں کہ میں نے اُسے
کچھ بتانا ہے آدھی رات

جائے گا صبح تک، یہی اُس کا
جو بہانہ ہے آدھی رات

شام سے ہو رہا ہے جو تعمیر
اُسے ڈھانا ہے آدھی رات

واپسی کا نہیں کوئی امکان
جہاں جانا ہے آدھی رات

خرچ کرنا ہے اُس کو جی بھر کر
کچھ بچانا ہے آدھی رات

سر کے نیچے تھا جو بچھونا سا
شامیانہ ہے آدھی رات

تھا نیا جو شروعِ شب پہ، ظفر
وہ پُرانا ہے آدھی رات

☆

بار بار مون بولے چھے
بے شمار مون بولے چھے

کوئی بات کر نہیں رہا
بے قرار مون بولے چھے

گونج ماں رہا ندی کا شور
آر پار مون بولے چھے

ذائقہ ہے ، اور ، اس دفعہ
مزے دار مون بولے چھے

ہر طرف کترتی کاٹتی
تیز دھار مون بولے چھے

کونج کونج ہے سفر سفید
ڈار ڈار مون بولے چھے

آئے گی پلٹ کے پھر صدا
کوہسار مون بولے چھے

جھاگ جھاگ ہے فصیلِ خون
آبشار مون بولے چھے

کب کی تھی رُکی ہوئی ، ظفر
لگاتار مون بولے چھے

☆

جل ترنگ مون بولے چھے
انگ انگ مون بولے چھے

جنگلوں میں شور مچ اُٹھا
کیا وہنگ مون بولے چھے

ہیں کُھلی کُھلی سماعتیں
تنگ تنگ مون بولے چھے

سرسرا اُٹھا ہے آسماں
کیا پتنگ مون بولے چھے

دُور دُور گنگناہٹیں
سنگ سنگ مون بولے چھے

ہر طرف دھمال کا سماں
یا ملنگ مون بولے چھے

اعتبار کون کرے گا
عذر لنگ مون بولے چھے

کوئی کان دھر نہیں رہا
بے اُمنگ مون بولے چھے

میں بھی حیرتوں میں گم ، ظفر
وہ بھی دنگ مون ، بولے چھے

☆

نال نال مُوں بولے چھے
بے مثال مُوں بولے چھے

تھاپ کی اُمید میں یہاں
تھال تھال مُوں بولے چھے

لفظ لاحقے ہیں بے زباں
حرفِ حال مُوں بولے چھے

درمیاں سے سُنے کوئی
خال خال مُوں بولے چھے

پیڑ پیڑ گا رہی ہوا
ڈال ڈال مُوں بولے چھے

ہاتھ کی صفائی ہے تمام
گول مال مُوں بولے چھے

یا جواب دے رہا ہوں میں
یا سوال مُوں بولے چھے

حیرتوں میں گم ہر ایک خواب
ہر خیال مُوں بولے چھے

رنگ ہے ہر ایک شے، ظفر
سارا سال مُوں بولے چھے

☆

بے تکان مُوں بولے چھے
اور، ہر آن مُوں بولے چھے

بولتی ہے کچھ مکین چُپ
کچھ مکان مُوں بولے چھے

بولتی زمین سے الگ
آسمان مُوں بولے چھے

لہر لہر میں کہانیاں
بادبان مُوں بولے چھے

ہونٹ لال لال ہیں غضب
اور، پان مُوں بولے چھے

کچھ خبر کسی کو بھی نہیں
بے نشان مُوں بولے چھے

دو جہان میں ہے تھرتھری
اک جہان مُوں بولے چھے

پھر وُہی اشارے اور کنایے
بے زبان مُوں بولے چھے

رنگ ہے بیان کا، ظفر
یا بیان مُوں بولے چھے

☆

باغ سارا ہوا میں تھا پرگٹ
اور ، خدائی خدا میں تھا پرگٹ

میرے اندر سے کچھ نکل آئے
یا کہیں کیا سے کیا میں تھا پرگٹ

میں الگ سے کروں نمود اپنی
تو کہیں سے خدا میں تھا پرگٹ

غنچہ غنچہ کہیں بہار بدن
سازباز قبا میں تھا پرگٹ

میرا داغِ جبیں کبھی شاید
کچھ ترے نقشِ پا میں تھا پرگٹ

رنگ پھر وہ نیا نرالا سا
ایک انوکھی فضا میں تھا پرگٹ

راز آخر ترے نہ ہونے کا
ہر ہما و شما میں تھا پرگٹ

میرے خواب و خبر کا مال و منال
میرے دستِ رسا میں تھا پرگٹ

ذرہ ذرہ بکھر چکا ہے ، ظفر
تاکہ اب جا بجا میں تھا پرگٹ

☆☆

تھاپرگٹ: ظاہر ہو

میرے خواب ہنر میں تھا پرگٹ
چاہے گھر ہی سفر میں تھا پرگٹ

کسی دن تیری ایک دستک سی
میری زنجیرِ در میں تھا پرگٹ

دن کا ٹکڑا سا میری جیب میں ہے
یہ کہیں رات بھر میں تھا پرگٹ

پھول پتے تو ہیں بہت ، لیکن
کچھ ہوا بھی شجر میں تھا پرگٹ

میرا بے سمت کا مسافرِ دل
اب کسی رہگذر میں تھا پرگٹ

ایک دھن بھی سمائی ہو دل میں
ایک سودا بھی سر میں تھا پرگٹ

میرا صبر و سکوں اگر ہے کوئی
میرے دل کے بھنور میں تھا پرگٹ

تو خزانہ ہے اک عجب کوئی
اپنے ہی مال و زر میں تھا پرگٹ

یہ ، ظفر ، بات کا بتنگڑ ہے
سخن مختصر میں تھا پرگٹ

☆☆

رنگ ایسا لہو میں تھا پرگٹ
راستہ جستجو میں تھا پرگٹ

دُوسروں سے نہ کہلوا سب کچھ
آپ بھی گفتگو میں تھا پرگٹ

تُو مرے دائرے میں آ کسی دن
اور، اس رنگ و بُو میں تھا پرگٹ

کبھی دکھلا روانیاں اپنی
رات کی آبجو میں تھا پرگٹ

کچھ مری حسرتوں میں شکل دکھا
کچھ مری آرزو میں تھا پرگٹ

مَیں خسِ خواب ہُوں، شرر ہے تُو
بھلے اپنی ہی خُو میں تھا پرگٹ

سامنے آ کے بیٹھ جا کسی دن
بالہ دُوبدُو میں تھا پرگٹ

عکس اپنا انڈیل کر مجھ ماں
ایک دم رُوبرُو میں تھا پرگٹ

پھیلتا جا رہا ہے زخم، ظفر
کبھی خوابِ رفو میں تھا پرگٹ

☆

جسم کے آرپار تھا پرگٹ
اور، پھر بار بار تھا پرگٹ

دے مجھے بھی حساب پانی کا
سامنے بے کنار تھا پرگٹ

کبھی آ سادگی میں ہی اپنی
اور، کبھی رنگدار تھا پرگٹ

در دریچے میں ہی دکھائی دے
یا سرِ رہگزار تھا پرگٹ

میرے سر میں فتور بن کے آ
میرے دل میں فشار تھا پرگٹ

اتنا صبر و سکوں نہیں اچھا
کسی دن بے قرار تھا پرگٹ

کبھی میرے شمار میں بھی آ
اور، بن کر قطار تھا پرگٹ

کبھی آغازِ آرزو میں چمک
کبھی پایانِ کار تھا پرگٹ

تُو ظفر کو نظر نہ آئے گا
آگے پیچھے ہزار تھا پرگٹ

☆

رہا سہا اوڈنگی جا
دُکھ دریا اوڈنگی جا

گہرائی چوڑائی چھوڑ
زور لگا ، اوڈنگی جا

اس دیوار محبت کو
بہر خدا اوڈنگی جا

دل ماں کوئی بات نہ رکھ
کہا سُنا اوڈنگی جا

روک رُکاوٹ جو بھی ہو
ذرا ذرا اوڈنگی جا

خندق ہے تنہائی کی
گر مر ، یا اوڈنگی جا

ندیاں نالے ہیں سب ایک
جا بےجا اوڈنگی جا

ہمواری کی رکھ اُمید
بھلا بُرا اوڈنگی جا

نیند نشے سے جاگ ، ظفر
خواب سرا اوڈنگی جا

☆

اوڈنگی جا: پھلانگ جا

ملے جلے اوڈنگی جا
وہ اور یہ اوڈنگی جا

ہٹتا نہیں جو رستے سے
اُس پر سے اوڈنگی جا

اور نہیں کوئی صورت
ٹھہر اب ، اوڈنگی جا

ہمت ہے تو یہ دیوار
کھڑے کھڑے اوڈنگی جا

اپنے لیے نہیں تو پھر
مرے لیے اوڈنگی جا

کوئی کہے رُک جا دم بھر
کوئی کہے اوڈنگی جا

اپنے لہو کی ندیا ہے
آج اسے اوڈنگی جا

بھاگ کے آ پیچھے سے یوں
واہ ترے ، اوڈنگی جا

مشکل میں سو نہیں ، ظفر
اُٹھ ، بیٹے! اوڈنگی جا

☆

اپنا دیا جلائے بیٹھا اچھے ایں
وہ آئے یا نہ آئے بیٹھا اچھے ایں

پچکارتے ہیں آتے جاتے مسافروں کو
دھونی سی اک رمائے بیٹھا اچھے ایں

ہمت ہی اپنے اندر باقی نہیں ، کوئی
آ کر ہمیں اُٹھائے بیٹھا اچھے ایں

باہر کہیں ڈھونڈورا تم پیٹتے ہو کیا
گھر ہی میں اب تو ہائے ، بیٹھا اچھے ایں

کل رات شہر بھر پر کیا کیا گزر گئی
کوئی تو آ بتائے ، بیٹھا اچھے ایں

اپنے ہی دل کے اندر محفوظ ہیں بہت
کوئی نہ دیکھ پائے ، بیٹھا اچھے ایں

اک حشر اُٹھا ہوا ہے کوچے میں اپنے آج
اور ، اپنا منہ چھپائے بیٹھا اچھے ایں

کچھ بھی غرض نہیں ہے ، ہیں اپنے آپ ماں گم
کوئی اب آئے جائے ، بیٹھا اچھے ایں

ناراض ہو کے پہلے وہ چل دیا ظفر سے
اب یوں ہی منہ پھلائے بیٹھا اچھے ایں

☆

بیٹھا اچھے ایں: بیٹھے ہیں ہم یہاں

منظر کہیں دکھاؤ ، بیٹھا اچھے ایں
کوئی خبر سناؤ ، بیٹھا اچھے ایں

عینک نئی لگاؤ ، بیٹھا اچھے ایں
ہم کو جو دیکھ پاؤ ، بیٹھا اچھے ایں

اپنی ہی ذات سے ہے خطرہ اگر ہے کچھ
آ کر ہمیں بچاؤ ، بیٹھا اچھے ایں

مُڑ مُڑ کے اُس طرف ہی جاتے ہو کس لیے
اپنے بھی پاس آؤ ، بیٹھا اچھے ایں

پرہیز ہے ہمیں سے شاید تمھیں بہت
جاؤ ، جہاں بھی جاؤ ، بیٹھا اچھے ایں

اپنی بھی تو فقیری تم آزما کے دیکھو
آؤ ، مراد پاؤ ، بیٹھا اچھے ایں

وہ کام بھی کرو اب ، جو ہے ہی کرنے والا
یہ بات بھی بناؤ ، بیٹھا اچھے ایں

یہ آرزو تمھاری ہے یا کوئی شکنجہ
آ کر ہمیں چھڑاؤ ، بیٹھا اچھے ایں

ملتے نہیں تو کہہ لو کچھ فون پر ظفر سے
نمبر کبھی ملاؤ ، بیٹھا اچھے ایں

☆

اگر نہ آیا چھی شوں کرشو
نہ ہی بلایا ، چھی شوں کرشو

زمیں اندھیرے میں ہو رہے گم
جو ابر چھایا چھی شوں کرشو

سفر تو کاٹا ہے زندگی کا
ملا ، نہ پایا چھی شوں کرشو

سُنی اگر بات ہی نہ اُس نے
نہ کچھ بتایا چھی شوں کرشو

تُمھارا خود ساتھ چھوڑ دے جب
تُمھارا سایہ ، چھی شوں کرشو

یہ پیار پودا کسی نے دل میں
اگر لگایا چھی شوں کرشو

ہُوا نے اپنے بھنور میں اک دن
اگر گھمایا چھی شوں کرشو

جو آج اپنا بنا ہے ، کل کو
ہُوا پرایا چھی شوں کرشو

جو پاچھلی رات کو ظفر نے
گجر بجایا چھی شوں کرشو

☆

کٹا سفر تو چھی شوں کرشو
ملا اگر تو چھی شوں کرشو

ابھی ہے یہ واردات خُفیہ
چھپی خبر تو چھی شوں کرشو

ابھی تو ہے رایگاں فُغاں بھی
ہُوا اثر تو چھی شوں کرشو

ہُوئے جو غائب نظر سے یکدم
یہ بام و در تو چھی شوں کرشو

اگر کوئی اور لے اُڑے گا
وہ مال و زر تو چھی شوں کرشو

نہ ہو سکی اُس کے وصل پر بھی
گذر بسر تو چھی شوں کرشو

ہُوا اگر بھیڑ میں کہیں وہ
اِدھر اُدھر تو چھی شوں کرشو

بُہت ہے پرہیز دیکھنے سے
پڑا نظر تو چھی شوں کرشو

کرے جو گھر آ کے بھی ، ظفر ، وہ
اگر مگر تو چھی شوں کرشو

☆

کوئی چراغ جلائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو
اجواڑوں پھیلائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

بادل آئے تو غائب ہے ، شام پڑے تو بھی ہے غائب
اپنا رنگ جمائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

دن اپنے اندر سے بھی تم کوئی برآمد کر سکتے ہو
یہ الزام اُٹھائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

دھوپ کی اک دھجّی بھی ساری رات کے لیے بہت کافی ہے
شام تک اسے بچائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

اپنی تاب و تپش سے ہی یہ فصل پکانی ہے اب ساری
اندر کو گرمائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

پتّوں اور پھلوں میں رس آئے گا اب اپنی محنت سے
مل کر زور لگائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

در و دیوار چمک سکتے ہیں اُس کے جلوے سے ہی اب تو
اُسے گھیر کر لائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

ابھی غروب بھی ہو کر پھر سے کر سکتا ہے سواری ہم پر
اس پر دھیان جمائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

دھوپ تاپنی ہے اک سُورج مارکا چہرے ہی کی ظفرؔ اب
اُس کو پاس بٹھائے رکھنا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

☆

سُورج نو وشواس نہ کرو: سورج کا اعتبار نہ کرنا

آنا جانا، سُورج نو وشواس نہ کرو
رونا ، گانا سُورج نو وشواس نہ کرو

اپنی روشنیاں لے کر آنے والا ہے
نیا زمانہ ، سُورج نو وشواس نہ کرو

مار بھگانا ہے اندھکاروں کو تو گاؤ!
یہی ترانہ ، سُورج نو وشواس نہ کرو

ایک بار کا فرمایا ہُوا کم ہے ، صاحب!
پھر فرمانا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

لاکھ اپناؤ ، اپنا نہیں کسی صُورت بھی
وُہ بیگانہ ، سُورج نو وشواس نہ کرو

دھوپ کی جگہ اندھیرے بھی برسا سکتا ہے
دیکھتے جانا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

اپنی راتیں بھی روشن ہونے والی ہیں
کیا شرمانا ، سُورج نو وشواس نہ کرو

کبھی کبھی کرتے تھے ناوشواسی پہلے
اب روزانہ سُورج نو وشواس نہ کرو

یاد رکھو ، اُس کا تو ، ظفرؔ ، کوئی بھی نہیں ہے
ٹھورٹھکانا ، سورج نو وشواس نہ کرو

☆

کرتا ہُوں کیا گمان ، مِنے کیں خبر نہتی
کب گرے آسمان ، مِنے کیں خبر نہتی

مہمان تھا مَیں آپ ، یہی تھی خبر مِنے
تھا کون میزبان ، مِنے کیں خبر نہتی

مَیں خود وہاں پہ بیٹھ گیا تھا غبار سا
کیا تھی مری اُٹھان ، مِنے کیں خبر نہتی

پر اپنے خود ہی پھینک دیے تھے زمین پر
کیسی رہی اُڑان ، مِنے کیں خبر نہتی

غفلت میں ہی نمازِ محبت قضا ہوئی
کِس دم ہوئی اذان ، مِنے کیں خبر نہتی

پھر بھی نکل پڑا ہُوں کہیں اُس کو ڈھونڈنے
ہے کِس جگہ نشان ، مِنے کیں خبر نہتی

لگتا ہے جیسے ان ہی مکانوں کے درمیاں
میرا بھی تھا مکان ، مِنے کیں خبر نہتی

ہونا ہے جو بھی فیصلہ ، اس کی خبر تو ہے
کیا تھا مرا بیان ، مِنے کیں خبر نہتی

کیا ذائقہ تھا اُس کے لبِ سُرخ کا ظفر
مُنہ میں بھرا تھا پان ، مِنے کیں خبر نہتی

☆

منے کیں خبر نہتی: مجھے کچھ خبر نہیں

تھا کِس کا انتظار ، مِنے کیں خبر نہتی
دشمن تھا یا کہ یار ، مِنے کیں خبر نہتی

مَیں تھا کہ اُس نواحِ گلستاں میں دُور تک
اُڑتا ہُوا غبار ، مِنے کیں خبر نہتی

خار و خس بدن میں کہیں پر چھپا ہُوا
دل ہی تھا اک شرار ، مِنے کیں خبر نہتی

حیران ہُوں جو کر کے مجھے اتنا بے قرار
خُود بھی تھا بے قرار ، مِنے کیں خبر نہتی

جیسے جُدا ہُوا تھا ترے سبزہ زار سے
ایک اور سبزہ زار ، مِنے کیں خبر نہتی

باہر سے کچھ الگ تھا وہ گرتا ہُوا ، مرے
اندر بھی آبشار ، مِنے کیں خبر نہتی

مَیں سوچتا ہُوں ، میرا شکاری تھا وہ کوئی
یا خُود مرا شکار ، مِنے کیں خبر نہتی

کِس کو خبر کہ باغ و بیابان خواب میں
گُم ہُوں کہ آشکار ، مِنے کیں خبر نہتی

دریا تھا میرے اپنے ہی اندر رواں ، ظفر
مَیں آر تھا کہ پار ، مِنے کیں خبر نہتی

☆

پھیلے ہوئے ہیں جال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی
کیسا چڑھا ہے سال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

اللہ جانے پانو کے نیچے ہے کیسی آگ
سر پر ہے کیا وبال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

کس کس کی ہے مثال یہاں ، کچھ نہ کھل سکا
کیا کیا ہے بے مثال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

چلنا ہی بھول بیٹھا ہوں اس خاک پاک پر
کیسی تھی میری چال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

حیراں ہوں اُس کے بوسہ رنگین تک رسائی
ہے کس قدر محال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

بیگارِ وصل کاٹ کے آیا ہوں ، کیا بتاؤں
ہوں کس قدر نڈھال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

اُس کے جواب کا تو مجھے شک سا ہے کوئی
تھا میرا کیا سوال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

جُڑتے ہیں لفظ شعر میں خود ہی ، سو اس میں بھی
میرا ہے کیا کمال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

لُوٹا ہے دونوں ہاتھوں سے کس نے مجھے ، ظفر
کھایا ہے کس نے مال ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

☆

کرتا ہوں یوں سلام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی
کیا پڑ گیا ہے کام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

میرے حساب میں تو ابھی دن نہ تھا چڑھا
کیوں پڑ چکی تھی شام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

اُس کا تو اب ہوا ہے کہیں خیر سے شروع
میں ہو چکا تمام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

پیچھے تو چھوڑ آیا ہوں پھندے لگے ہوئے
آگے بچھا ہے دام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

دو گھونٹ اس شرابِ تماشا کے پی لیے
مجھ پر جو تھی حرام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

آتا ہے اتنی دور سے آنکھوں میں کس طرح
یہ خوابِ خوش خرام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

افسوس ، ایک میرے لیے ہی تھا سربسر
یہ سارا انتظام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

مجھ پر کچھ اختیار کسی کا نہیں ، سو وہ
دیتا ہے کب لگام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

کوڑے پہ پھینک آیا ہوں میں خود اسے ، ظفر
تھا آپ کا کلام ، مجھے کہیں خبر نہ تھی

☆

آیا وہ آدھی رات منے کیں خبر نتھی
کرنے کو واردات منے کیں خبر نتھی

اَن جان بن کے بیٹھا ہُوا ہے کوئی ، مگر
سب جانتا ہے بات منے کیں خبر نتھی

مہمان آنے والے ہیں، اور، گھر میں اس گھڑی
کیا کچھ ہے دال بھات منے کیں خبر نتھی

کچھ اس طرح بہار و خزاں سے ہُوں بے خبر
جھڑتے ہیں پھول پات منے کیں خبر نتھی

شُعلہ سا ایک دل میں بھڑکتا تھا بار بار
تھی وہ خُدا کی ذات منے کیں خبر نتھی

بے کار میں نے اُس کو اکیلا سمجھ لیا
ہے کوئی اُس کے ساتھ منے کیں خبر نتھی

میں چل رہا تھا ایک پیادے کے زور پر
اور ، ہو چکی تھی مات منے کیں خبر نتھی

بھولا تھا میں کسی کے دلِ نرم پر ، مگر
تھی اُس میں کوئی دھات منے کیں خبر نتھی

میں شہرِ آرزو میں خُدا بخش ہُوں ، ظفر
یا کوئی رام ناتھ منے کیں خبر نتھی

☆

آیا تھا کیا خیال منے کیں خبر نتھی
کیوں کر گیا نڈھال منے کیں خبر نتھی

رہتا ہے پاس پاس منے سب پتا ہے یہ
ہوتا تھا نال نال منے کیں خبر نتھی

کیسے گزار دُوں گا تمھارے بغیر میں
یہ سارے ماہ و سال منے کیں خبر نتھی

اک حادثہ کہ ہونے ہی والا ہے ، اور ، میں
بچ لُوں گا بال بال منے کیں خبر نتھی

اپنی اس احتیاط سے ، اس ٹوٹ پھوٹ میں
کر لُوں گا دیکھ بھال منے کیں خبر نتھی

خُوش خُوش میں آب و دانہ کی جانب روانہ ہُوں
آگے بچھا ہے جال ، منے کیں خبر نتھی

ہُوں سادہ اس قدر کہ مُلاقاتِ خاص میں
وہ ہونٹ کیوں ہیں لال ، منے کیں خبر نتھی

حاصل ہُوا کمال تو کچھ ہو گی وجہ بھی
آیا ہے کیوں زوال منے کیں خبر نتھی

کس چیز کی ہے شہر میں بُہتات ، اے ظفر
اور ، کیا ہے خال خال منے کیں خبر نتھی

☆

پچھلا ہے کیا غبار منے کیں خبر نتھی
کیا پوچھتے ہو یار منے کیں خبر نتھی

جو ایک بار بھی نہیں آیا تھا ، اب وہ کیوں
آتا ہے بار بار منے کیں خبر نتھی

دریا ہے پاٹ دار بہت شور کر رہا
میں آر ہوں کہ پار منے کیں خبر نتھی

یہ ہے کوئی چڑھاو جو درپیش ہے مرے
یا ہے مرا اُتار ، منے کیں خبر نتھی

کیوں دیکھتا ہوں جانب در میں گھڑی گھڑی
ہے کس کا انتظار منے کیں خبر نتھی

منزل ہے کتنی دور ، یہ جانے مری بلا
کیسا ہے رہ گزار منے کیں خبر نتھی

پروا ہی کوئی نفع و ضرر کی نہیں مجھے
کیا ہے یہ کاروبار منے کیں خبر نتھی

ہر بات کی خبر یہاں رکھتے ہیں سارے لوگ
مجھ پہ خدا کی مار ، منے کیں خبر نتھی

ہے کس کی دسترس میں نظام ہوا ، ظفر
اور کس کا اختیار منے کیں خبر نتھی

☆

وہ ہے کہاں منے خیال پن کبھی
یہاں وہاں منے خیال پن نتھی

یہ بزم خواب ہونے والی ہے کبھی
دھواں دھواں منے خیال پن نتھی

کسی کو بھی نہیں ملے گی ایک دن
یہاں اماں ، منے خیال پن نتھی

گرے گا ٹوٹ کر اچانک ایک دن
یہ آسماں ، منے خیال پن نتھی

یہ ٹوٹی پھوٹی ناو ہی رہے گی اب
نہ بادباں ، منے خیال پن نتھی

مرے جہاں سے کس قدر ہے مختلف
ترا جہاں ، منے خیال پن نتھی

مرے پڑوس میں ہی اب تو ہے کہیں
ترا مکاں ، منے خیال پن نتھی

سُنا رہا ہوں ، اور ، ختم ہو چکی
یہ داستاں ، منے خیال پن نتھی

جو بات کرنی ہی نہ چاہیے ، ظفر
ہوئی بیاں ، منے خیال پن نتھی

☆

منے خیال پن نتھی: مجھے خیال ہی نہیں

ادھر ادھر منے خیال پن نتھی
میں ہوں کدھر منے خیال پن نتھی

ملے گی کتنی مدتوں کے بعد اب
تری خبر منے خیال پن نتھی

وہ کر رہا ہے میرے ساتھ دیر سے
اگر مگر ، منے خیال پن نتھی

وہ آئے گا کبھی تو میرے ذہن ماں
خیال بھر ، منے خیال پن نتھی

کھلا رہا ہے کتنے دن سے موگرے
کبھی مگر ، منے خیال پن نتھی

ابھی سے آ کے جا رہا ہے ، بے حیا
ٹھہر ، ٹھہر ، منے خیال پن نتھی

اکھڑ گیا ہے باغ دل میں رات کو
کوئی شجر ، منے خیال پن نتھی

رکی ہے عین تیرے گھر کے سامنے
یہ رہگذر ، منے خیال پن نتھی

نکل پڑا جو عیب ہو کے ، اے ظفر
یہی ہنر ، منے خیال پن نتھی

☆

کہاں چلے ، منے خیال پن نتھی
ارے ارے ، منے خیال پن نتھی

میں آ گھسا ہوں اُس کے گھر الانگھتے
پھلانگتے ، منے خیال پن نتھی

اُجاڑ دل کے بھی عقب میں کھیت ہیں
ہرے بھرے ، منے خیال پن نتھی

جو سوچتا رہا ہوں رات رات بھر
تیرے لیے ، منے خیال پن نتھی

بھٹک رہے ہیں اب بھی دل میں خواب سے
کٹے پھٹے ، منے خیال پن نتھی

وہ اک چراغ بُجھ گیا تو جل اُٹھے
کئی دیے ، منے خیال پن نتھی

ہے شہر اک بسا ہُوا ، خیال سے
بہُت پرے ، منے خیال پن نتھی

کہاں پہ خرچ ہو گی یہ تمام عُمر
جو ہو تجھے ، منے خیال پن نتھی

ظفر مُکر رہا ہے تُو لکھے ہوئے
بیان سے ، منے خیال پن نتھی

☆

جی مچلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی
وقت ٹلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

اس اندھیرے کے اندر چراغ ہوس
کوئی جلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

راہ دشوار تھی ، ابر و باراں بھی تھے
خواب چلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

آنے والی خوشی کے کسی خوف سے
دل دہلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

دن کے ہمراہ اُترتی ہوئی شام تک
میں بھی ڈھلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

پیرہن سا مرے سامنے دیر تک
وہ بدلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

اک دھواں سا مرے بعد اک سمت سے
کچھ نکلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

میرے اندر ہی اک میرے جیسا کوئی
سڑتا گلتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

گو پشیمان اتنا نہیں تھا ظفر
ہاتھ ملتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

☆

آنکھ جوتی رہی: آنکھ دیکھتی رہی

صبح کرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی
وہ گذرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

دل کے خاکے میں اپنی ہی مرضی سے وہ
رنگ بھرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

میں کنارے پہ ہی تھا کھڑا ، اور وہ
پار اُترتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

سبزۂ تازہ پہ میرے خوابوں کے وہ
چھپتا چرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

دور ہی دور سے میں اُسے دیکھتا
اور ، ڈرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

میرے ٹکڑے سے ہوتے رہے دیر تک
پھر بکھرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

راستے میں دھواں سا کسی شام کا
پھر ٹھہرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

کر کے پیدا بگاڑ اک لہو میں میرے
خود سنورتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

ڈوب کر بھی ترے پانیوں میں ظفر
جب اُبھرتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

☆

آتا جاتا رہا ، آنکھ جوتی رہی
خوں رُلاتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

وحشتِ دل میں مرے کس لیے رات دن
خاک اُڑاتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

میرے شیون کا شور و شغب سُن کے وہ
مُسکراتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

میں تو جب بھی روانہ ہُوا ، وہ مرے
آڑے آتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

خود بھی خوشحال کافی تھا لیکن مرا
مال کھاتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

اپنی اشیا زیادہ چھپا کر بھی وہ
کچھ دکھاتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

کچھ اُٹھایا کیا بوجھ رُسوائی کا
کچھ گراتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

وہ ہوا اُس کی اپنی تھی جس میں کہیں
تھرتھراتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

وہ مرے آسماں پر ، ظفر ، دیر تک
سرسراتا رہا ، آنکھ جوتی رہی

-☆-

تیرا میرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی
اک سویرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

گھوڑی گھوڑے کے ساتھ اس گھڑی تھان پر
اک پچھیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

گُم ہُوا ایک بے رونقی میں کہیں
اپنا ڈیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

رات روشن رہی جس کے دم سے مری
خواب تیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

مُجھ سے بیگار لیتا رہا عُمر بھر
وہ وڈیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

چھین کر مُجھ کو مُجھ سے ہی چلتا بنا
اک لُٹیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

راستے بند کر کے سبھی ، پھر مجھے
اُس نے گھیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

روشنی کے کناروں میں اُلجھا ہُوا
گُھپ اندھیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

رائیگاں ہی گیا اس دفعہ تو ، ظفر
اپنا پھیرا جو تھا ، آنکھ جوتی رہی

-☆-

چڑھتے ہوئے خمار کی پہلی ج رات چھے
یہ کس کے انتظار کی پہلی ج رات چھے

جاتی ہوئی خزاں کی ہے یہ شام آخری
آتی ہوئی بہار کی پہلی ج رات چھے

بکھری ہوئی ہے خاک مری دشت و در سے دُور
اُڑتے ہوئے غبار کی پہلی ج رات چھے

میرے بھی سامنے کوئی دریا ہے موج زن
اُس کے بھی آر پار کی پہلی ج رات چھے

اپنی بُلندیوں میں رہا ہُوں میں ایک عمر
اور، یہ مرے اُتار کی پہلی ج رات چھے

آغاز کرنے والی ہے وحشت مری یہاں
دامانِ تار تار کی پہلی ج رات چھے

کرتا ہُوں یاد چھوڑے ہوئے گھر کو اس طرح
جیسے یہ رہگزار کی پہلی ج رات چھے

چوری چھپے کسی کی مُلاقات کی ہے دُھن
یہ اپنے کاروبار کی پہلی ج رات چھے

دراصل تو یہ ایک ہی بار آئی ہے، ظفر
لگتا ہے بار بار کی پہلی ج رات چھے

☆

پہلی ج رات چھے: پہلی ہی رات ہے

اپنے خیالِ خام کی پہلی ج رات چھے
اور، یہ تمھارے نام کی پہلی ج رات چھے

میری ہی پہلی رات نہیں پیچ و تاب کی
سمجھو کہ یہ تمام کی پہلی ج رات چھے

پھر اس کے بعد ہو گی یہاں زندگی شروع
جیسے یہ خاص و عام کی پہلی ج رات چھے

رُکنے کو ہے یہ چلتا ہُوا وقت جس طرح
یہ شامِ خُوش مقام کی پہلی ج رات چھے

گستاخیاں ہماری طرف سے بہت ہُوئیں
یہ اُس کے احترام کی پہلی ج رات چھے

بے کار ہی پھرا کیے گلیوں میں رات دن
سچ پوچھیے تو کام کی پہلی ج رات چھے

آنکھوں سے تو اشارے ہُوا ہی کیے بہت
بس نامہ و پیام کی پہلی ج رات چھے

اک غدر مچنے والا ہے گلیوں میں ہر طرف
یہ شہر میں عوام کی پہلی ج رات چھے

کچھ وُہ بھی ہے کہیں ہمہ تن گوش، اے ظفر
کچھ یہ مرے کلام کی پہلی ج رات چھے

☆

اُلجھے ہُوئے خیال کی پہلی ج رات چھے
یا یہ مرے زوال کی پہلی ج رات چھے

شاید کہ مَیں بھی کوئی دلیری دکھا سکوں
کچھ یہ مری مجال کی پہلی ج رات چھے

چُپ کا یہ روزہ توڑنے والا ہُوں سر بسر
اور، اُس سے بول چال کی پہلی ج رات چھے

قسمت جو سال بھر کی لکھی جائے گی، سو آج
سونا نہیں کہ سال کی پہلی ج رات چھے

فرصت نہیں ہے سانس بھی لینے کی اس گھڑی
اُس شوخ کے وصال کی پہلی ج رات چھے

سر میں کسی فتور کا ہے اولیں پڑاؤ
دل پر کسی ملال کی پہلی ج رات چھے

اُس کے جواب کا بھی یہ موقع ہے آخری
جیسے مرے سوال کی پہلی ج رات چھے

اُس کے سلوک میں بھی تھی قلت کوئی وہاں
اور، یہ بھی خال خال کی پہلی ج رات چھے

آ کر یہاں ظفرؔ کا تماشا تو دیکھنا
یہ اُس خراب حال کی پہلی ج رات چھے

-☆-

اُس کے خیال و خواب کی پہلی ج رات چھے
آنکھوں میں آب و تاب کی پہلی ج رات چھے

پڑھتا ہُوں لفظ لفظ کسی خدوخال کا
یعنی یہ اُس کتاب کی پہلی ج رات چھے

میرا بھی کچھ نکلتا ہے اس میں کہیں کہ یہ
تیرے مرے حساب کی پہلی ج رات چھے

پہلے گُناہ کی ہُوئی ہمت جو آج ہی
میرے لیے ثواب کی پہلی ج رات چھے

پہلے تو جیسے رات کبھی آئی ہی نہیں
اب یہ دلِ خراب کی پہلی ج رات چھے

لکھی گئی ہے شام جو یہ دُشمنوں کے نام
اپنے لیے عذاب کی پہلی ج رات چھے

ویسے ہی ماند ہے یہ ستاروں کی روشنی
یا رنگِ ماہتاب کی پہلی ج رات چھے

لہریں ہیں، چاندنی ہے، خموشی ہے، اور مَیں
جشنِ کنارِ آب کی پہلی ج رات چھے

ایسے ہے جیسے بات ابھی کل کی ہو، ظفرؔ
گذرے ہوئے شباب کی پہلی ج رات چھے

-☆-

دھوپ تھی دل ماں یا اندھکار
یعنی میلا اُجلا اندھکار

میں نے کہا دُھندلکے میں
اُس نے جواب دیا اندھکار

ڈھونڈیں روشنیاں شب بھر
اور ، ہر بار مِلا اندھکار

اِتنے تیز اُجالے ماں
تیرا اور مرا اندھکار

ایک ہی سکّے کے دو رُخ
کیا اجواڑوں ، کیا اندھکار

میرے اور اندھیرے ہیں
اور ، تیرے ہیں جُدا اندھکار

گھر سے نکلے تو دیکھا
راہ میں پڑا ہُوا اندھکار

خاموشی میں گی ہے آج
اپنی مجھے صدا اندھکار

آنکھیں چندھیا گئیں ، ظفر
تھا اپنا ایسا اندھکار

☆

اندھکار: اندھیرا

اندر اور باہر اندھکار
چھایا ہے سر پر اندھکار

آسمان پر گھٹا نہ تھی
رہا مگر دن بھر اندھکار

گذرا خشک فضاؤں سے
اجواڑوں ماں تر اندھکار

جیسے روشن نگری میں
لایا کوئی خبر اندھکار

میری بھی حالت تھی خیر
اور ، تھا خاک بسر اندھکار

اجواڑوں کے اندر سے
نکلا ٹھہر ٹھہر اندھکار

روشنی آئی ساتھ اُس کے
چلا گیا اُٹھ کر اندھکار

پُوچھتا کون اجواڑوں کو
ہوتا نہیں اگر اندھکار

ساتھی ہے میرا یہ ، ظفر
میں ہُوں جدھر ، اُدھر اندھکار

☆

چاند کے ساتھ گہن اندھکار
پھیلا چمن چمن اندھکار

روح تھی جب اتنی تاریک
ہوتا کیوں نہ بدن اندھکار

رات سے ہو گئے پہلے ہی
باغ اندھکار اور بن اندھکار

اس کے دعوے سب جھوٹے
سارا بول بچن اندھکار

اور نظر آتا نہیں کچھ
سارا دولت و حسن اندھکار

اندھے سورج سے نکلا
کالا یہ کرن اندھکار

بے عقلی ہی روشنی ہے
ہے سب علم و فن اندھکار

کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا
ایسا ہے یہ ملن اندھکار

رات گذرتی رہی ، ظفر
خود میں رہا مگن اندھکار

☆

ہم ہی کیا وہاں اندھکار
اُترا جہاں جہاں اندھکار

کون سا تمھیں پسند آیا
جسم اندھکار کہ جاں اندھکار

روشنی سے بھاگا ہے دُور
تھا ایسا نازاں اندھکار

ہوئی نماز قضا آخر
چھایا رہا اذاں اندھکار

کوشش کرنا پڑتی ہے
نہیں ہے کچھ آساں اندھکار

ہلکی پھلکی رات وہ تھی
اور ، بہت ہی گراں اندھکار

پہلے روشنیاں چمکیں
اور ، پھر بعدازاں اندھکار

لفظوں پر چھائی ظلمت
گہرا ہوا زباں اندھکار

بلب تو روشن رہے ، ظفر
کیوں کر ہوا مکاں اندھکار

☆

میں نے پکارا لو اندھکار
تم بھی ساتھ کہو اندھکار

پیشِ خدمت کرتا ہُوں
پاس تھا میرے جو اندھکار

پہلے کبھی نہیں دیکھا
نیا ہے کچھ یہ تو اندھکار

کیوں کر پُورے اتریں گے
ایک اجواڑوں ، دو اندھکار

پھر ہی روشنی آئے گی
پہلے بیٹھ کے رو اندھکار

نکلا ہے دن ، اچھا ہے
کچھ مُنہ سے بھی دھو اندھکار

روک اپنے اندر ہی ذرا
جاتا باہر کو اندھکار

وہیں سے گذریں گے ہم بھی
جہاں برستا ہو اندھکار

ایک ہی جیسے گھنے ، ظفر
یہ اندھکار کہ وہ اندھکار

☆

آئے کوئی جائے ، ہوں جویا کروں
آدمی یا سائے ، ہوں جویا کروں

بیٹھتے ہیں جب اندھیری بام پر
رنگ پر پھیلائے ، ہوں جویا کروں

چار سُو چپ ، اور مرے ہمسائے میں
بولتی ہو گائے ، ہوں جویا کروں

ظلم ہوتا ہو جو میرے سامنے
اور، چُپ ہُوں، ہائے، ہوں جویا کروں

پیٹ پر پتھر بندھا ہو رات دن
اور ، کوئی کھائے ، ہوں جویا کروں

اُس کا لہجہ ہے بہت بدلا ہُوا
جو بھی وہ فرمائے ہوں جویا کروں

اب تو لالچ بھی نہیں کرتا ، کہ وہ
جو بھی کچھ دکھلائے، ہوں جویا کروں

ایک دن تو وہ مرے اندھکار ماں
چاند سا چمکائے ہوں جویا کروں

دیکھنے سے ہی نہ ہو فرصت ، ظفر
وہ نظر تو آئے ، ہوں جویا کروں

☆

ہوں جویا کروں: میں دیکھا کروں

کیا ہُوا منجدھار، ہوں جویا کروں
آر ہے یا پار، ہوں جویا کروں

آپ کا برتاو تو کچھ اور ہے
آپ کا اقرار ہوں جویا کروں

کچھ نہیں باقی بچا ہے، رات دن
اپنے ہی آثار ہوں جویا کروں

کس قدر نقصان ہے اس میں، مگر
سارا کاروبار ہوں جویا کروں

دل کے بہلانے کی خاطر ہی سہی
کچھ پسِ انکار ہوں جویا کروں

گر نکل بھی آؤں ایک انبار سے
اک نیا طومار ہوں جویا کروں

یعنی کچھ کرنے کرانے کے بجائے
ہر گھڑی، ہر بار ہوں جویا کروں

دوسروں کے ساتھ کیا شام و سحر
آپ کو سرکار ہوں جویا کروں

خواب کا خنجر چلے جس دم، ظفر
اک لہو کی دھار ہوں جویا کروں

☆

کورا دیا جواب تو کو نے کھیش ٹوں
اُس نے کیا خراب تو کو نے کھیش ٹوں

اُس کو نہ دیکھنے کی قسم یوں تو کھائی ہے
آیا جو اُس کا خواب تو کو نے کھیش ٹوں

لگتی تو ہے تجھے بہت اچھی نئی قمیص
بوسیدہ ہو جُراب تو کو نے کھیش ٹوں

اتنی فضول خرچیاں کرتا ہے کس لیے
مانگا گیا حساب تو کو نے کھیش ٹوں

یہ دھمکیاں بھی دے کر اُسے دیکھ لے، مگر
مانے نہ رعب داب تو کو نے کھیش ٹوں

بوڑھا سمجھ رہا ہے جسے، کل کو آ گیا
مَل کر کوئی خضاب تو کو نے کھیش ٹوں

پینا پڑی شراب وہاں پر تو خیر ہے
کھانا پڑے کباب تو کو نے کھیش ٹوں

مکتوبِ عشق پر جو ہے ناراض اس قدر
لکھ دی اگر کتاب تو کو نے کھیش ٹوں

سمجھا ہے موج مارتا پانی جسے، ظفر
نکلا اگر سراب تو کو نے کھیش ٹوں

☆

تو کو نے کھیش ٹوں: تو کس کو کہے گا تو

پوچھا نہ اُس نے حال تو کونے کہیش ٹوں
جینا ہُوا محال تو کونے کہیش ٹوں

اچھا ہے آ نہیں رہا مجھ کو ترا خیال
آیا اگر خیال تو کونے کہیش ٹوں

پابندیاں ہیں اور ہیں پہرے عجب عجب
اتنی ہے دیکھ بھال تو کونے کہیش ٹوں

آ کر پھنسا ہے یہ جو کبوتر نیا نیا
اُڑ جائے لے کے جال تو کونے کہیش ٹوں

کاٹے ہیں جیسے پچھلے زمانے، اسی طرح
گذرا جو یہ بھی سال تو کونے کہیش ٹوں

تبدیل ہو بھی سکتا ہے موسم کسی گھڑی
رہتا ہے یہ ملال تو کونے کہیش ٹوں

ہے اُس کے ساتھ ہی یہ زمانے کا بھی چلن
بدلی نہ اُس نے چال تو کونے کہیش ٹوں

اُس کے جواب کی بہت اُمید بھی سہی
باقی رہا سوال تو کونے کہیش ٹوں

دُنیا میں کوئی اُس کی طرح کا نہیں، ظفر
مل ہی گئی مثال تو کونے کہیش ٹوں

☆

ہو یا نہ انتظام تو کونے کہیش ٹوں
نکلا خیال خام تو کونے کہیش ٹوں

جو تیرے ساتھ ہو گئی، اُس واردات میں
آیا جو اُس کا نام تو کونے کہیش ٹوں

جس کے بھی انتظار میں بیٹھا ہے دیر سے
لے گا نہیں سلام تو کونے کہیش ٹوں

اب اتنا پیٹ بھر کے بھی کھانا نہیں درست
دینا پڑے جو دام تو کونے کہیش ٹوں

جیسی ہے تیرے دم سے، ترے بعد بھی جو ہو
ویسی ہی دُھوم دھام تو کونے کہیش ٹوں

خُوش تو بہت ہے باتوں ہی باتوں میں اس قدر
ہوتا نہیں جو کام تو کونے کہیش ٹوں

نالاں رہے اسی طرح برتاؤ سے ترے
سارے یہ خاص و عام تو کونے کہیش ٹوں

یہ بھی بہت ہے جو یہاں پانی ہُوا حلال
یہ بھی ہُوا حرام تو کونے کہیش ٹوں

دالان میں وہ چاند بھی چمکا نہیں، ظفر
گُل ہو چراغ بام تو کونے کہیش ٹوں

☆

کچھ یہاں بیش و کم نہتی ہوتوں
اور، ہو بھی تو غم نہتی ہوتوں

اب کرم کی وہ مار دیتے ہیں
اب کسی پہ ستم نہتی ہوتوں

جسم اکڑا ہُوا ہے سردی سے
سر ترے آگے خم نہتی ہوتوں

اپنے ہونے میں ہی مجھے شک ہے
جو یہاں دمبدم نہتی ہوتوں

عشق خود ہی بڑی تسلی ہے
اس میں قول و قسم نہتی ہوتوں

کس طرح ہو سکے عبادت عشق
ہم جہاں ہوں، صنم نہتی ہوتوں

ڈرتے رہتے ہو کیوں، ہمارے پاس
بات ہوتی ہے، بم نہتی ہوتوں

احترام اب اسی کو ملتا ہے
جو یہاں محترم نہتی ہوتوں

وہی ہوتا ہے خاص کام، ظفر
جو بظاہر اہم نہتی ہوتوں

☆

نہتی ہوتوں: نہیں ہوتا

جس مسافر کا گھر نہتی ہوتوں
ختم اُس کا سفر نہتی ہوتوں

کچھ افاقہ ہے عشق سے، یعنی
درد اب رات بھر نہتی ہوتوں

سب سے اونچی اُڑان اُسی کی ہے
جس پرندے کا پر نہتی ہوتوں

کیا وہ دریائے حُسن ہے جس سے
ہونٹ بھی اپنا تر نہتی ہوتوں

بےسکوں ہی رہوں گا، جب تک میں
اور بھی دربدر نہتی ہوتوں

دیکھنا یہ بھی ہے کہ اب کب تک
موٹھ اپنا مٹر نہتی ہوتوں

وعدہ کرنے کے بعد بھی بدذات
کیوں سرِ رہگذر نہتی ہوتوں

سر نہیں ہے تو پانو ہیں غائب
پانو ہوں گے تو سر نہتی ہوتوں

عیب ہی عیب ہیں، ظفر صاحب
یہ تو کوئی ہنر نہتی ہوتوں

☆

میں جو ہوتا ہوں تب نہیں ہوتوں
وہ وہاں ورنہ کب نہیں ہوتوں

ایک ہی بات ہے جو میں گھر ماں
اب نہیں ہوں کہ جب نہیں ہوتوں

پاس اُس شوخ کے، ہمارے لیے
کچھ تو ہوتا ہے، سب نہیں ہوتوں

لب جو رکھیں تو بند ہو پانی
پانی آئے تو لب نہیں ہوتوں

ساتویں آسمان پر بھی اب
ڈھونڈ آیا ہوں، رب نہیں ہوتوں

اُس کے ہی دائیں بائیں پھرتے ہو
جس کو پاسِ ادب نہیں ہوتوں

باندھنے کے لیے جو ہو رتی
لفظ کوئی کڈھب نہیں ہوتوں

شعر کہتے ہیں وہ بھی، جن کے پاس
شعر کہنے کا ڈھب نہیں ہوتوں

اپنے ہی آپ میں ہیں مست، ظفر
اپنے کوچے میں جب نہیں ہوتوں

☆

قول جب تک عمل نہیں ہوتوں
مسئلہ کوئی حل نہیں ہوتوں

اچھے وقتوں کی یادگار سمجھ
کام یہ آج کل نہیں ہوتوں

عام سا ہے وہ لیکن اُس کے بغیر
چین کیوں ایک پل نہیں ہوتوں

آخرکار یہ ہُوا معلوم
صبر کا کوئی پھل نہیں ہوتوں

بیت جاتا ہے جس طرح کا بھی ہو
وقت کوئی اٹل نہیں ہوتوں

زندگی کون سی ہے جس کے تئیں
کوئی خوابِ اجل نہیں ہوتوں

جیسی ترتیب ہے، کبھی اس میں
کوئی ردّوبدل نہیں ہوتوں

یعنی اگلا سا وہ دماغوں میں
اب تو کوئی خلل نہیں ہوتوں

کچھ دنوں سے تو اب ظفر کے ساتھ
کوئی غول غزل نہیں ہوتوں

☆

مجھ سے جو ہوا ، شوں کہوں تنے
تُو نے جو کیا ، شوں کہوں تنے

جو کہیں نہ تھا میرے چارسُو
اب ہے جابجا ، شوں کہوں تنے

میرا تبصرہ اس پہ کچھ نہیں
خود ہی تُو بتا ، شوں کہوں تنے

ہے الگ الگ تیرے سامنے
جس نے جو کہا ، شوں کہوں تنے

اور تو نہیں دل میں خاص کچھ
حشر ہے بپا ، شوں کہوں تنے

جو بھی کچھ دیا مجھ غریب کو
تُو نے لے لیا ، شوں کہوں تنے

جو بھی تھے ستم ، سہ لیے سبھی
اور ، بجُز دعا شوں کہوں تنے

میں نے سب سُنے طعنہ ہائے خلق
تُو وہاں نہ تھا ، شوں کہوں تنے

اپنا تھا عدو آپ ہی ظفر
تیری کیا خطا ، شوں کہوں تنے

☆

شوں کہوں تنے : کیا کہوں تجھے

چاہے اور ہوس ، شوں کہوں تنے
خود گیا ہوں پھنس ، شوں کہوں تنے

عقل میں ہی تھا ، اس قدر فتور
چھوڑ ، یار ، بس ، شوں کہوں تنے

چل نہیں سکی اس دفعہ وہاں
کوئی پیش و پس ، شوں کہوں تنے

پاس بیٹھنے ہی نہیں دیا
میں ہی تھا نجس ، شوں کہوں تنے

تُو شرار ہے ، تیرے چارسُو
میں ہوں خار و خس ، شوں کہوں تنے

رائگاں گئے میری عمر کے
یوں ہی دس برس ، شوں کہوں تنے

پھڑ پھڑاؤں گا اب یہیں ، کہ ہے
تُو مرا قفس ، شوں کہوں تنے

ایک آدھ ہی تجھ سے تھا سوال
چار تھے نہ دس ، شوں کہوں تنے

تیرے شہر میں ہے ، ابھی ظفر
شورِ یک نفس ، شوں کہوں تنے

☆

کیا ہے گفتگو ، شوں کہوں تتے
اور ، دُوبدُو ، شوں کہوں تتے

جو نہ کہہ سکا تیرے بعد بھی
تیرے رُوبرُو شوں کہوں تتے

کون سی طلب ہے مرے تئیں
کیا ہے جستجو ، شوں کہوں تتے

ایک رات میں خاک ہو گیا
خواب رنگ و بُو ، شوں کہوں تتے

یہ تو ہے کبھی سامنے کی بات
میں ہوں اب نہ تُو ، شوں کہوں تتے

مُجھ میں بھی ہے ایک تیری طرح کا
کوئی تُندخُو ، شوں کہوں تتے

تُو کہیں نہیں ، تیری کھوج میں
میں ہوں کُوبکُو ، شوں کہوں تتے

زخم آرزو کو نہیں رہی
حاجت رفُو ، شوں کہوں تتے

تُو نہیں اگر ، مُجھ سا ہے ، ظفر
کوئی ہُوبہُو ، شوں کہوں تتے

☆

یہ زندگی سے بہار ابھو چھوں
جو مَیں ابھی سے بہار ابھو چھوں

ابھی کِسی کے وُجود میں تھا
ابھی کِسی سے بہار ابھو چھوں

تری مُلاقات اب نہ ہو گی
تری گلی سے بہار ابھو چھوں

خلل نہیں کوئی اور ، اپنی
کِسی کمی سے بہار ابھو چھوں

بدی ہے بھرپُور میرے اندر
جو مَیں بدی سے بہار ابھو چھوں

اِسی صدی میں ہے شور میرا
اِسی صدی سے بہار ابھو چھوں

کوئی جُدا کیفیت ہُوں سب سے
ملی جُلی سے بہار ابھو چھوں

لگی ہُوئی ہے کُچھ اور دِل کو
جو دِل لگی سے بہار ابھو چھوں

اُنھی میں شامل بھی ہُوں ، ظفر ، مَیں
مگر اُنھی سے بہار ابھو چھوں

☆

ادھر اُدھر سے بہار اجو چھوں
تُمھارے گھر سے بہار اجو چھوں

میں در نہیں تیرا کھٹکھٹایا
جو رات بھر سے بہار اجو چھوں

یہیں پہ ہے میرا آشیانہ
مگر ، شجر سے بہار اجو چھوں

میں تُم سے ملنے کی آرزو میں
تُمھارے ڈر سے بہار اجو چھوں

تُمھیں کبھی یہ خبر نہ ہو گی
کہ میں کدھر سے بہار اجو چھوں

بتاؤں گا اپنا راستہ خُود
جو رہگذر سے بہار اجو چھوں

جنوں ہُوں ایک اور ہی طرح کا
میں اپنے سر سے بہار اجو چھوں

مرے اندھیرے ہیں میرے اپنے
شب ہُنر سے بہار اجو چھوں

نئی ہے پہچان میری اب کے
کہ میں ظفر سے بہار اجو چھوں

-☆-

کسی جسم سے بہار اجو چھوں
نہ بیش و کم سے بہار اجو چھوں

ترے کرم سے ہی اندر آیا
ترے کرم سے بہار اجو چھوں

کبھی عرب سے گذر رہا تھا
کبھی عجم سے بہار اجو چھوں

ہیں شورشیں کوئی میرے اندر
نہ زیر و بم سے بہار اجو چھوں

خُود اس قفس سے نکل نہ پایا
کسی کے دم سے بہار اجو چھوں

اثر نہیں کوئی مجھ پہ اُن کا
کہ مدح و ذم سے بہار اجو چھوں

ہیں پیچ و خم اور میرے اندر
جو پیچ و خم سے بہار اجو چھوں

یہ میرا اپنا قرینہ ہے جو
ترے حرم سے بہار اجو چھوں

بھٹک چکا ہوں ، ظفر ، کبھی کو
جو شہد و سم سے بہار اجو چھوں

-☆-

ہم ہیں دُور دُور ، کون مانئے
بات یہ حضور ، کون مانئے

دیکھ لیں قریب سے بھی لوگ سب
ہے پری کہ حور ، کون مانئے

اک ہوا سے ہی کیسے جھڑ گیا
ٹہنیوں سے بُور ، کون مانئے

کولکتہ سے آج بھی ہے کیوں
دُور کان پُور ، کون مانئے

جس پہ میری لاش جھول گئی تھی
ہے یہی کھجور ، کون مانئے

ہونے والا ہے سفر ابھی شروع
ہُوں تھکن سے چُور ، کون مانئے

اپنے ساتھ ایک جنگ میں شریک
میں بھی تھا ضرور ، کون مانئے

وہ بھٹک گیا جب مرے خلاف
میں ہُوں بے قصور ، کون مانئے

تھا مرے دماغ میں کبھی ، ظفر
اس قدر فتور ، کون مانئے

☆

ہو گئی ہے شام ، کون مانئے
سب پڑا ہے کام ، کون مانئے

جل رہا ہے تیز آندھیوں میں بھی
وہ چراغ بام ، کون مانئے

ہے ہوا کا ہی انتظار ابھی
ہل رہے ہیں پام ، کون مانئے

روشنی کی ایک اپنی چال ہے
اُس کی روک تھام کون مانئے

آ کے رُک گیا میرے سامنے
وہ سبک خرام ، کون مانئے

جو ہماری طرز خاص تھی کبھی
ہو چلی ہے عام ، کون مانئے

اب نہیں وُہ نقش ، کس کو اعتبار
اب نہیں وُہ نام ، کون مانئے

ہم بھی اُس کے باغ سے کبھی کبھی
چُوستے تھے آم ، کون مانئے

اب پھر اُس کے شہر میں ہُوا ، ظفر
آپ کا قیام ، کون مانئے

☆

بجھ گیا وہ خواب، کون مانئے
بات یہ، جناب، کون مانئے

اُس کی اپنی ہی گھٹا میں تھی کہیں
اُس کی آب و تاب، کون مانئے

ہے مرا سفینہ رواں کہیں
اب بھی زیرِ آب، کون مانئے

اک فصیلِ سنگ میں کہیں کوئی
کھل رہا ہے باب، کون مانئے

دُور تھی بہت ابھی صبا، مگر
کھل اُٹھے گلاب، کون مانئے

ہے جو شاملِ سفر وجود میں
اُس کو ہم رکاب کون مانئے

آپ کی سیاہ کاریوں کے بعد
آپ کا خطاب کون مانئے

سب فدا ہیں آپ کے سوال پر
اب مرا جواب کون مانئے

گُم ہوا صحیفۂ صفا، ظفر
کھو گئی کتاب، کون مانئے

☆

میں آر ہوں نہ پار تمارا گیا کچھی
کیا ہے یہ انتظار تمارا گیا کچھی

باقی ہے کوئی حصہ تمھارا ابھی یہاں
تنہا ہوں میں ہزار تمارا گیا کچھی

اک خواب سا خیال پلٹتا ہوا کبھی
آتا ہے بار بار تمارا گیا کچھی

جانا تمھارا کیسے نظر آئے صاف اب
چھٹتا نہیں غبار تمارا گیا کچھی

جیسے کسی چڑھاو سے بڑھ کر ہے زوردار
موجوں کا یہ اُتار تمارا گیا کچھی

روشن ہی میرے چاروں طرف ہے اسی طرح
یہ خاکِ آب دار تمارا گیا کچھی

رخنے سے ڈالتے مرے اندھکار میں ابھی
اُڑتے ہوئے شرار تمارا گیا کچھی

اب بھی وہی ہے شوقِ ملاقات ہر طرف
بے حد و بے شمار تمارا گیا کچھی

اک شور ڈالتا ہوا اندر کہیں، ظفر
گرتا یہ آبشار تمارا گیا کچھی

☆

دیتا رہا دُہائی تمارا گیا پچھی
اور ، موت بھی نہ آئی تمارا گیا پچھی

اک بے تکی سی خواہشِ مستی عجب
مجھ میں پھر آ سمائی تمارا گیا پچھی

تم گھر نہیں گئے ، جو تمھیں ڈھونڈتا ہُوا
آیا تمھارا بھائی تمارا گیا پچھی

تم سے وصولنی ہے مع سُود ایک دن
قرضے کی پائی پائی تمارا گیا پچھی

ہوتا ہے ایسے کام کا انجام بھی یونہی
تہمت غضب اُٹھائی تمارا گیا پچھی

تلچھٹ تمھارے وصل کی رکھی ہے سینت کر
ہم نے بھی بچائی ، تمارا گیا پچھی

درد دل و جگر میں کمی ہی نہیں ہُوئی
کھائی تو تھی دوائی تمارا گیا پچھی

سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا کہیں کہیں
کچھ گرم تھی رضائی تمارا گیا پچھی

دل سے بجھائی تھی جو ظفر نے کسی طرح
وہ آگ پھر لگائی تمارا گیا پچھی

☆

خالی لگا مکان تمارا گیا پچھی
گہرا تھا آسمان تمارا گیا پچھی

جیسے گئے نہیں ہو ابھی پوری طرح سے
ایسا رہا گمان تمارا گیا پچھی

سگرٹ نے کچھ مزہ نہ دیا دیر تک مجھے
کڑوا لگا تھا پان ، تمارا گیا پچھی

ساری سُنی سُنائی کنارے لگی کہیں
تھی ختم داستان تمارا گیا پچھی

ایسی اُٹھی کہ بیٹھ گیا سب غبارِ دل
اک درد کی اُٹھان تمارا گیا پچھی

بے پر ہی رہ گیا تھا جو پنچھی کہوں تو میں
بھولی تھی ہر اُڑان تمارا گیا پچھی

ساری خدائی پر کوئی پردہ سا تن گیا
دیکھی خُدا کی شان تمارا گیا پچھی

ایسا ہُوا کہ نیند نہیں آئی پھر مجھے
دینا پڑا لگان تمارا گیا پچھی

قدموں کی چاپ صاف ظفر کو سُنائی دی
بجنے لگے تھے کان تمارا گیا پچھی

☆

دن ڈھل گیا تو شام سے آگے جتا رہیا
ہم لوگ اپنے کام سے آگے جتا رہیا

کچھ اور نام بھی تھے وہاں، اس لیے کہیں
شاید تمھارے نام سے آگے جتا رہیا

اب تک ہمیں یقیں ہی نہیں آ رہا کہ ہم
کیسے خیالِ خام سے آگے جتا رہیا

کیا حادثہ ہُوا کہ اُسے دیکھتے ہُوئے
اُس کے کنارِ بام سے آگے جتا رہیا

پیچھے ہٹے تھے اور ہمیں ایسے لگا کہ ہم
جیسے کسی مقام سے آگے جتا رہیا

اک طے شدہ نظامِ محبت تھا سامنے
اور، آپ اُس نظام سے آگے جتا رہیا

کچھ اُس کو انتظار ہمارا بھی کم ہی تھا
کچھ ہم بھی انتظار سے آگے جتا رہیا

اپنے خیال میں وہ گذرگاہِ خاص تھی
جس شاہراہِ عام سے آگے جتا رہیا

سازِ سخن کو رہنے دیا بے صدا، ظفر
اور، کاہشِ کلام سے آگے جتا رہیا

☆

آگے جتا رہیا: آگے چلے گئے

ہر طرح کے غبار سے آگے جتا رہیا
ہم خوابِ انتظار سے آگے جتا رہیا

دریائے آرزو کو خبر ہی نہ ہو سکی
ہم آر تھے کہ پار سے آگے جتا رہیا

باری ہماری آنے ہی والی تو تھی، مگر
ہم آپ ہی قطار سے آگے جتا رہیا

جو لوگ ڈوبنے کے لیے آئے تھے، وہی
پانی کی تیز دھار سے آگے جتا رہیا

اپنا مدار چھوڑ کے پہنچے تھے ہم وہاں
پھر اُس کے بھی مدار سے آگے جتا رہیا

اپنے ہی داغِ دل کی رہے ہم تلاش میں
اور، اُس کے لالہ زار سے آگے جتا رہیا

سب دوسروں کے ساتھ پہنچتے کہیں، مگر
ہم خود ہی رہگزار سے آگے جتا رہیا

آئے تھے جس میں خاک اُڑانے کو چار دن
اُس دشتِ بے کنار سے آگے جتا رہیا

رُکنے لگے تھے پیاس کی شدت سے ہم ظفر
پھر اُس کے آبشار سے آگے جتا رہیا

☆

شاید ترے خیال سے آگڑ جتا رہیا
اس طرح ماہ و سال سے آگڑ جتا رہیا

آخر کو بے نیاز ہوئے ٹوٹ پھوٹ سے
اور ، ساری دیکھ بھال سے آگڑ جتا رہیا

پیچھے جو چھوڑ آئے کہیں اپنے آپ کو
ہر طرح کے وبال سے آگڑ جتا رہیا

ناچار جب جواب نہ سُوجھا کوئی ہمیں
تب معرضِ سوال سے آگڑ جتا رہیا

حالات ہی کچھ اور تھے جس کے سبب سے ہم
اپنے اور اُس کے حال سے آگڑ جتا رہیا

کیوں ایک بدقماش کے جھانسے میں آئے ہم
اور ، ایک خُوش خصال سے آگڑ جتا رہیا

تنگ آ کے جان و مال اُسے واپس کیے وہیں
جب فکرِ جان و مال سے آگڑ جتا رہیا

آغاز تھا زوال ہمارا جہاں سے ، ہم
اپنی حدِ کمال سے آگڑ جتا رہیا

دیکھا تو پھنس چکے تھے بُری طرح سے ، ظفر
ظاہر میں اُس کے جال سے آگڑ جتا رہیا

☆

کر رہا تھا تنگ میں ہنستو رہیو
رنگ سے بے رنگ میں ہنستو رہیو

ختم ہونے میں نہ آتی تھی کہیں
میری اُس کی جنگ ، میں ہنستو رہیو

اپنے حصے کی ملے گی یا نہیں
گھوٹتا تھا بھنگ میں ہنستو رہیو

کر رہا تھا جو خوشامد بھی غلط
تھا وہ نمبر ننگ ، میں ہنستو رہیو

وہ بھی کچھ ہنسنے ہنسانے کا کہیں
سیکھ جائے ڈھنگ ، میں ہنستو رہیو

سچ تو یہ ہے تاکہ اُترے کوئی دم
طبع سے یہ زنگ ، میں ہنستو رہیو

جھانکتا تھا جھوٹ جس سے صاف صاف
سُن کے عذرِ لنگ میں ہنستو رہیو

اک لطیفہ ہی مجسم تھا وہ شوخ
اور ، شوخ و شنگ ، میں ہنستو رہیو

حرکتیں ہی اُس کی ایسی تھیں ، ظفر
ہوتے ہوتے دنگ میں ہنستو رہیو

☆

ہنستو رہیو: ہنستا رہا

جیت میں تھی مات ، مَیں ہنستو رہیو
سُن کے اُس کی بات ، مَیں ہنستو رہیو

ایک خرمستی میں تھا وہ ، اس لیے
مارتا تھا لات ، مَیں ہنستو رہیو

پیتے پیتے چائے وہ رونے لگی
کھاتے کھاتے بھات مَیں ہنستو رہیو

زعفرانی کھیت سے لایا تھا وہ
پھول تھے یا پات مَیں ہنستو رہیو

اتنی آبادی کہاں سے آئی ہے
دیکھ کر بہتات مَیں ہنستو رہیو

خوش خیالی میں تھی میرے ساتھ وہ
اور ، خُدا کی ذات مَیں ہنستو رہیو

گُدگُدی سی کر گئی تھی شام ، اور
ہو چلی تھی رات ، مَیں ہنستو رہیو

وہ تو ناموجود ہی تھا اُس گھڑی
اور کس کے ساتھ ، مَیں ہنستو رہیو

تھا نہ ہنسنے کے سوا چارہ ، ظفرؔ
دیکھ کر حالات مَیں ہنستو رہیو

☆

تھا جو پاٹے خان مَیں ہنستو رہیو
اور ، وہاں جان مَیں ہنستو رہیو

رفتہ رفتہ کر لیے کپڑے خراب
کھاتے کھاتے پان مَیں ہنستو رہیو

مسکراتے تھے مجھے سب دیکھ کر
مَیں ہی تھا پردھان ، مَیں ہنستو رہیو

کارٹون ایک اُس میں آیا تھا عجب
پڑھتے پڑھتے 'ڈان' مَیں ہنستو رہیو

اور تو مشکل میں تھے سارے ، مگر
مَیں ہی تھا آسان ، مَیں ہنستو رہیو

شہر کی دیوار گریہ کے تلے
ہے خُدا کی شان ، مَیں ہنستو رہیو

اور تو کچھ ہو نہ سکتا تھا وہاں
تھا یہی امکان ، مَیں ہنستو رہیو

بحر سے خارج ہوئی ساری غزل
بھول کر اوزان مَیں ہنستو رہیو

دیکھتا تھا مجھ کو حیرت سے ، ظفرؔ
سارا پاکستان ، مَیں ہنستو رہیو

☆

ہے اندر نہ باہر، گھنا دور چھے
کہ منزل سراسر گھنا دور چھے

بنے گا یہ پکوان بے ذائقہ
پہنچ سے ٹماٹر گھنا دور چھے

اب اپنے ہی کاندھے پہ لادوں یہ بوجھ
پہاڑی سے خچر گھنا دور چھے

ابھی ہو نہیں پائیں گے باریاب
کہ دیوار سے در گھنا دور چھے

یکایک یہ بینائی کم ہو گئی
کہ آنکھوں سے منظر گھنا دور چھے

خلل ڈالیے مت مری نیند ماں
ابھی شورِ محشر گھنا دور چھے

تصوّر ہے نزدیک اُس کا، مگر
وہ زُلفِ معطّر گھنا دور چھے

ابھی اور جاری رہے گا سفر
ٹھہرنا نہیں، گھر گھنا دور چھے

کٹا ہے، ظفرؔ، اپنے ہی آپ کیوں
گلے سے تو خنجر گھنا دور چھے

☆

گھنا دور چھے: بہت دور ہے

سمندر کنارہ گھنا دور چھے
اور، اُس کا اشارہ گھنا دور چھے

ہمارا مقدّر جو چمکا نہیں
ہمارا ستارہ گھنا دور چھے

یہاں سے تو پیدل ہی اب جائیں گے
کہ اُس نے اُتارا گھنا دور چھے

ابھی ڈوب مرنا بھی ممکن نہیں
محبت کا دھارا گھنا دور چھے

بہت منتظر ہیں مرے خار و خس
تمھارا شرارہ گھنا دور چھے

ہے دیدار درشن، نہ بوسہ نہ بات
وہ سارے کا سارا گھنا دور چھے

کچھ اتنا سفر ہم سے ہوتا نہیں
کہ گھر ہی تمھارا گھنا دور چھے

خبر کون لیتا کہ اُس نے مجھے
جہاں لا کے مارا گھنا دور چھے

جو پہلے بھی تھا دور ہم سے، ظفرؔ
وہی اب دوبارہ گھنا دور چھے

☆

کہیں آنا جانا گھنا دُور جیسے
ہمارا زمانہ گھنا دُور جیسے

نہ کام آئے گا کوئی تیر و تفنگ
کہ اپنا نشانہ گھنا دُور جیسے

ابھی بھوک ہی میں رہو حال مست
ابھی آب و دانہ گھنا دُور جیسے

کسی اور ہی میں کہیں پڑ رہیں
اگر آشیانہ گھنا دُور جیسے

کہیں اور ہی سے منگائیں سگار
یہاں سے ہوانا گھنا دُور جیسے

وہ ہم تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں
جو رنگِ روانہ گھنا دُور جیسے

ہماری کہانی ہے اس خاک پہ
تمھارا فسانہ گھنا دُور جیسے

ہم اپنی ہی چوکھٹ پہ آ سر جھکائیں
کہ وہ آستانہ گھنا دُور جیسے

کسی اور اُلجھن میں اُلجھیں، ظفر
جو وہ تانا بانا گھنا دُور جیسے

☆

ملے آیا بھر پُورے
جیسے سایا بھر پُورے

اور سے ہو گئی اور ہی دُوری
بدلی کایا بھر پُورے

سُورج کا ہم شکل تھا کوئی
ایسا بھایا بھر پُورے

آنا اُس کا، جانا اُس کا
کھویا، پایا بھر پُورے

ڈھونڈنے آیا پیچھے اُس کے
اُس کا تایا بھر پُورے

بارش والا بادل بن کر
مجھ پہ چھایا بھر پُورے

دیر سے ہی پہچانا اُس کو
دھوکا کھایا بھر پُورے

نکلے دھوپ میں ڈھونڈنے خود کو
کشٹ اُٹھایا، بھر پُورے

چھانو تھی ایک ظفر کے اندر
رویا گایا بھر پُورے

☆

خاک اُڑائی بھر پُورے
دھوم مچائی بھر پُورے

پکڑے گئے ہیں چکاچوند ماں
شامت آئی بھر پُورے

آیا، لیکن ساتھ اُس کے تھا
اُس کا بھائی بھر پُورے

فارغ کیا اُسے آتے ہی
جان بچائی بھر پُورے

کھاٹ نہ تھی تو اُس کی خاطر
دری بچھائی بھر پُورے

سائبان سا تانا پہلے
اور، لٹائی بھر پُورے

غلط جگہ پر چھیڑا اُس کو
گالی کھائی بھر پُورے

صبح کی آئی ہُوئی کو آخر
ملی رہائی بھر پُورے

ٹھنڈی ٹھار پلائی ظفر کو
دودھ ملائی بھر پُورے

-☆-

چڑھتا ہے نیا سال، روکاؤ تو ساروں
جانا ہے بہرحال، روکاؤ تو ساروں

کتنے ہی جتن سے روکی ہُوئی ہے شام
کھولے ہُوئے ہو بال، روکاؤ تو ساروں

ہم نے تو کہی ہے پہلی ہی دفعہ، یار
یہ بات نہیں ٹال، روکاؤ تو ساروں

سب کچھ ہے تمھارا، لے جاؤ گے ہی ساتھ
اپنا یہ زر و مال، روکاؤ تو ساروں

جو پھانس چُبھی ہے اک عمر سے دل ماں
ہو ختم یہ جنجال، روکاؤ تو ساروں

بچنا بھی ہے ان سے، پھیلے ہُوئے ہر سمت
اپنے لیے یہ جال، روکاؤ تو ساروں

جو ساتھ چلے ہو مُدّت سے ہمارے
بدلو نہیں یہ چال، روکاؤ تو ساروں

ویسے تو ہے سب ٹھیک، کچھ دن سے ہمارے
اچھے نہیں احوال، روکاؤ تو ساروں

خود مست ہیں سب لوگ، ایسے میں ظفر کی
ہے دیکھ نہ کچھ بھال، روکاؤ تو ساروں

-☆-

روکاؤ تو ساروں: رُک جاؤ تو جانوں

امید ملاقات ہے، تھی جائے تو ساروں
لکھی ہوئی اک بات ہے تھی جائے تو ساروں

یکلخت محبت میں بدل جائے وہ نفرت
تبدیلیِ حالات ہے، تھی جائے تو ساروں

وعدہ جو کیا ہے کہیں پورا بھی کرے وہ
امکانِ خرافات ہے، تھی جائے تو ساروں

مشکل تو بہت ہے، مگر اس شہر میں، اپنا
وہ ایک ہی کم ذات ہے، تھی جائے تو ساروں

جلتے ہوئے ان طرفہ دِنوں میں کہیں شاید
اپنی بھی کوئی رات ہے، تھی جائے تو ساروں

کنجوس تو ہے وہ، مگر، اک بوسۂ شیریں
اپنے لیے خیرات ہے، تھی جائے تو ساروں

کچھ لطف زیادہ بھی نہیں چاہیے، یعنی
جو بھی مری اوقات ہے، تھی جائے تو ساروں

کچھ بھی نہیں مطلوب کہ شرمندۂ تعبیر
اک خوابِ خیالات ہے، تھی جائے تو ساروں

منظور، ظفر، دوسروں کے ساتھ یہ عرضی
کچھ دورِ مساوات ہے، تھی جائے تو ساروں

☆

تھی جائے تو ساروں: ہو جائے تو مانوں

شام ھی جائے تو ساروں
کام تھی جائے تو ساروں

ہو چکا خاص بہت کچھ
عام تھی جائے تو ساروں

دل کا یہ فرش کسی دن
بام تھی جائے تو ساروں

خواہش پختہ کبھی تو
خام تھی جائے تو ساروں

کب سے گمنام پڑا ہوں
نام تھی جائے تو ساروں

دانہ یہ بھی کسی صورت
دام تھی جائے تو ساروں

رام کے نام پہ ہی وہ
رام تھی جائے تو ساروں

چوس لوں بیٹھ کے اس کو
آم تھی جائے تو ساروں

اوک ہی اپنی، ظفر، اب
جام تھی جائے تو ساروں

☆

تنگ تھی جائے تو ساروں
جنگ تھی جائے تو ساروں

مُدعا جان کے میرا
دنگ تھی جائے تو ساروں

آتما سے جو کبھی وہ
اَنگ تھی جائے تو ساروں

کھیت پودینے کا سارا
بھنگ تھی جائے تو ساروں

اور، جڑاں والہ کسی دن
جھنگ تھی جائے تو ساروں

ڈھب کُڈھب میرا یہ سارا
ڈھنگ تھی جائے تو ساروں

رنگ میں اُس کے یہ چولا
رنگ تھی جائے تو ساروں

آئنہ ہو گیا بے کار
زنگ تھی جائے تو ساروں

دُور رہتا ہے، ظفر، وہ
سنگ تھی جائے تو ساروں

☆

باقی ہے ابھی شام، روکاؤ تو ساروں
رہتا ہے ابھی کام، روکاؤ تو ساروں

روشنی کیسی پھیلی ہے سرِشام
تجھ اور لبِ بام روکاؤ تو ساروں

اس شوقِ خوش آغاز کا اب ترے ہاتھوں
جیسا بھی ہو انجام، روکاؤ تو ساروں

دشمن نے بھی رستے میں ہے کسی کارن
پھیلایا ہُوا دام، روکاؤ تو ساروں

دل ماں جو مچا ہے آتے ہی تمھارے
یہ شور، یہ کہرام، روکاؤ تو ساروں

بے چین بہت ہُوں، تکلیف بہت ہے
آ جائے گا آرام، روکاؤ تو ساروں

خاطر کو رکھو جمع، آتا ہے ابھی تو
ایک اور بھی الزام، روکاؤ تو ساروں

آ ہی جو گیا ہے بھولے سے کسی طرح
یہ وصل کا ہنگام، روکاؤ تو ساروں

گرمی سے چلے ہو سردی میں، ظفر، کیا
ہو جائے نہ سرسام، روکاؤ تو ساروں

☆

کوئی راستہ نجیک چھے
اور ، فاصلہ نجیک چھے

دُور ، کتنا دُور ہے صنم
اُس سے تو خدا نجیک چھے

میں ہی بے خبر ہُوں اس قدر
حشر تو بپا نجیک چھے

دُوریاں ہیں کیوں بہت بہت
جب وہ آ رہا نجیک چھے

دُور تر رہا جو کُو بہ کُو
اب وہ جابجا نجیک چھے

میری نسبت آپ کے لیے
یہ مری صدا نجیک چھے

اپنے آپ سب کے فاصلے
لال سے ہرا نجیک چھے

ہے اسی پہ اب گذر بسر
جو بچا کُھچا نجیک چھے

پھول کھِلنے والے ہیں ، ظفر
باغ میں ہوا نجیک چھے

☆

نجیک چھے : نزدیک ہے

ہر طرح کا ڈر نجیک چھے
آسماں کے سر نجیک چھے

ہے نجیک اپنے آج وہ
اور ، کِس قدر نجیک چھے

آپ دُور ہی سہی ، مگر
آپ کی خبر نجیک چھے

بند ہے اگر تو کیا ہُوا
خُوش ہُوا کہ در نجیک چھے

لُوٹ مار کر سکو اگر
اُس کا مال و زر نجیک چھے

تھا جو سربسر نجیک ہی
وہ بھی اب کدھر نجیک چھے

دُور اُس سے منزلِ ہُنر
وہ جو رہگذر نجیک چھے

کل ترس رہے تھے جس لیے
آج سربسر نجیک چھے

آپ ہیں جو اُس سے دُور دُور
آپ سے ظفر نجیک چھے

☆

ہر عیاں نہاں نجیک چھے
کوئی مہرباں نجیک چھے

اب بھی دُور مجھ سے ہے زمیں
اور، آسماں نجیک چھے

مل سکے ہمیں اگر پناہ
گوشۂ اماں نجیک چھے

اپنا آپ ہے یہاں سے دُور
جس قدر وہاں نجیک چھے

چل دیے وہاں وہاں سے ہم
وہ جہاں جہاں نجیک چھے

کاٹتے ہیں جا اُسے ابھی
شاخِ آشیاں نجیک چھے

آگ دُور ہے لگی ہُوئی
آگ کا دُھواں نجیک چھے

اس بہار سے بھی پیشتر
وہ مری خزاں نجیک چھے

سب چلیں، ظفر، گھڑی گھڑی
ختم داستاں نجیک چھے

☆

کوئی رُوبرُو نجیک چھے
اور، ہُوبہُو نجیک چھے

نیند کیوں نہیں ہے آ رہی
خوابِ آرزو نجیک چھے

خود تو دُور ہے اُسی طرح
اُس کی گفتگو نجیک چھے

پیاس کہہ رہی ہے زور کی
کوئی آبجُو نجیک چھے

کس طرح کا ہے ملاپ یہ
دُور میں ہوں، تُو نجیک چھے

بخیہ گر کہاں چلا گیا
حاجتِ رفو نجیک چھے

دوست ہو گئے ہیں دُور تر
یا مرا عدو نجیک چھے

ڈوبنے کا وقت آ گیا
سیلِ رنگ و بُو نجیک چھے

لگ رہا تھا، اس طرح، ظفر
کوئی سُو بہ سُو نجیک چھے

☆

آشیاں نجیک چھے
اور کہاں نجیک چھے

دور ہو گئی زمیں
آسماں نجیک چھے

یہ جہاں کہاں گیو
وہ جہاں نجیک چھے

سانس پھولنے لگی
مہرباں نجیک چھے

پہلے دور دور تھا
بعدازاں نجیک چھے

قیمتی کہیں نہیں
رائیگاں نجیک چھے

میں بھی پاس آ گیا
وہ بھی ہاں نجیک چھے

جاگتے میں دور، اور
خواب ماں نجیک چھے

دور ہے ظفر زباں
بے زباں نجیک چھے

☆

اس کا گھر نجیک چھے
اور، پھر نجیک چھے

ہونے آیا جب نجیک
سربسر نجیک چھے

بے اثر رہا تھا شعر
اب اثر نجیک چھے

رات پھر گذر چلی
پھر سحر نجیک چھے

دور دور سا ہے کیوں
وہ اگر نجیک چھے

کوبکو، یہاں وہاں
دربدر نجیک چھے

اس کی جگہ آج تو
اس کا ڈر نجیک چھے

آ رہا نہا کے وہ
تر بہ تر نجیک چھے

آنے والا اور بھی
اے ظفر نجیک چھے

☆

باغوں سے ڈال ڈال کا پوپٹ اُڑی گئیو
ہر خواب اور خیال کا پوپٹ اُڑی گئیو

چُوری تو خوب کھائی تھی تُو نے یہاں وہاں
کیسے ترے جمال کا پوپٹ اُڑی گئیو

کچھ دن تو ساتھ ساتھ رہا، لیکن آخرش
دل سے ترے ملال کا پوپٹ اُڑی گئیو

خود رہزنوں کو ہم نے پکارا تھا ایک رات
اس طرح جان و مال کا پوپٹ اُڑی گئیو

میں اپنے دھیان ہی میں مگن تھا یہاں پہ، اور
اک دن ترے وصال کا پوپٹ اُڑی گئیو

ہوتی تھی اُس سے اپنی مُلاقات، اور، پھر
اُس کے بھی احتمال کا پوپٹ اُڑی گئیو

دیکھا جو سو کا نوٹ تو چہرے سے ایک دم
انکار و اشتعال کا پوپٹ اُڑی گئیو

اُس کے جواب کے تو ابھی منتظر ہی تھے
اور، ہاتھ سے سوال کا پوپٹ اُڑی گئیو

پنجرے کا در کُھلا جو کہیں رہ گیا، ظفر
پھُر سے مرے کمال کا پوپٹ اُڑی گئیو

☆☆

سب کا پوپٹ اُڑی گئیو
کیا کیا پوپٹ اُڑی گئیو

تیرے پوپٹ کے ہمراہ
میرا پوپٹ اُڑی گئیو

گلے میں گانی تھی اُس کے
کیسا پوپٹ اُڑی گئیو

لوٹ کے پھر نہیں آیا جو
ایسا پوپٹ اُڑی گئیو

باتیں کرتا تھا ویسی
جیسا پوپٹ اُڑی گئیو

تھوڑا سا تو رہ جاتا
سارا پوپٹ اُڑی گئیو

دل سے تری محبت کا
اندھا پوپٹ اُڑی گئیو

شاخ پہ اور آ بیٹھا ہے
پہلا پوپٹ اُڑی گئیو

آدھا ہی باقی ہے، ظفر
آدھا پوپٹ اُڑی گئیو

☆☆

ماسی ، پوپٹ اُڑی گئیو
چاچی ، پوپٹ اُڑی گئیو

نقلی ہی رہ گیا یہاں
اصلی پوپٹ اُڑی گئیو

قابو کر کے رکھتا تھا
پھر بھی پوپٹ اُڑی گئیو

چھوڑ گیا ہے پر اپنا
باقی پوپٹ اُڑی گئیو

پوتی چلّا کر بولی
دادی ، پوپٹ اُڑی گئیو

کل ہی اُسے خریدا تھا
کل ہی پوپٹ اُڑی گئیو

پھرتے ہو تنہا تنہا
کیوں جی، پوپٹ اُڑی گئیو؟

شاخ تو وہیں پہ ہے موجود
خالی پوپٹ اُڑی گئیو

آسمان کی سمت ، ظفر
خاکی پوپٹ اُڑی گئیو

☆

اکثر پوپٹ اُڑی گئیو
ہر ہر پوپٹ اُڑی گئیو

لہو پی گیا جب سارا
مچھر پوپٹ اُڑی گئیو

اندر مَیں مَیں رہتی ہے
باہر پوپٹ اُڑی گئیو

گھنا تماشا کرتا تھا
بندر پوپٹ اُڑی گئیو

کوئی نہ مانے گا ، لیکن
پتھر پوپٹ اُڑی گئیو

آنکھیں خالی رہ گئی ہیں
منظر پوپٹ اُڑی گئیو

پوٹھیوں کے تعاقب ماں
لوفر پوپٹ اُڑی گئیو

خود ہی کرتے ہیں سب کام
نوکر پوپٹ اُڑی گئیو

ٹکڑا ہی باقی ہے ، ظفر
لاغر پوپٹ اُڑی گئیو

☆

رہے اُس کا آنا وگیرے وگیرے
سو ، ملنا ملانا وگیرے وگیرے

تمھاری کہانی رہی سب سے اچھی
ہمارا فسانہ وگیرے وگیرے

کبھی آپ کے آؤ جو گھر ماں ہمارے
تو کھانا بھی کھانا وگیرے وگیرے

بہت یاد ہے دیر تک جاگنا وہ
وہ سونا سُلانا وگیرے وگیرے

ہمیں خوب معلوم ہے ، اس دفعہ بھی
کرو گے بہانہ وگیرے وگیرے

کہاں گھومتا تھا ، کدھر گھوم بیٹھے
خطا ہے نشانہ وگیرے وگیرے

ڈھلی رات ہے ، اب کہاں جا رہے ہو
بُرا ہے زمانہ ، وگیرے وگیرے

ترے پاس ہی اب تو لکھا ہُوا ہے
مرا آب و دانہ وگیرے وگیرے

کسی سنگدل کا ، ظفر ، منتظر ہے
یہ آئینہ خانہ وگیرے وگیرے

☆

وگیرے وگیرے : وغیرہ وغیرہ

مرے پاس آیا وگیرے وگیرے
کیا اور کرایا وگیرے وگیرے

بہت اُس کی تفصیل میں جایئے کیا
پیا اور کھایا وگیرے وگیرے

گدھے کی طرح زندگی بھر تو ہم نے
ترا بوجھ اُٹھایا وگیرے وگیرے

کبھی تیری صحبت میں اپنی بھی شاید
بدل جائے کایا وگیرے وگیرے

بہت سا چھپانے کے دوران اُس نے
بہت کچھ دکھایا وگیرے وگیرے

پڑا تھا سو ، بیہوش سا لگ رہا تھا
ہلایا جُلایا وگیرے وگیرے

وہ آنکھوں کے رستے سے داخل ہُوا تھا
جو دل میں سمایا وگیرے وگیرے

بٹھایا جسے پاس منت سے ہم نے
ذرا پھر لٹایا وگیرے وگیرے

بہت کچھ کیا بھی ، ظفر ، ہم نے ، لیکن
نہ کھویا نہ پایا وگیرے وگیرے

☆

وہی گھر میں ڈالی وگیرے وگیرے
جو تھی ایک سالی وگیرے وگیرے

رہا کچھ نہیں پاس جس روز سے، ہم
ہُوئے تُجھ سے خالی وگیرے وگیرے

بہت جیسے لاچار تھی اپنے گھر ماں
سو، جا کر سنبھالی وگیرے وگیرے

خموشی میں ہی ہو گئی کیسی فارغ
نہ بولی نہ چالی وگیرے وگیرے

بظاہر لگی عام سی، تھی مگر وہ
کوئی شے نرالی وگیرے وگیرے

جو آیا تھا کرنے سلام محبت
گیا دے کے گالی وگیرے وگیرے

پھٹے اور پُرانے تھے ہم، اور، اُس سے
مُرمّت کرالی وگیرے وگیرے

چلا بھی گیا وہ ذرا بھیک دے کر
رہے ہم سوالی وگیرے وگیرے

ملی تو، ظفر ساتھ ہی لے چلے ہم
نہ دیکھی نہ بھالی وگیرے وگیرے

☆

پڑا اتنا کھانا وگیرے وگیرے
نہیں گھر میں آٹا وگیرے وگیرے

وہ دریا ہی تھا اتنا گہرا، سو ہم نے
یہی پاٹ پاٹا وگیرے وگیرے

پسند آیا اُس کو نہ ہُوتا ہی کوئی
نہ 'سروس' نہ 'باٹا' وگیرے وگیرے

شب وصل باقی تھی آدھی ابھی تک
کیا اُس نے ٹا، ٹا وگیرے وگیرے

بہت اُس کو چُوما، بہت اُس کو چُوسا
بہت ہم نے چاٹا وگیرے وگیرے

ہماری تُمھاری سہولت کی خاطر
بہت کشٹ کاٹا وگیرے وگیرے

چُھری اُس نے پکڑی تو خود ہم نے آگے
کیا اپنا گاٹا وگیرے وگیرے

مُشقّت جو کرنا پڑی ساتھ اُس کے
تو کھایا پراٹھا وگیرے وگیرے

ظفر، بے تکلّف جو ہوتے لگے ہو
تو کھاؤ گے چانٹا وگیرے وگیرے

☆

ہمیشہ ہی بیمار جویا کرے چھے
مری حالتِ زار جویا کرے چھے

کہیں میرا اصرار جویا کرے چھے
نہ وہ اپنا انکار جویا کرے چھے

یہاں دیکھنے کے لیے کیا بچا ہے
سو، کیا اے مرے یار جویا کرے چھے

نظر ہی نہیں کچھ بھی آتا ہے اُس کو
اِدھر وہ کئی بار جویا کرے چھے

کبھی ڈھونڈتا ہے مجھے کوچہ کوچہ
کبھی میرے آثار جویا کرے چھے

کبھی تو نظر ہی اُٹھاتا نہیں ، اور
کبھی وہ لگاتار جویا کرے چھے

نہیں آ رہا ہوں جو اُس کی نظر ماں
وہ شاید مرے پار جویا کرے چھے

کبھی مَیں دکھائی ہی دیتا نہیں ہُوں
کبھی میری بھرمار جویا کرے چھے

ظفر ، تُو ہی اُس کی طرف مدّتوں سے
جو سمجھے تو بے کار جویا کرے چھے

☆

بہت خاص ہے عام جویا کرے چھے
جو میرے در و بام جویا کرے چھے

یہ دل کوئی پوپٹ ہے ، شاخِ طلب پر
جو پکتا ہُوا آم جویا کرے چھے

لگاتا ہے بوتل سے ہی مُنھ یہاں پر
کہاں کوئی اب جام جویا کرے چھے

ہے کرنا کرانا کہاں اُس کے بس ماں
جو آغاز و انجام جویا کرے چھے

میں اُس کی اسیری میں آتا ہُوں، کس دن
بچھا کر کوئی دام جویا کرے چھے

اُسے اور کچھ دیکھنا ہی نہیں ہے
اگر وہ یہ کہرام جویا کرے چھے

جسے آپ اقرار میں گوندنا ہو
وہ تُہمت نہ الزام جویا کرے چھے

مری رات کی بھی خبر لے کبھی ، جو
مری صبح اور شام جویا کرے چھے

ظفر پر کوئی اور شک بھی نہ کرنا
کہ مزدور ہے ، کام جویا کرے چھے

☆

جویا کرے چھے: دیکھا کرتا ہے

یہ جیسی بھی گزاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو
جو یُوں مرضی تُمھاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

بہُت سا شور برپا کر چُکا ہُوں شہر کے اندر
ابھی تک بھی وہ جاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

مرے پیارے بہُت سے مر گئے مُجھ سے بہُت پہلے
اور، اب میری ہی باری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

کہیں اس بار بھی کوئی کسر باقی نہ رہ جائے
کہ تیاری تو ساری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

کھُلا ہے آسماں بھی، اور، پر بھی تول بیٹھا ہُوں
یہ آخر کی اُڈاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

بہُت ہی مختلف ہے ذائقے میں موت کا پانی
کہ میٹھا ہے نہ کھاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

یہ تیر آیا تھا سیدھا آسماں سے میرے سینے ماں
بہُت یہ زخم کاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

پریشانی کسی بھی طرح کی لاحق ہے اس لمحے
نہ کوئی ناگواری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

مجھے ہلکے سُروں میں گیت کوئی چاہیے اس دم
ظفر، یہ رات بھاری ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

☆

چُپ چاپ مروا دو: مجھے چُپ چاپ مرنے دو

کوئی آواز آتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو
کبھی پردے ہٹاتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

نہیں تھے ہم، ہُوئے، اور اب نہ ہونے کی ہے تیاری
یہ ساری بے ثباتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

وہ جو بھی تھا، اچانک اُس کا مِلنا اور بچھڑ جانا
یہ سب کُچھ حادثاتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

کیا جو فیصلہ آخر یہاں سے کُوچ کرنے کا
یہ میرا اپنا ذاتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

یہاں میں اور وہاں میں فرق بھی اتنا نہیں کوئی
سفر یہ کائناتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

مرے جانے کی تصویریں بنی ہیں ہر طرف کیسی
یہ منظر شش جہاتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

کوئی حیرت ہے جو میرے سرہانے بیٹھ کر مُجھ کو
عجب نغمہ سُناتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

گھڑی ایسی ہے یہ، دستور جو رکھا گیا مُجھ سے
وہی مُجھ کو دکھاتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

ظفر، پلنگ منانے جا رہا ہُوں جیسے اس لمحے
مری صُورت بتاتی ہے، مُنے چُپ چاپ مروا دو

☆

خدا پیچھے دو قدم آگے
فنا پیچھے دو قدم آگے

پسینا دو گھڑی کا ہے
ہوا پیچھے دو قدم آگے

اگر کچھ بھی نہیں پیچھے
تو کیا پیچھے دو قدم آگے

جو پیچھے اس قدر تھا، وہ
کھڑا پیچھے دو قدم آگے

چلو تو شور محشر کا
بپا پیچھے دو قدم آگے

کہ ہم بھی ساتھ مل جائیں
رکا پیچھے دو قدم آگے

ہٹے گا چھ قدم پیچھے
بڑھا پیچھے دو قدم آگے

چلا ہے دیر سے جو بھی
رہا پیچھے دو قدم آگے

ظفر، مجھ سے تو میری ہی
صدا پیچھے دو قدم آگے

☆

زری پیچھے دو قدم آگے
وہی پیچھے دو قدم آگے

ذہانت سے میں در گزرا
غبی پیچھے دو قدم آگے

چلی تھی سب سے آخر ماں
کھڑی پیچھے دو قدم آگے

ابھی پیچھے پلٹنا مشکل
ابھی پیچھے دو قدم آگے

کبھی پیچھے سو قدم پیچھے
کبھی پیچھے دو قدم آگے

پہنچنا ہے اُسے جلدی
تبھی پیچھے دو قدم آگے

پھسڈی رہ گئی نیکی
بدی پیچھے دو قدم آگے

بہت پیچھے دھکیلا تھا
کوئی پیچھے دو قدم آگے

کھڑے ہوکر، ظفر، ڈھونڈا
پڑی پیچھے دو قدم آگے

☆

سفر پیچھے دو قدم آگے
نہ گھر پیچھے دو قدم آگے

مرا اخبار پیچھے پیچھے
خبر پیچھے دو قدم آگے

پرندہ اُڑ رہا ہے یوں
کہ پر پیچھے دو قدم آگے

ابھی اُس شاخ سے جھولا
شجر پیچھے دو قدم آگے

نہ یوں دیوار سے ٹکرا
کہ در پیچھے دو قدم آگے

ذرا سا اور چلنا ہے
سحر پیچھے دو قدم آگے

یہ ہم ہیں جانور سارے
بشر پیچھے دو قدم آگے

بہُت اچھا زمانہ پیچھے
مگر پیچھے دو قدم آگے

ظفرؔ یہ عیب پیچھے سارے
ہُنر پیچھے دو قدم آگے

-☆-

جس جگہ تم نے کہا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں
اور جیسا بھی لگا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

لوگ میرے ساتھ والے کہاں سے پہنچے کہاں تک
جانے مجھ کو کیا ہُوا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

اس جگہ ہر سُو تُمھاری یاد کی ویرانیوں میں
مَیں ہُوں اور میرا خُدا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

سب مُجھے پاگل سمجھ کر رحم کھانے لگ گئے ہیں
شہر مُجھ کو دیکھتا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

سب گذرتے جا رہے تھے لوگ، لمحے آگے پیچھے
خواب سا اک سلسلہ پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

اِک تماشا سا لگا ہو جیسے میرے چارجانب
کون ہیں اور کون کیا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

چھوڑ رکھی ہیں جڑیں سی مَیں نے اس مٹی میں کیسی
اور کیسا ماجرا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

روز کرتا ہُوں جہاں سے چلنے جلنے کا ارادہ
لیکن اس کی کیا وجہ پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

یہ زمیں سر پر ظفرؔ چھائی ہوئی ہے جس جگہ پر
آسماں نیچے پڑا پیچھے ہوں تجی پن تیاج ابھو چھوں

-☆-

شور کیسا ہے دھیان راکھوں چھوں
کیا تماشا ہے دھیان راکھوں چھوں

کون جاتا ہے اس سڑک پہ سے
کون آتا ہے دھیان راکھوں چھوں

کون میرے علاوہ اور ترے
ناز اُٹھاتا ہے دھیان راکھوں چھوں

دل کے اندر بھی اور باہر بھی
درد کتنا ہے دھیان راکھوں چھوں

آنا جانا تو ہے مگر اُس کا
کیا ارادہ ہے دھیان راکھوں چھوں

بے دھیانی میں جو مَیں کہتا ہُوں
جو وہ سنتا ہے دھیان راکھوں چھوں

جو بھی کُچھ ہو رہا ہے چاروں طرف
دھیان رکھتا ہے دھیان راکھوں چھوں

سر میں یہ دھیان ہے مرا اپنا
یا تُمھارا ہے دھیان راکھوں چھوں

بوسۂ چشم ہے ، ظفر ، پُورا
یا کہ آدھا ہے دھیان راکھوں چھوں

☆

دھیان راکھوں چھوں: دھیان رکھتا ہُوں

اصرار نتھی ہوتوں
اے یار نتھی ہوتوں

اک بار ہُوا ہے جو
ہر بار نتھی ہوتوں

دریائے تماشا ہے
یہ پار نتھی ہوتوں

بازار جو لگتا ہے
بازار نتھی ہوتوں

بدھ وار تو ہوتا ہے
اتوار نتھی ہوتوں

انکار بھی سارا ہی
انکار نتھی ہوتوں

اب مان تو جاتا ہے
تیار نتھی ہوتوں

بے کار ہو جتنا بھی
بے کار نتھی ہوتوں

کہنا ہے ظفر کیا کچھ
اظہار نتھی ہوتوں

☆

نتھی ہوتوں: نہیں ہوتا

ہر شام نہیں ہوتوں
کیوں کام نہیں ہوتوں

ہوتا ہے اشارہ سا
پیغام نہیں ہوتوں

آغاز تو ہوتا ہے
انجام نہیں ہوتوں

انگور ہے کیوں ہوتا
کیوں آم نہیں ہوتوں

وہ خاص ہی رہتا ہے
اور عام نہیں ہوتوں

اُس کا جو ہمارے میں
ادغام نہیں ہوتوں

خط ہوتا ہے اور نیچے
بس نام نہیں ہوتوں

جب غسل کی ہو نیت
حمام نہیں ہوتوں

یہ شعر، ظفرؔ، اپنا
الہام نہیں ہوتوں

☆

کائیں کائیں کر رہا تھا کاگڑو مری گنیو
اپنی موت مر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

پھل نہیں تھا جیسے زہر کو ہی چونچ مار دی
پیڑ سے اتر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

کھا گیا تھا ایک دم ٹھگا ہوا پنیر سب
کس قدر ابھر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

ٹھنڈ لگ گئی تھی نامراد کو کسی طرح
شام سے ٹھٹھر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

موت ہی کی مستیاں تھیں اس طرح جہاں تہاں
رات بھر جدھر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

موت ہی کہیں سے اُس کو لائی گھیر گھار کر
موت ہی سے ڈر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

خیال ہے غریب کو کسی کی لگ گئی نظر
جو رات دن نکھر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

یہ سب مصیبتیں تھیں جیسے اُس کے سر پہ دیر تک
یہ سب عذاب جھر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

یہاں سے اپنی دُھن میں راز کی طرح سے اے ظفرؔ
ابھی ابھی گذر رہا تھا کاگڑو مری گنیو

☆

کاگڑو مری گنیو: کوا مر گیا

گھر سے دور کاگڑو مری گئیو
بے قصور کاگڑو مری گئیو

اڑتے اڑتے تھک گیا تھا اس قدر
چور چور کاگڑو مری گئیو

سر میں تھا کوئی عجب پڑا ہوا
جو فتور کاگڑو مری گئیو

جس کے شور سے تھیں اتنی رونقیں
وہ حضور کاگڑو مری گئیو

عقل اب ہمیں کہاں سے آئے گی
باشعور کاگڑو مری گئیو

ہوشیار پور کاگڑو نہیں
خان پور کاگڑو مری گئیو

کب سے نور کی جھلک نہیں پڑی
کوہ طور کاگڑو مری گئیو

اور تو اسی طرح ہیں ٹھیک ٹھاک
سب طیور، کاگڑو مری گئیو

کل سے وہ ظفر نظر نہیں پڑا
ہاں ضرور کاگڑو مری گئیو

☆

بول چال کاگڑو مری گئیو
خال خال کاگڑو مری گئیو

ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے روز روز
دیکھ بھال کاگڑو مری گئیو

ہاضمہ ہوا خراب آخرش
پیٹ پال کاگڑو مری گئیو

پیڑ پیڑ زہر تھا ہواؤں میں
ڈال ڈال کاگڑو مری گئیو

اس کی طرح کا ہوا نہیں کوئی
بے مثال کاگڑو مری گئیو

بات چیت میں نہیں مزہ کوئی
گول مال کاگڑو مری گئیو

یا تو لاجواب ہو گئے سبھی
یا سوال کاگڑو مری گئیو

خواب کاگڑو کی موت کیا ہوئی
ہر خیال کاگڑو مری گئیو

اب زوال ہے ظفر کے سامنے
اور، کمال کاگڑو مری گئیو

☆

پھول پات کاگڑو مری کہیو
آج رات کاگڑو مری کہیو

اُس کو یہ پسند ہی نہ آئی تھی
سُن کے بات کاگڑو مری کہیو

بھوک سے مرے گی خلق ایک دم
دال بھات کاگڑو مری کہیو

میرا نام نقش اب کہیں نہیں
میری ذات کاگڑو مری کہیو

کوئی سمت ہی کہیں نہیں رہی
شش جہات کاگڑو مری کہیو

کھیل کی بساط ہی اُلٹ گئی
جیت مات کاگڑو مری کہیو

مجھ سے دُور دُور تھا جو آج تک
میرے ساتھ کاگڑو مری کہیو

پھر وہی جفائیں اور ستم کشی
التفات کاگڑو مری کہیو

کاش یہ بھی سُن سکیں کبھی ظفرؔ
واردات کاگڑو مری کہیو

☆

پکارتے پکارتے کیاں جی پہونچیا
سدھارتے سدھارتے کیاں جی پہونچیا

کہاں سے ہم چلے تھے اور کام اپنا رات دن
بگاڑتے سنوارتے کیاں جی پہونچیا

جو ڈوب کر مرے تھے ہم کسی کے بحرِ خواب ماں
تو لاش کو اُبھارتے کیاں جی پہونچیا

بگاڑ آ گیا تو پھر زبان ہی بگڑ گئی
کہ خود کو ہی سنوارتے کیاں جی پہونچیا

نتیجہ اس کا مستقل ہی بے گھری نکل چلا
جو گھر نیا اُسارتے کیاں جی پہونچیا

نہ خواہشوں میں کوئی نظم و ضبط ہی رہا تو پھر
یہ اُونٹ ہی قطارتے کیاں جی پہونچیا

بنائی تھی جو کاغذِ ہنر پہ ایک مرتبہ
وُہ شکل ہی نکھارتے کیاں جی پہونچیا

یہ عُمر کا عذاب تھا جسے سہارتے ہُوئے
گھڑی گھڑی گزارتے کیاں جی پہونچیا

جو ایک آب زار تھا ہمارے سامنے ظفرؔ
اُسی کو پار اُتارتے کیاں جی پہونچیا

☆

دم بدم کیاں جی پہونچیا
اور، ہم کیاں جی پہونچیا

راستے تو تھے ہی مشکل ایک دم
خم بہ خم کیاں جی پہونچیا

آ رہے تھے وہ ہماری سمت، اور
خوش قدم کیاں جی پہونچیا

آتے آتے آخر ایک ہو گئے
مدح و ذم کیاں جی پہونچیا

آپ تو چلے تھے اور ہی طرف
محترم کیاں جی پہونچیا

سرخوشی میں بھی بہت اُٹھا لیے
رنج و غم کیاں جی پہونچیا

حساب تو نہیں کیا ہُوا، مگر
بیش و کم کیاں جی پہونچیا

تلاش میں کسی کی ہم لیے ہُوئے
چشم نم کیاں جی پہونچیا

تیرنا تو جانتے نہ تھے ظفر
یم بہ یم کیاں جی پہونچیا

☆

ہمارا ٹھکانا گھنوں ڈور چھے
ابھی ہم کو جانا گھنوں ڈور چھے

ہیں زندہ جسے دیکھنے کے لیے
وہ اچھا زمانہ گھنوں ڈور چھے

سو نزدیک ہے اُس کی اُمید بھی
مگر اُس کا آنا گھنوں ڈور چھے

وہ آ کر پھنسے گا، مگر دیر سے
مرا تانا بانا گھنوں ڈور چھے

ابھی صُوفیانہ چلے گا کلام
ابھی عاشقانہ گھنوں ڈور چھے

اب اپنی ہی چوکھٹ پہ سر کو جھکائیں
کہ وہ آستانہ گھنوں ڈور چھے

ابھی بھُوک اور پیاس ہے سر بسر
مرا آب و دانہ گھنوں ڈور چھے

اس آہ و فغاں پر ہی کیجے بسر
خوشی کا ترانہ گھنوں ڈور چھے

ظفر پھینکتے ہو یہ پتھر فضول
وہ آئینہ خانہ گھنوں ڈور چھے

☆

گھنوں ڈور چھے: بہت دُور ہے

گر کا کنارہ کتنوں دور چھے
ابھی وہ اِشارہ کتنوں دور چھے

لڑائی بھڑائی رہے گی ابھی
ہمارا گزارہ کتنوں دور چھے

جو پہلے کتنوں دور تھا ایک بار
وہی اب دوبارہ کتنوں دور چھے

زمیں پر اگر پھول ہے پاس پاس
فلک پر ستارہ کتنوں دور چھے

یونہی خار و خس کو سنبھالے رہو
ابھی وہ شرارہ کتنوں دور چھے

وہ نزدیک ہوتا جو تھوڑا بہت
کہ سارے کا سارا کتنوں دور چھے

وہاں بھی نہیں تھا جو اتنا نجیک
یہاں اپنا پیارا کتنوں دور چھے

وہ عینک پرانی سے دیکھے گا کیا
نیا اک نظارہ کتنوں دور چھے

کنارے پہ ہی ڈوب جاؤ ظفر
محبت کی دھارا کتنوں دور چھے

-☆-

بھلا وہ جھوٹ موٹ تو اُسے نیال تھیسی گیا
بس اتنی بات سے بھی لو اُسے نیال تھیسی گیا

ہمارا کام تو تمام ہو گیا یہیں کہیں
ہمیں یہیں پہ چھوڑ دو، اُسے نیال تھیسی گیا

نجیک دور کا نہیں سوال بات اور ہے
آپ جو بھی اب کہو اُسے نیال تھیسی گیا

خیال ہی خیال میں ہماری بات بن گئی
سمجھ سکے نہ آپ جو اُسے نیال تھیسی گیا

اتنا کچھ تو ہم نے کر لیا اُداس رہ کے بھی
کچھ تو آپ بھی کرو اُسے نیال تھیسی گیا

جو آئے ہو تو دو گھڑی کو بیٹھ جاؤ ساتھ ساتھ
یہاں سے اب نہیں اُٹھو، اُسے نیال تھیسی گیا

نکل گئی کسر تمام پچھلی اگلی آج تو
یہی سلوک اگر رکھو اُسے نیال تھیسی گیا

زبانی جمع و خرچ پر رہی گزر بسر، مگر
کچھ آج شام دوستو اُسے نیال تھیسی گیا

زبان میں جو اور اک زباں ملائی ہے ظفر
خوشی کسی کو ہو نہ ہو اُسے نیال تھیسی گیا

-☆-

اُسے نیال تھیسی گیا: ہم خوش ہو گئے

مطلع لکھا ورساد ماں
ہو اور کیا ورساد ماں

میں نے کہا، کب ملو گے
اُس نے کہا ، ورساد ماں

اندھکار[1] روشن ہو گیا
وُہ گُل کھلا ورساد ماں

وُہ شوخ پلٹا ہی نہیں
ایسا گیا ورساد ماں

آیا تو وِچّے آوشے
بھیگا ہُوا ورساد ماں

پھر ایک جیسا حال ہے
میرا ترا ورساد ماں

اُٹھ کر نہ آتا دیکھنے
گھر بیٹھتا ورساد ماں

سیلاب ماں شاید ملے
جو گُم ہُوا ورساد ماں

پیاسا بدن لے کر ، ظفر
میں چل پڑا ورساد ماں

☆

ورساد ماں: برسات میں۔

ا۔ اندھکار: اندھیرا

چوتھی کھونٹ کا مسافر

ظفر اقبال کی ''آبِ رواں'' سے لے کر اب تک کی ساری تخلیقی جدّوجہد جعلی شاعری، غیر تخلیقی رویّوں اور کلیشے کے خلاف اعلانِ بغاوت سے عبارت ہے۔ اُس کی شاعری، طلسمی باغ کی چوتھی کھونٹ میں کھلنے والی وہ کھڑکی ہے جو چتھرائے ہوئے شہر میں وا ہوتی ہے۔ بظاہر اس چوتھی کھونٹ کا رُخ کرنا امتناع میں شامل ہے کہ قدم قدم پر بہت سی اَن دیکھی مصیبتیں اور جان لیوا بلائیں، منہ کھولے مسافر کے راستے میں کھڑی ہیں، مگر خطر پسند مسافر تینوں کھونٹوں کو نظر انداز کرتا ہُوا چوتھی اور ممنوعہ کھونٹ کا رُخ کرتا ہے (کہ یہی کھونٹ غیر معمولی کامیابیوں کی ضمانت فراہم کرتی ہے) اور تمام تر مشکلات پر قابو پاتے ہوئے بالآخر اپنی تلوار سے ظالم دیو کے ٹکڑے کرنے کے بعد اجنبی دیس سے آنے والے شہزادے کے انتظار میں سال ہا سال سے بیٹھی شہزادی کی زنجیریں کاٹ ڈالتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مسافر کے ظفر مند قدموں کی چاپ سے سویا ہُوا شہر جاگ اُٹھتا ہے۔

جدید غزل گو شعرا میں ظفر اقبال ہی وہ خطر پسند مسافر ہے جس نے اپنا گھوڑا ادب کی چوتھی اور ممنوعہ کھونٹ میں اُتارنے کا ''رسک'' لیا اور نتیجتاً شاعری کا ایک نیا شہر دریافت کیا، اُس نے کلیشے کے طاقت ور دیو کو اپنے قلم کی تیز دھار تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور وہ طویل عرصے سے یرغمال بنائی گئی شاعری کی شہزادی کی زنجیریں کاٹ کر اُسے اندھے کنوئیں کے حبس موسموں سے نکال کر تازہ اور کھلی ہواؤں میں لے آیا۔ جہاں اب وہ شفاف فضا اور دُور تک پھیلی روشنی میں سانس لے سکتی ہے۔ چوں کہ وہ معلوم سے آگے کی خبر لایا، اس لیے اُس کی شاعری انکشاف اور دریافت کے زمرے میں آتی ہے اور یہ بات تو ادب کا عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ دریافت اور انکشاف بڑی شاعری کے دو بنیادی عناصر ہیں جو کسی بھی زبان کی شاعری کو اعلیٰ شاعری کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔ ظفر اقبال کہتا ہے:

جو معلوم نہیں اُس کی دیتا ہُوں خبر
جو دیکھا ہی نہیں ، دکھایا کرتا ہُوں

ادب کا ایسا کون سا قاری ہے جو ظفر اقبال کی زبان کے حوالے سے مخصوص اپروچ سے واقف نہیں مگر اُس کی لسانی تشکیلات کے خلاف بات کرنا فیشن سے آگے بڑھ کر اب کلیشے کا روپ اختیار کر چکا ہے، اُس کے معاصر اس حوالے سے بات کرتے ہوئے اب بھی ہچکتے ہیں۔

جو ناقدین اُس پر زبان کی توڑ پھوڑ کا الزام لگاتے ہیں، وہ بڑی حد تک غلطی پر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس

ساری اکھاڑ پچھاڑ کے دوران اُس نے زبان کو توڑنے پھوڑنے کے بجائے اُسے نئے سرے سے دریافت کیا۔ اُس کے اپنے لفظوں میں اُردو زبان کے جو قدیم سوتے اُس پر بند ہو چکے تھے، اُس نے اُنھیں دوبارہ جاری کر دیا۔ اُس نے لفظوں کے درمیان نئے معانی اور تعلقات دریافت کیے اور زبان کے اُن رشتوں کی طرف توجہ دلائی جو کثرتِ استعمال سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ اس سارے عمل کے دوران اُس نے اُردو کو نئی طاقت اور توانائی بخشی اور اس کے سکڑتے ہوئے دامن کو وسیع کیا۔ اُس کی لسانی تشکیلات سے اُردو سے زیادہ اپنی مادری زبان کے لیے محبت جھلکتی ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے یہ وہ آزادیاں ہیں جنھیں نئے غزل گو انجوائے کر رہے ہیں۔ ظفر اقبال کی ساری تخلیقی سرگرمی، شاعری (خصوصاً غزل) کی آب و ہوا تبدیل کرنے کے گرد گھومتی ہے۔

نکل جاتا رہوں گا جس طرف بھی جی میں آئی
جو بھی تبدیلی آب و ہوا کرتا رہوں گا

اور اس تبدیلی آب و ہوا کے دوران اُس نے شاعری کے نئے منطقے دریافت کیے ہیں۔ یہ تبدیلی آب و ہوا دراصل غزل کو اندر سے تبدیل کرنے کی تحریک ہے۔ اُس کی غزل محض ایک ''باوضو'' شاعری کی غزل نہیں بلکہ اس کے ہاں جنسی معاملات سے لے کر طنز و مزاح، پھکڑ بازی اور نقش نگاری تک کے تمام رنگ ملتے ہیں۔ اس لیے آپ اس کی غزل کو ایک پورے انسان کی غزل کہہ سکتے ہیں۔ غزل کو اندر سے بدلنے کی تخلیقی جدوجہد کے نتیجے میں اس کی غزل نے ایک نئی انگڑائی لی ہے، جس سے اس کی غزل کو ایک نئی انفرادیت اور توانائی ملی ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کے نتیجے میں وہ ہر دور میں خود کو اپ ٹو ڈیٹ رکھتا ہے۔

ہمارے ارد گرد بہت سے شعرا ہیں جو غزل کو اندر اور باہر سے سنگسار کرنے میں مصروف ہیں مگر ظفر اقبال غزل کو اندر سے توانا اور روشن کرنے کی مہم پر نکلا ہے، یہ وہ راستہ ہے جس پر چلنے کا ''رسک'' شہرت کے راستوں پر سرپٹ بھاگتے ہوئے ہمارے پاپولر شاعر کبھی نہیں لے سکتے۔ یہ رسک تو صرف وہی لے سکتا ہے جو شہرت کے تاج کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہوئے کوئی نئی راہ، کوئی نیا اسلوب دریافت کرنے کا آرزومند ہو۔

نکل ہی آئے گا کوئی تو اَن سُنا اسلوب
کہی جو بات کسی اَن کہے طریقے سے

اُس کی شاعری کا بنیادی نقطہ شاہراہِ عام کے بجائے خار دار جنگل سے ہو کر گزرنے سے عبارت ہے۔ وہ جیدوہ راہوں پر چلنے کا عادی نہیں۔

ظفر مجھ کو پسند آتا بھی کیا ان میں سے آخر
کبھی سیدھے تھے اُلٹا راستہ کوئی نہیں تھا

وہ جادہ پیمائی کے بجائے جادہ سازی کرتا ہے، وہ غیر دریافت شدہ راستوں کا مسافر ہے۔ وہ گھنے جنگل کے سفر میں جہاں جہاں سے گزرتا ہے اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے رستے بچھاتا چلا جاتا ہے۔ اُس نے اپنے لیے جو راستہ چنا وہ ایک عرصے سے بڑی استقامت کے ساتھ اُسی پر گامزن ہے۔ لوگ اُس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اُسے اس بات کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔ البتہ وہ یہ بات جاننے کا ہمیشہ آرزومند رہتا ہے کہ نئی نسل اس کے بارے میں کیسے سوچتی ہے۔ ''نئی نسل کے تخلیق کار'' ہی وہ معیار ہے جس کے حوالے سے وہ خود کو اپ ڈیٹ کرتا رہتا ہے۔

برابر ہیں ظفر میرے لیے تحسین و تنقیص
میں اپنا کام ان سے ماورا کرتا رہوں گا

یلغار ہے دُنیا کی ظفر ایک طرف اور
میں ایک طرف، میرا کہا ایک طرف ہے

ظفر اقبال اپنی سرشت کے اعتبار سے ایک بُت شکن شاعر ہے۔ اس نے گروہ بندی کے اسیر ادبی ماحول میں کسی بڑے ''ادبی بُت'' کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بجائے ادب میں ہر قسم کی بُت پرستی کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بُت شکنی کے ساتھ ساتھ خود شکنی سے بھی باز نہیں آتا۔ اُسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ اپنی ذات پر حملے کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنا شعری امیج بناتا ہے، توڑ دیتا ہے، پھر بناتا ہے اور پھر توڑ دیتا ہے۔ ایک اضطرابِ مسلسل ہے جو اُسے تخلیقی سفر میں اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ وہ اُن ایک آدھ شعرا میں سے ہے جو اپنے تخلیقی کام پر شک کی نظر ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ قدرت نے اُسے خود تنقیدی کے اعلیٰ ملکے سے نوازا ہے، اس لیے وہ اپنے ''کیے کرائے'' پر ہر وقت پانی پھیرنے پر تُلا رہتا ہے۔ آج پوری اُردو دنیا میں اُس کی جس شاعری کی دھوم ہے وہ اپنی خود تنقیدی کے زیرِ اثر اُسی شاعری کے بارے میں کیسے سوچتا ہے؟ چلتے چلتے ملاحظہ کیجیے:

شاعری اور طرح کی اسے کہتے ہو ظفر
میں پریشاں ہوں کہ یہ شاعری ہے بھی کہ نہیں

دراصل وہ ایک غیر معمولی اور غیر روایتی شاعر ہے جس نے روایتی شعری و تنقیدی بوطیقا کو ایک منصوبے کے تحت مسترد کر دیا اور ناقدینِ ادب سے نئے تنقیدی سانچوں کا تقاضا کیا اور یہی غالباً ممتاز ناول نگار آندرے بریتون (Andre Beton) اور ظفر اقبال کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ اُس نے ساٹھ کی دہائی میں ''آبِ رواں'' کے ذریعے ادب کے ٹھہرے ہوئے پانی کو روانی دی، کیوں کہ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ٹھہرا ہوا پانی اور ٹھہرا ہوا سوچ، دونوں سڑاند پیدا کرتے ہیں۔

ظفر اقبال نے تنگنائے غزل کی شکایت کیے بغیر ساری زندگی غزل کو ذریعۂ اظہار بنائے رکھا۔ (اس کی تمام شاعری کا ننانوے فی صد غزل ہی پر مشتمل ہے) اور یہ ایسی غزل ہے جسے انیس ناگی جیسا غزل دشمن نقاد بھی تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ظفر اقبال کی غزل کا ایک طلسم یہ بھی ہے کہ وہ بے معنویت سے معنویت، بے ترتیبی سے ترتیب، غیر سنجیدگی سے سنجیدگی، عدم توازن سے توازن اور نیستی سے ہستی اُبھارتا ہے۔ وہ روایت شکن سہی مگر غزل کی روایت کے زندہ عناصر کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس نے غزل میں جو تبدیلیاں کیں وہ روایت سے

عدم واقفیت کی بنا پر نہیں بل کہ غزل کے رمز آشنا کی حیثیت سے ہی ممکن ہو سکیں۔ ظفر اقبال نے اپنی شاعری کے اندر ایک نیا دریچہ کھولا ہے جہاں سے غزل کو نہ صرف تازہ ہوا، حرارت اور روشنی ملی بل کہ اس دریچے سے غزل کا طالب علم اپنے عہد کی غزل کا نظارہ بھی کر سکتا ہے۔

لمحۂ موجود کے شعرا میں ظفر اقبال ایسا شاعر ہے کہ نئی نسل جس سے مکالمہ کرنا پسند کرتی ہے، اور وہ بھی نئے شاعروں کی طرف ہمیشہ دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور ان کی تعریف کے سلسلے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا جب کہ اُس کے معاصرین میں ایسے بھی ہیں کہ اگر انھیں کبھی کسی نوجوان شاعر کی شاعری کے بارے میں چند کلمات ادا کرنے پڑ جائیں تو اُن کی حالت دیدنی ہوتی ہے اور ایسے میں وہ تعریف سے بچنے کے لیے موسم کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں مگر اس سلسلے میں ظفر اقبال کا ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے وہ تو دور دراز کے علاقوں میں بیٹھے گم نام شاعروں کی ایک آدھ غزل پڑھنے کے بعد ان پر پورا کالم لکھ دیتا ہے کیوں کہ اچھی شاعری اُس کی پہلی اور آخری ترجیح ہے۔

ظفر اقبال اپنی مکالمہ پسندی، برداشت اور دوسروں کے لیے قبولیت کے جذبات رکھنے کی وجہ سے جمہوری مزاج رکھنے والا شاعر ہے۔ آپ اُس سے اختلاف رکھنے کے باوجود اُس کے حلقۂ یاراں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ وہ اختلافِ رائے کے حوالے سے دشمنی پر اتر آنے کے بجائے آپ کی رائے کا ہمیشہ احترام کرے گا۔ اس لیے مسعود احمد سے لے کر مقصود وفا، اطہر ناسک، انجم سلیمی، عماد اظہر اور شارترابی جیسے نئی نسل کے نمایندہ ترین شاعر، چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود اس کی غزل کے "کشتگان" میں شامل ہیں۔

ٹی ایس ایلیٹ کا کہنا ہے کہ ہر نسل اپنا ادبی ذوق اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہے اور اسی ذوق کی بنا پر فن سے نئے نئے تقاضے کرتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑی ہماری نئی نسل کا ذوقِ شعر دن بہ دن بدل رہا ہے اور اس نے حریص پبلشرز اور شہرت کے زنداں میں قید پاپولر شعرا کی ملی بھگت سے مارکیٹ میں پھیلائے گئے تھرڈ ریٹ لٹریچر کو مسترد کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے ظفر اقبال کی شاعری میں موجود ماڈرن سینسی بلٹی (Modern Sensibility) کو نمو دینے کے لیے جس شعری ذوق کی ضرورت ہے، نئی نسل اُس سے پوری طرح مالا مال ہے۔ لہٰذا ظفر اقبال کی شاعری بدلتے ہوئے شعری مذاق کے لیے بہت بڑی خوش خبری کا درجہ رکھتی ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری میں ایک بدلا ہوا تصورِ کائنات سامنے آتا ہے، وہ نہ تو غالب کی طرح سات آسمانوں کے نظریے کا قائل ہے اور نہ ہی سودا کی طرح زمین اسے بیل کے سینگ پر رکھی نظر آتی ہے بل کہ اس نے اقبال، مجید امجد، شہزاد احمد اور جاوید شاہین کی طرح حیات و کائنات کے حوالے سے خالص سائنسی انداز میں بڑے بنیادی اور اہم ترین سوالات اُٹھائے ہیں۔ اور یہ سوالات تاہم ایسے نہیں، کہ کائنات کی ہیئت، اس کے کام کرنے کے طریق اور ہمارے تخیل سے بھی زیادہ وہ عظیم خلا کے درمیان پائے جانے والے نوری فاصلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کائنات کی ساخت کے حوالے سے اس قسم کے اہم سوال بھی اُٹھاتا ہے کہ ہم کس قسم کی کائنات کے باشندے ہیں؟ کیا ہم ایک بہت بڑی کائنات میں رہتے ہیں یا یہ سلسلہ کائنات پوری کائنات ہے؟ اور کیا اس کائنات کا کوئی دوسرا کنارہ بھی ہے؟ اور اگر ہے تو اس کے پار کیا ہے؟ ایسے ہی سوالات پر مشتمل ظفر کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

کچھ مجھ کو بتائیں گے تو ہوگا مجھے معلوم
کیا دوسری جانب ہے تو کیا ایک طرف ہے؟

وہ چاندنی کسی اور آسماں کی ہے جو ابھی
نظر سے دور ہے، دل کے قریں چمکتی ہے

اس ایک طرف میں بھی تو کہتے ہیں کئی اور
ہر سمت کی اپنی ہی جدا ایک طرف ہے

یہ بھی ہے موجودگی کی ایک شکل
ہر طرف جو یہ خلا موجود ہے

اطراف ہیں کتنی کہ پتا کچھ نہیں چلتا
کچھ بھی نہ سمجھنے کی سزا ایک طرف ہے

چاروں سمت چھلکتا رہتا ہوں ہر دم
کائنات سے میری ذات زیادہ ہے

ظفر اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کے پس منظر میں ایک بچے جیسی معصومیت اور بے چارگی کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے حوالے سے تفکر اور تحیر کے وہ عناصر بھی کارفرما ہیں جن سے ہمیشہ بڑی شاعری کا خمیر اٹھتا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری کے حوالے سے اہم ترین سوالات علمی حلقوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہ سوالات ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ اس عہد کا متنازع ترین شاعر ہے۔ ان سوالوں میں سے کچھ تو محض سوالات ہی ہیں مگر بعض سوالات کسی حد تک جینوئن ہیں۔ ان سوالوں کا ظفر کی شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ میرے خیال میں ظفر کو چاہیے کہ وہ ان سوالوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان پر کان دھرے کہ شاعر کو ہمیشہ کہنے کی عادت کو ترک کر کے کبھی کبھی دوسروں کو "سننا" بھی چاہیے۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ اگر میں دوسروں کی باتیں سنتا رہتا تو یہ کچھ نہ کر پاتا۔ نیز یہ بھی کہ میرے معترضین کے ہر سوال کا جواب خود میری شاعری کے اندر موجود ہے۔

ڈاکٹر جواز جعفری

-☆-

تشکیک

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

غلام محمد قاصر

سیّدہ سیفو کے لیے

یہ ایک امانت ہے جس کو لوٹانا چاہتا ہوں
ترے ستارے مرے ستاروں میں رہ گئے ہیں

یہ نہیں کہتا کہ دوبارہ وہی آواز دے
کوئی آسانی تو پیدا کر، کوئی آواز دے

میں اُسے سُن کر بھی آنے کا نہیں، مجبور ہُوں
پھر بھی، اپنے خواب خانے سے کبھی آواز دے

ہو سکے دونوں زمانوں میں ہم آہنگی کوئی
مَیں پُرانا ہُوں تو کیا، مجھ کو نئی آواز دے

موت کے ساحل پر استادہ ہُوں، تُو مجھ کو کہیں
زندگی کے پانیوں میں ڈوبتی آواز دے

ٹھیک ہے، تُو نے پکارا ہوگا جس تس کو، مگر
میرے حصّے میں کوئی آئی ہُوئی آواز دے

بن بلایا ہی چلا آؤں گا مَیں شاید کبھی
لیکن اتنے شور میں تُو آپ بھی آواز دے

مَیں اُسے پہچان ہی پاؤں نہ پہلی بار تو
کوئی آوازوں کے جنگل میں گھری آواز دے

مُنہ سے کُچھ کہہ تو سہی اس خامشی کے آر پار
مُستقل کو چھوڑ، کوئی سرسری آواز دے

تُو نے تو ہر حال میں سُننا ہے، اب تجھ کو، ظفر
روشنی آواز دے یا تیرگی آواز دے

☆

پھول پتے، چاند سُورج تھے جہاں آواز تھی
وہ زمیں آواز تھی یا آسماں آواز تھی

تازہ کر دیتی تھی مُرجھائے ہُوئے اس جسم کو
اس طرح کی وہ بہارِ بے کراں آواز تھی

رات بھر جاری تھا آبِ خواب پر میرا سفر
بے سروسامانیوں میں بادباں آواز تھی

اپنے ہونے کا یقیں رہتا تھا مجھ کو دم بدم
بے بسی میں بھی وہ ایسی مہرباں آواز تھی

ایک خوشبودار، ہلکا سا اشارہ، اور پھر
مَیں ہمہ تن گوش تھا، اور بعد ازاں آواز تھی

کچھ مجھے اُس کا یقیں بھی ٹھیک سے آتا نہ تھا
وہم کی تصویر تھی وہ، یا گُماں آواز تھی

میرے کانوں اور آنکھوں کو بھلی لگتی تھی جو
وہ بیاں تھا، یا کوئی رنگِ بیاں آواز تھی

جال سا اک بُن رکھا تھا اُس نے میرے چار سُو
رات ہو، دن ہو، جہاں مَیں تھا وہاں آواز تھی

دن کو سُنتا اور رستہ بھول جاتا تھا ظفر
میری خاطر اس طرح کی داستاں آواز تھی

☆

کچھ پتا چلتا نہیں کس طرح کی آواز ہے
ان اندھیروں میں یہ تُو ہے یا تری آواز ہے

کچھ دنوں سے کر رہا تھا جس پہ سارا انحصار
آدمی سمجھا تھا میں لیکن کوئی آواز ہے

مجھ کو باہر سے بھی گھیرے میں لیے رکھتی ہے وہ
میرے اندر بھی وہی آہٹ، وہی آواز ہے

راستہ تاریک راتوں میں سُجھاتی ہے مجھے
کیا مسافت ہے کہ جس میں روشنی آواز ہے

ایک اُسی آواز کا یہ رنگ تھا کچھ اور بھی
ورنہ مَیں سمجھا تھا کوئی دوسری آواز ہے

یہ برابر میں جو بج اُٹھتی ہے باجے کی طرح
اصل میں اک دُور سے آتی ہُوئی آواز ہے

مَیں گلے سے بھی لگا سکتا ہُوں جب چاہوں اُسے
یہ نہ سمجھو صرف یہ آواز ہی آواز ہے

عکس بھی اس میں جھلک جاتا ہے کوئی بار بار
جو کبھی تو آئنہ ہے اور کبھی آواز ہے

ایک سناٹا سا ہے چھایا ہُوا ہر سُو، ظفرؔ
اور اس میں یہ ہماری آخری آواز ہے

☆

دیر تک آتی ہوئی یا مختصر آواز تھی
سربسر پیکر تھا کوئی، سربسر آواز تھی

اُس میں اب ملتی کہاں سے کچھ مجھے اپنی خبر
وہ تو اپنے آپ سے بھی بے خبر آواز تھی

لگ رہی تھی کوئی رونق سی مرے چاروں طرف
رات بھر تنہا تھا میں، اور رات بھر آواز تھی

مَیں کہیں موجود ہی کب تھا اس اپنے شہر میں
اور، میری جُستجو میں دربدر آواز تھی

فاصلہ دونوں میں اتنا تھا کہ طے ہوتا بھی کیا
آسماں پر آرزو، اور خاک پر آواز تھی

کر گئی نقصان بھی دراصل بے پایاں مرا
وُہ جو ظاہر میں تو اتنی بے ضرر آواز تھی

مَیں تو اک مُشتِ خس و خاشاک تھا، جیسا بھی تھا
اور، میرے واسطے وہ اک شرر آواز تھی

کوئی منزل ہی نہ تھی دونوں کی دشتِ خواب میں
ورنہ کہنے کو تو میری ہم سفر آواز تھی

لمس کی گرمی کہاں سے آئی تھی اُس میں، ظفرؔ
یہ اگر وُہ خود نہیں تھا، یہ اگر آواز تھی

☆

اس اندھیرے میں اگر بندِ قبا درکار ہے
راہیِ خوابِ ہوس کو اور کیا درکار ہے

کھانے پینے کا ابھی کیا ذکر ہے، فی الحال تو
سانس لینے کے لیے مجھ کو ہوا درکار ہے

مجھ کو دونوں ہی عجائب چاہییں، اے خوبرو
یہ الگ درکار ہے، اور وہ جدا درکار ہے

میں ہی جم کر اک جگہ پہ بیٹھنے والا نہیں
اس لیے بھی کوئی مجھ کو جابجا درکار ہے

میں بھکاری ہوں، مجھے خیرات کی ہے جستجو
وہ غنی ہے، کوئی اس کو بھی گدا درکار ہے

چاہتا ہوں میں بھی معشوق اپنی ڈھب کا ہو کوئی
آدمی اس کو بھی کوئی کام کا درکار ہے

اپنی خاطر اس زمین و آسماں کے درمیاں
اور ہی اک طرح کی مجھ کو فضا درکار ہے

اس خدائی کی رنگارنگی میں کیوں مجھ کو یہاں
ایک سیدھا اور سادہ سا خدا درکار ہے

بے زباں ہوں، اور، مجھ کو بات کرنی ہے، ظفر
چل نہیں سکتا ہوں، لیکن، راستہ درکار ہے

اور بھی اس کی طرف سے پیش و پس درکار ہے
کس لیے ہے، چھوڑیے یہ بات، بس درکار ہے

کس بہانے سے میسّر ہو، پتا چلتا نہیں
خواب گاہِ ناز تک جو دسترس درکار ہے

گھیر کر لاؤ اگر اس کو تو مانیں گے تمھیں
یعنی وہ ہوتا نہیں جوش سے مَس، درکار ہے

اپنے لالچ میں اضافہ ہو رہا ہے روز و شب
ایک جو درکار تھا پہلے، وہ دس درکار ہے

پھڑپھڑاؤں جس سے میں آزاد ہونے کے لیے
جانے کیوں مجھ کو کوئی ایسا قفس درکار ہے

آنے والی اک ہوا کو پیش کرنے کے لیے
مجھ کو یکسو اپنا سارا خار و خس درکار ہے

آنے ہی والی ہے مجھ میں رنگِ زر کی آب و تاب
اور، مجھے اس کیمیا کا ایک مَس درکار ہے

میرے چاروں سمت ہر شے کی فراوانی ہے، اور
جو مجھے درکار ہے، وہ بھی عبث درکار ہے

اک ہوا مطلوب ہے باغِ محبت کو، ظفر
اور، پھولوں کو مہک، پتوں کو رس درکار ہے

کچھ یہاں درکار ہے اور کچھ وہاں درکار ہے
اس زمیں کے ساتھ مجھ کو آسماں درکار ہے

اس دفعہ رنگِ تماشا اور ہے جس کے لیے
اور ہی کوئی مجھے تاب و تواں درکار ہے

کچھ تو چیزوں کی میں قیمت بھی ادا کرنے کو ہوں
اور ، کچھ سامان مجھ کو رائگاں درکار ہے

برق ہے کوئی کہ اب جس کی سہولت کے لیے
شاخِ دُنیا پر مجھے ایک آشیاں درکار ہے

دیر سے خالی پڑا ہے ، اور غیر آباد سا
آ بسے جس کو کرایے پر مکاں درکار ہے

جب مرے آثار ہی کا کچھ نہیں باقی سُراغ
اب کہیں اُس کو مرا نام و نشاں درکار ہے

ماجرا ہے ایک ایسا بھی کہ مجھ کو آج کل
داستاں در داستاں درکار ہے

عاقبت اکثر نے تو کر لی یہاں خود ہی خراب
اور اب کس کو مرا طرزِ بیاں درکار ہے

ذائقہ چکھنے سے پہلے یہ نہیں سوچا ، ظفر
ہے اگر درکار تو مجھ کو زباں درکار ہے

☆☆☆

خاک اُڑانے کے لیے ، رہنے کو گھر درکار ہے
اک بیاباں جو مجھے بارِ دگر درکار ہے

لمحہ بھر کے واسطے کافی جسے سمجھا تھا میں
اب ہُوا ظاہر کہ مجھ کو رات بھر درکار ہے

حال پر میرے تمھاری مہربانی ان دنوں
آپ ہی اندازہ کر لو جس قدر درکار ہے

بے ضرورت بھی بہُت ، اور مُنہ سے بھی کہتا نہیں
کوئی شے حالاں کہ مجھ کو سربسر درکار ہے

راستہ صحرا سے ہو باہر نکلنے کا کوئی
زندگی کی دُھوپ میں مجھ کو شجر درکار ہے

ایک آسانی مجھے بھی ، اور سب کو بھی یہاں
جابجا مطلوب ہے اور ، دربدر درکار ہے

کچھ ارادہ تو نہیں میرا سفر کا اب کی بار
احتیاطاً کچھ مجھے رختِ سفر درکار ہے

بات کرنے کی اجازت سے ہُوں بے پروا ، مگر
بات یہ ہے ، بات میں مجھ کو اثر درکار ہے

آج کل اخبارِ دل میں کام کرتا ہُوں ، ظفر
آج بھی مجھ کو کوئی تازہ خبر درکار ہے

☆☆☆

آگ کا رشتہ نکل آئے کوئی پانی کے ساتھ
زندہ رہ سکتا ہُوں ایسی ہی خوش امکانی کے ساتھ

تم ہی بتلاؤ کہ اُس کی قدر کیا ہو گی تمہیں
جو محبت مُفت میں مِل جائے آسانی کے ساتھ

بات ہے کچھ زندہ رہ جانا بھی اپنا آج تک
لہر تھی آسودگی کی بھی پریشانی کے ساتھ

چل رہا ہے کام سارا خوب مِل جُل کر یہاں
کُفر بھی چِمٹا ہُوا ہے جذبِ ایمانی کے ساتھ

فرق پڑتا ہے کوئی لوگوں میں رہنے سے ضرور
شہر کے آداب تھے اپنی بیابانی کے ساتھ

یہ وہ دُنیا ہے کہ جس کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں
ہم گزارہ کر رہے ہیں دُشمنِ جانی کے ساتھ

رایگانی سے ذرا آگے نکل آئے ہیں ہم
اس دفعہ تو کچھ گرانی بھی ہے ارزانی کے ساتھ

اپنی مرضی سے بھی ہم نے کام کر ڈالے ہیں کچھ
لفظ کو لڑوا دیا ہے بیشتر معنی کے ساتھ

فاصلوں ہی فاصلوں میں جان سے ہارا ظفرؔ
عشق تھا لاہوریے کو ایک مُلتانی کے ساتھ

☆

سنگ بھی موجود ہوں گے آئنہ خانوں کے ساتھ
کچھ حقیقت بھی ہُوا کرتی ہے افسانوں کے ساتھ

تم اگر ایسے نہیں ، مِلتے مِلاتے تو رہو
آپ ہی انسان بن جاؤ گے اِنسانوں کے ساتھ

رُک گئے تھے ہم تمھارے دل میں تھوڑی دیر کو
کیا سلوک ایسا کیا کرتے ہیں مہمانوں کے ساتھ

اس تماشے میں ہماری نوعیت کچھ اور تھی
ناپتے تھے تم ہمیں کچھ اور پیمانوں کے ساتھ

صاحبِ خانہ سے تو کچھ کہہ نہ سکتے تھے ، مگر
اپنا جھگڑا ہی رہا دن رات دربانوں کے ساتھ

خاک اُڑاتے ہم اُدھر کو بھی نکل جاتے کبھی
کچھ اگر باغات بھی ہوتے بیابانوں کے ساتھ

اپنے ذمّے تھی شکست و ریخت جو بھی ، کر چکے
اور ، چپکے سے گذر آئے ہیں طوفانوں کے ساتھ

کھول کر آنکھیں گذرتا ہُوں جو اِن آثار سے
کوئی آبادی بھی ہو سکتی ہے ویرانوں کے ساتھ

سربسر اپنوں کو جیسے دیکھ بیٹھے ہو ، ظفرؔ
کچھ دنوں سے خوش بہت پھرتے ہو بیگانوں کے ساتھ

☆

رفتہ رفتہ لگ چکے تھے ہم بھی دیواروں کے ساتھ
حشر اپنا بھی یہی تھا، ہم بھی تھے ساروں کے ساتھ

ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے دل میں ہر گھڑی
ساتھ ہیں پیارے ہمارے، ہم نہیں پیاروں کے ساتھ

لگ گئی تھی موت کی اپنی بھی چھوٹی سی خبر
آخر اپنا بھی تعلّق تھا ان اخباروں کے ساتھ

آ رہی ہے اُن کی بُو اپنے اندر بھی کہیں
ہیں رعایا ہی، مگر رہتے ہیں سرداروں کے ساتھ

فرض کچھ پگڑی بچانا بھی ہے، لیکن ایک دن
دیکھنا، سر بھی چلے آئیں گے دستاروں کے ساتھ

دُور سے تو فرق ہی کوئی نظر آتا نہیں
اس طرح رل مل گئے ہیں پھول انگاروں کے ساتھ

ہو گئی ہے شکل ہی تبدیل درباروں کی اب
ورنہ ہم بھی کم نہیں وابستہ درباروں کے ساتھ

پڑ گئے تھے رائیگاں پہچان کے چکّر میں ہم
اپنی مرضی سے جو ہم اُڑتے نہیں ڈاروں کے ساتھ

بے تعلّق بھی ہے وہ، ہم نے بھی ہے اب تک، ظفر
رابطہ جوڑا ہُوا ٹوٹے ہُوئے تاروں کے ساتھ

-☆-

ہر طرح سے مطمئن ہیں اپنی یکتائی کے ساتھ
ساتھ ہے تنہائی اپنے، ہم ہیں تنہائی کے ساتھ

مار رکھیں گے بہت اوروں کو بھی، اب کیا بتائیں
ورنہ مر تو جائیں گے ہم اپنی ہی آئی کے ساتھ

وہ کچھ اپنے آپ اُتھلے پانیوں میں آ گیا
ورنہ چاہا تھا اُسے ہم نے تو گہرائی کے ساتھ

جیسے تیسے یہ ہمارا حوصلہ ہی تھا کہ ہم
جی رہے تھے جو محبت اور مہنگائی کے ساتھ

ناشناسا ہی سہی، اور دُور بھی، لیکن کبھی
آ ہی نکلے گا وہ ساری اپنی رعنائی کے ساتھ

لُطف لو تم بھی کبھی زنجیر کی جھنکار کا
چار دن تم بھی گزارو اپنے سودائی کے ساتھ

گانو میں تو، شکر ہے، واقف نہیں ہے کوئی بھی
شہر میں رہتے تھے، لیکن کتنی رُسوائی کے ساتھ

صلح بھی کم بخت کر لیتے ہیں آخر بعد میں
ورنہ بھائی کو لڑا سکتے تو ہیں بھائی کے ساتھ

عشق میں اپنی، ظفر، شہرت ہے کچھ ایسی کہ ہم
بے وقوفی بھی کیا کرتے ہیں دانائی کے ساتھ

-☆-

ہمیں تلاش کسی کی نہیں، کوئی مل جائے
مگر ملے تو ملے آج ہی، ابھی مل جائے

یہی بہت ہے، اسی پر گزارہ کر لیں گے
وہ چومنے کو نہیں، دیکھنے کو ہی مل جائے

ہمیں ابھی اُسے تفصیل سے نہیں ملنا
کسی دن آئے یہاں، اور سرسری مل جائے

اسی سے کام چلا لیں گے جوڑ جاڑ کے ہم
اگر کہیں کوئی خواہش کٹی پھٹی مل جائے

اس اشتراک سے تو ایک بھی نہیں رہتی
محبتوں میں اگر رنگ دوستی مل جائے

اسی کی قدر بھی ہوتی ہے کچھ ہمیں جو یہاں
زیادہ تر نہ ملے اور، کبھی کبھی مل جائے

گزر رہی ہے اندھیروں میں بھی ہماری، مگر
ہے کیا ہی بات جو تھوڑی سی روشنی مل جائے

بھرا ہے شہر مگر یہ بھی شرط ہے کہ تمھیں
مرے سمیت اگر کوئی آدمی مل جائے

اب اُس کا شکر ادا کیجیے کہ شکوہ، ظفر
جو راہ چلتے مصیبت کوئی نئی مل جائے

☆

کم سے کم ملا ہو یا بہتر میسر ہو
اس کا شکر ادا کیجے جس قدر میسر ہو

جو بھی چاہیے سب کو، احتیاج ہو جس کی
جا بجا مہیا ہو، دربدر میسر ہو

کوئی دُور کی دُنیا منتظر ہو، ساتھ اس کے
رہگذر میسر ہو، اور سفر میسر ہو

جس طرف نہ ہو کچھ بھی، جائیں گے اُسی جانب
اس طرف نہیں جاتے ہم جدھر میسر ہو

زندگی جو ہے اپنی جستجو تمھاری ہے
پھر ہمارا جینا کیا تم اگر میسر ہو

اک شجر میسر ہو دھوپ کے زمانے میں
اور، چھوڑ جانے کو ایک گھر میسر ہو

اس گھنے اندھیرے میں روشنی تو ہو کوئی
جانے خانۂ خس کو کب شرر میسر ہو

کچھ کمی کسی صورت پھر بھی رہ گئی ہر بار
یہ کبھی نہیں ہوتا سربسر میسر ہو

ظلم، اے ظفر، اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا
عیب ہو مجھے درکار، اور ہنر میسر ہو

☆

روز سانس لینے کو گر ہوا میسر ہو
اس کے بعد خلقت کو اور کیا میسر ہو

اور چاہیے ہم کو کیا جہانِ فانی میں
خلق سے رہے گپ شپ ، اور ، خدا میسر ہو

در کہیں نکل آئے اس فصیل میں کوئی
اور ، آنے جانے کو راستہ میسر ہو

ہر طرح سے پوری ہوں سب ضرورتیں اپنی
اس کے ساتھ یہ سب کچھ اک جگہ میسر ہو

زندگی بھی ہو آساں ، موت بھی نہ ہو مشکل
یہ الگ ملے ہم کو ، وہ جدا میسر ہو

حُسن بھی وہی کچھ تھا ، عشق بھی یہی کچھ ہے
اب تو اور ہی کوئی سلسلہ میسر ہو

سب فضائیں اس کی ہیں ، کچھ نہیں کہیں اپنا
ہم کو اپنے حصے کی بھی فضا میسر ہو

کچھ نیا نویلا بھی شور ہے ہمیں درکار
یہ بھی کیا کہ ہنگامہ ایک سا میسر ہو

چھوڑیے ، ظفر صاحب یہ مرض نہیں ایسا
جس کی آپ کو اب کے پھر دوا میسر ہو

-☆-

اس طرح کی عیاشی پھر کہاں میسر ہو
اس زمیں کے اوپر جو آسماں میسر ہو

وہ سفر کٹے گا کب ، اور کس طرح ، جس میں
بند ہو ہوا چاہے ، بادباں میسر ہو

گوشہ ایک ایسا ہی چاہیے کہیں ہم کو
دوسروں سے ہٹ کر بھی تو جہاں میسر ہو

پیش و پس نہ ہو کوئی اس کے ملنے جلنے میں
قبل ازیں ہو ارزانی ، بعد ازاں میسر ہو

قبضہ ہی جما کر کیوں لوگ بیٹھ جاتے ہیں
چار دن کرائے پر جو مکاں میسر ہو

کچھ تو ہم خریدیں گے بیچ کر بھی اپنا آپ
کچھ ہمیں سروساماں رائگاں میسر ہو

بجلیاں بھی کچھ اس کا خود خیال رکھتی ہیں
اس نواح میں جس کو آشیاں میسر ہو

سوچنے سمجھنے کی پھر کہاں ہے گنجائش
ہم سخن ہو جب پیدا ، ہم زباں میسر ہو

رنگ ہے ، ظفر ، اس کا سب اڑا اڑا سا بھی
رنگ کے علاوہ بھی تو بیاں میسر ہو

-☆-

کسی کو خوش تو کسی کو خفا کیا ہوا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا کیا ہوا ہے

فضول ڈال کے اُس کو اک آزمائش میں
اک امتحان کا خُود سامنا کیا ہوا ہے

کسی کے ساتھ جو کھلتے نہیں کئی دن سے
تو بند اپنا بھی ہر راستہ کیا ہوا ہے

اُسے بھی خود یہ سمجھتے ہیں آج تک واجب
جو قرض ہم نے کسی کا ادا کیا ہوا ہے

ہے یوں تو چھوڑا ہُوا اپنے حال پر خود کو
اُسے بھی ہم نے سپُردِ خدا کیا ہوا ہے

عجب نہیں جو کسی روز جا ہی نکلیں ہم
قیام گاہ کا اُس کی پتا کیا ہوا ہے

ہوا سی کوئی چلائی ہوئی ہے چاروں طرف
اور ایک باغ ہے جس کو ہرا کیا ہوا ہے

سخن سرائی میں خود ذمہ دار ہیں اِس کے
بُرا کیا ہوا ہے یا بھلا کیا ہوا ہے

کبھی تھے زندہ جس آواز کے طُفیل ظفر
تو کس لیے اُسے خُود سے جُدا کیا ہوا ہے

☆

وہ دائرہ سا کہ جس میں سفر کیا ہوا ہے
سمجھ رہے ہیں کہ اُس دل میں گھر کیا ہوا ہے

نہیں اُسے بھی یہ پیچیدہ راستے معلوم
سفر میں ہم نے جسے راہبر کیا ہوا ہے

کسی سے مشورہ کرنے میں بھی نہیں کوئی ہرج
کہ ہم نے کام تو یہ بیشتر کیا ہوا ہے

شروع سے ہی قناعت پسند ہیں کیا کچھ
وہ شاخ تھی جسے ہم نے شجر کیا ہوا ہے

وہ آستانہ بھی پڑتا ہے راہ میں اُس کی
یہ آرزو کہ جسے دربدر کیا ہوا ہے

کہیں ہُوا نہیں اپنا بھی کوئی اندازہ
کہیں محاکمۂ دشت و در کیا ہوا ہے

جو ہیں تو لفظ ہی قائم ہیں، اور معانی کو
اِدھر کیا ہوا ہے یا اُدھر کیا ہوا ہے

قیام پر ہے یہ خس خانۂ سخن کچھ دیر
کہ اپنے شعر کو ہم نے شرر کیا ہوا ہے

میں ایک وہم سے بڑھ کر نہیں، ظفر کچھ بھی
وہ جانتا ہے، اُسے باخبر کیا ہوا ہے

☆

نہیں ہے وصل، مگر ہو بہو کیا ہوا ہے
کٹا پھٹا ہوا دل جو رفو کیا ہوا ہے

یہ اُس کا شوقِ ملاقات ہی نہ ہو یکسر
جو قطع رابطہ گفتگو کیا ہوا ہے

جو پاس ہیں وہی خواب و خبر سے ہیں غائب
جو دُور تر ہیں اُنھیں رُوبرُو کیا ہوا ہے

ہمارا شک ہی اگر رفع ہو سکے کہ وہ شوخ
حریف بھی نہیں، اور دُوبدُو کیا ہوا ہے

خبر نہیں وہ کہیں ہے بھی یا نہیں موجود
تو کس خوشی میں اُسے آرزُو کیا ہوا ہے

عجب نہیں جو یہ پھیلاؤ ہو مرے اندر
وہ سامنے تھا جسے چارسُو کیا ہوا ہے

رواں ہے خواب الگ اُس کو ڈھونڈنے کے لیے
روانہ خُود کو جدا کُو بہ کُو کیا ہوا ہے

ہماری اپنی فضائیں ہیں، اپنے ہی موسم
یہ گرد باد جسے رنگ و بُو کیا ہوا ہے

کسی کو اِس سے غرض ہی نہیں کوئی کہ ظفر
یہاں جو لفظ کو ہم نے لہُو کیا ہوا ہے

☆

یہ اپنی خاک جسے کہکشاں کیا ہوا ہے
زمیں کو ہم نے یہاں آسماں کیا ہوا ہے

ہماری عمر کا اس سے نہیں کوئی سروکار
جو ہم نے ایک ارادہ جواں کیا ہوا ہے

ہمارا راز کوئی راز بھی نہیں کب سے
تو کس لیے پھر اُسے رازداں کیا ہوا ہے

سُراغ اُس کا ملے گا کبھی اُسی کے سبب
جو ایک نقش تھا اُس کو نشاں کیا ہوا ہے

بلا سے اپنی، ہمیں بھی اگر بہا لے جائے
رُکا ہوا تھا جو پانی رواں کیا ہوا ہے

ہوئے ہیں کچھ تو سبکسار بھی اسی کے طفیل
اگرچہ طبع کو اپنی گراں کیا ہوا ہے

تو اس لیے کہ یہاں بجلیاں بھی دُور نہیں
یہ بادلوں میں اگر آشیاں کیا ہوا ہے

کچھ اپنے نفع و ضرر میں بھی اِمتیاز نہیں
کہ سر پہ دھوپ کا ہی سائباں کیا ہوا ہے

یہ ذائقہ بھی زباں کے لیے ضروری تھا
ظفر کسی کو اگر بدگماں کیا ہوا ہے

☆

سفر کا راہ میں ہی اختتام کیوں کر ہو
جو چل پڑے ہیں تو قصہ تمام کیوں کر ہو

لباس میں بھی ہے قندیل کی طرح روشن
بدن میں اتنا اُجالا ہے ، شام کیوں کر ہو

جہاں کی چیز ہو ، اچھی وہیں پہ لگتی ہے
یہ دل کا چاند ہے ، بالائے بام کیوں کر ہو

رُکی ہوئی ہے محبت اُداس اُداس کہیں
کوئی سبیل نہیں ، شادکام کیوں کر ہو

کسی سبب سے کوئی رابطہ نہیں باقی
کلام کیسے ، پیام و سلام کیوں کر ہو

بجا ہیں اس لیے بھی فکرمندیاں اپنی
کہ بات بھی نہیں ہوتی تو کام کیوں کر ہو

ہے دل میں شوقِ ملاقات بھی بہت ، لیکن
سوال صرف یہ ہے ، انتظام کیوں کر ہو

ہمارے نقش میں اُس کی نمود ہو کیسے
ہمارے نام کے ساتھ اُس کا نام کیوں کر ہو

ظفر ، کٹی رہی تا دیر عام لوگوں سے
جو طرزِ خاص تھی اب طرزِ عام کیوں کر ہو

☆

خیال جب سے پریشاں ہے خواب کیوں کر ہو
سوال ہی نہیں ممکن ، جواب کیوں کر ہو

جہاں پہ آبِ رواں کی بھی سانس رُکتی ہے
تو ایسے قحط ہُوا میں حُباب کیوں کر ہو

ہوئے ہیں گم اسی حالات کے اندھیرے میں
سو ، رنگ روپ ہو کیا ، آب و تاب کیوں کر ہو

جو کاروبار ہی ٹھپ ہو رہے محبت کا
تو روز روز حساب و کتاب کیوں کر ہو

اگر وہ چاند چمکتا نہیں تو پھر آخر
ہمارے پانیوں میں اضطراب کیوں کر ہو

بحال رابطہ ہونا تو ہے کبھی اُس سے
مگر سوال ہے اتنا ، شتاب کیوں کر ہو

جہاں سوالِ جزا و سزا ہی اُٹھ جائے
وہاں تمیزِ گناہ و ثواب کیوں کر ہو

ہم اپنے آپ کو تبدیل اگر نہیں کرتے
تو پھر وقوع پذیر انقلاب کیوں کر ہو

خراب حال ہیں ، لیکن وہ چاہتا ہے ظفر
کہ حالت اور بھی اپنی خراب کیوں کر ہو

☆

کہیں وہ ہے تو سہی، دوستی نہیں، پھر کیا
ہماری اُس سے ملاقات بھی نہیں، پھر کیا

وہ آئے تو سہی، کام آئے گا اندھیرا بھی
ہمارے گھر میں اگر روشنی نہیں، پھر کیا

ہم اُس سے چاہتے ہیں جس طرح کا ہونے کو
وہ ہو بھی جائے گا، لیکن ابھی نہیں، پھر کیا

یہ گفتگوئیں، یہ دن رات رابطے، آخر
یہ خوابِ عشق سہی، دل لگی نہیں، پھر کیا

میں اُس سے پوچھوں گا ملنا ہے اس نے کب مجھ سے
جو وہ جواب میں کہہ دے، کبھی نہیں، پھر کیا

وہ نیک بخت کسی کے تو کام آئے گی
چلو، ہمارے اگر کام کی نہیں، پھر کیا

وہ لہر جس کا مجھے انتظار تھا کب سے
جو میرے پاس پہنچ کر رُکی نہیں، پھر کیا

کسے خبر ہے کہ ہم بھی وہاں پہ ہوں کہ نہ ہوں
جہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں، پھر کیا

ہماری بات پہ بے اختیار ہو کے، ظفر
ہنسی تو خوب تھی، لیکن پھنسی نہیں، پھر کیا

☆

لہر کی طرح کنارے سے اُچھل جانا ہے
دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل جانا ہے

دوپہر وہ ہے کہ ہوتی نظر آتی ہی نہیں
دن ہمارا تو بہت پہلے ہی ڈھل جانا ہے

جی ہمارا بھی یہاں اب نہیں لگتا اتنا
آج اگر روک لیے جائیں تو کل جانا ہے

دل میں کھلتا ہوا ایک آخری خواہش کا یہ پھول
جاتے جاتے اسے خود میں نے مسل جانا ہے

جو یہاں خود ہی لگا رکھی ہے چاروں جانب
ایک دن ہم نے اسی آگ میں جل جانا ہے

چلتی رُکتی ہوئی، یہ حُسن بھی ہے ایک ہوا
موسمِ عشق بھی اک روز بدل جانا ہے

جیسے گھٹی میں کوئی خوف پڑا ہو اس کی
بات بے بات ہی اس دل نے دہل جانا ہے

اور تو ہونی ہے کیا اپنی وصولی اُس سے
مُنہ پہ کالک یہ ملاقات کی مل جانا ہے

میں بھی کچھ دیر سے بیٹھا ہوں نشانے پہ، ظفر
اور، وہ کھینچا ہوا تیر بھی چل جانا ہے

☆

کہیں ایسا نہ ہو اندازہ ہی اُلٹا نکل آئے
جسے ہم دل سمجھتے آئے ہیں ، دُنیا نکل آئے

غبارِ غیب سے باہر نکل تو آئے وہ ، کیا ہے
اگر ایسا نکل آئے ، اگر ویسا نکل آئے

زمانے کے لیے جتنا بُرا بھی ہو ، مگر ، پھر بھی
یہ ممکن ہے کہ اپنے حق میں وُہ اچھا نکل آئے

بظاہر مطمئن اور بے خبر پھرتے ہیں ، ایسے میں
اچانک ایک دن سر میں کوئی سودا نکل آئے

کہیں دل سے گزشتہ خوف کی دھجّی برآمد ہو
کہیں پائے پُرانے خواب کا پُرزہ نکل آئے

رُکے ہیں سلسلے سارے ، اسی اُلجھن میں رہتے ہیں
کوئی دروازہ کھل سکتا ، کوئی رستہ نکل آئے

کسی سے اتفاقاً بھی مُلاقات اس طرح ، جیسے
سفر ہو ، پیاس ہو ، اور وشت میں دریا نکل آئے

بہت خوش بھی نہیں اس ناشناسا شہر میں آ کر
کہ ڈرتے ہیں جو اس میں بھی کوئی اپنا نکل آئے

ظفر ، اُس بزم میں جانے سے کتراتے رہے پیہم
کہ ہم کیا سوچتے ہوں اور وہاں پر کیا نکل آئے

-☆-

ہماری موت کا اب اور کیا منظر نکل آئے
ہم ایسی چیونٹیاں ہیں جن کے آخر پر نکل آئے

لگا رکھا ہو اُس کی شکل کا جیسا بھی اندازہ
تو کیا کیجے اگر وہ اُس سے بھی بڑھ کر نکل آئے

اندھیرے میں تمھاری روشنی کا ایک ٹکڑا سا
وہی اندر سمٹتا ہے ، وہی باہر نکل آئے

یہاں بھی گھومتا رہتا ہے صبح و شام سر اپنا
وہاں پہنچیں تو کوئی اور ہی چکر نکل آئے

دوبارہ دیکھتے ہیں کوئی کوشش کر کے ، ممکن ہے
نتیجہ اس دفعہ شاید ذرا بہتر نکل آئے

اگر ممکن ہے اتنا کچھ ترے شہرِ تماشا میں
تو ہو سکتا ہے اس دیوار میں بھی در نکل آئے

روانی اور پایابی میں فرق اتنا ہی تھا سارا
جہاں پانی ہُوا غائب وہاں پتھر نکل آئے

مُسلسل یاد میں رہتے تھے جو بھولے اُنھی کو ہم
جنھیں ہم بھول بیٹھے تھے وہی ازبر نکل آئے

ظفر ، آساں نہیں گھر سے نکلنا بھی ، مگر اب کے
کبھی نکلے نہیں تھے جو وہی اکثر نکل آئے

-☆-

سمجھ رہے تھے جو آساں، محال ہے اب تک
وہی جواب طلب ہر سوال ہے اب تک

کسی قدر کوئی ہو کر بھی اس قدر نہ رہا
یہاں ہمارا نہ ہونا مثال ہے اب تک

زمانہ ہو گیا، تم بھی نہ لے سکے ہو خبر
اُسی طرح کا ہمارا بھی حال ہے اب تک

ہمارے دل میں بہت ٹوٹ پھوٹ رہتی ہے
اگرچہ یوں تو بہت دیکھ بھال ہے اب تک

تمھارے بعد تو گذرا نہیں کوئی، لیکن
یہ سبزہ ہے کہ یونہی پائمال ہے اب تک

تمام شہر سے کر لی ہے صلح تو، لیکن
ہمارے ساتھ ہی جنگ و جدال ہے اب تک

اسی پہ وار ترے روکتا ہوں میں کب سے
یہ میرا جسم نہیں، میری ڈھال ہے اب تک

کچھ اتنی دیر ہمیں یاد رکھ سکے تو بھی
نہ اب ہمیں ہی تمھارا خیال ہے اب تک

خوشی کی لہر تھی آخر وہ کس طرح کی، ظفر
تمھارے چہرے پہ گردِ ملال ہے اب تک

-☆-

اِدھر اُدھر جو یہ موجود میرا مطلب ہے
تو درمیان سے مفقود میرا مطلب ہے

اُسے بھی علم ہے بے کار ہے مرا مقصد
پتا مجھے بھی ہے بے سُود میرا مطلب ہے

سُدھار اپنا کسی طور ہے مجھے مطلوب
نہ اہلِ شہر کی بہبُود میرا مطلب ہے

بہت ہے اس میں عمل دخل میرا اپنا بھی
جو راستے ہوئے مسدُود، میرا مطلب ہے

شروع سے ہی جو رختِ سفر نہیں مرے پاس
نہ کوئی منزلِ مقصود میرا مطلب ہے

ہے کوئی شے جو کسی اور چیز میں شامل
اسی طرح سے غتربُود میرا مطلب ہے

جھلکتا رہتا ہے اس میں لہُو بھی لفظوں کا
جہاں تہاں شفق آلود میرا مطلب ہے

جہاں زیادہ مری معنی آفرینی تھی
وہاں وہاں سے ہی نابُود میرا مطلب ہے

بیان پھیلا ہُوا ہے بہت زیادہ، ظفر
اگرچہ اُتنا ہی محدُود میرا مطلب ہے

-☆-

ہے اپنے آپ سے انکار، میرا مطلب ہے
جو تیرے ہونے کا اقرار میرا مطلب ہے

کوئی تو خواب خریدار میرا مطلب ہے
جو ہے یہ گرمیِ بازار، میرا مطلب ہے

نہیں کسی کو سروکار، میرا مطلب ہے
خود اپنے آپ سے بیزار میرا مطلب ہے

سمجھتا ہوں اُسے اتنا زیادہ قابلِ غور
نہ اپنی بات پہ اصرار میرا مطلب ہے

بس ایک بے طلبی ہے مرے لہو میں رواں
نہیں کسی کا طلب گار، میرا مطلب ہے

ہے منہدم جو عمارت مری عبارت کی
تو اس کے ساتھ ہی مسمار میرا مطلب ہے

ہے ایک خواریِ بے انتہا مرا معنی
کوئی خرابیِ بسیار میرا مطلب ہے

برت رہا ہوں میں الفاظ جتنے صحت مند
اسی حساب سے بیمار میرا مطلب ہے

گرا پڑا یہ مرا تکیۂ کلام، ظفر
ہے ایک بسترِ پُرخار، میرا مطلب ہے

☆☆

اب بھی ہے اسی طرح تگ و تاز میں شامل
آواز ہے اپنی تری آواز میں شامل

گُل پھول ہیں، کہسار ہیں، جھیلیں ہوں کہ جھرنے
کیا کچھ ہے ترے جلوہ گہِ ناز میں شامل

آہنگ میں آتا ہے ترانہ ترا جس سے
اُس طرح کا سُر بھی ہے مرے ساز میں شامل

منزل کی طرف جاتے ہیں کچھ اور بھی رستے
ایک اور جہت بھی ہے اس انداز میں شامل

کھلتا ہُوا دیوار میں ہے کوئی دریچہ
ہے ایک دُعا بھی پرِ پرواز میں شامل

اُٹھنے کو بھی ہیں سارے گرائے ہوئے پردے
ہے کشف بھی سمٹا ہُوا اس راز میں شامل

نیت ہے اگر صاف تو ممکن ہے کبھی کچھ
تاثیر بھی ہو سکتی ہے الفاظ میں شامل

میری بھی یہ ناچیز صدا ہے تری خاطر
صد شکر کہ میں بھی ہوں اس اعزاز میں شامل

زنجیر جو ٹوٹی تو، ظفر، یہ بھی ہے ممکن
اپنا بھی کرشمہ ہو اس اعجاز میں شامل

☆☆

ترغیب سے نہ میری تب و تاب سے ہُوا
یہ حادثہ کچھ اور ہی اسباب سے ہُوا

منظر کٹے پھٹے ، ہوئے یکسُو کسی طرح
یہ بھی مرے بکھرتے ہوئے خواب سے ہُوا

کچھ فائدہ بھی کھیتیوں کو ہو گیا نصیب
اور کچھ زیاں بھی تندیِ سیلاب سے ہُوا

جاری وہ سلسلہ سا اندھیرے کے آرپار
کچھ آفتاب سے نہیں ، مہتاب سے ہُوا

سب کر دیا تھا دوسرے ہی خط میں اُس نے صاف
کوئی مُغالطہ سا جو القاب سے ہُوا

ملتی کہاں سے مجھ کو مرے کفر کی خبر
یہ بھی گُماں دریچۂ محراب سے ہُوا

میں ڈوبتا اُبھرتا رہا ، اور سارا کام
گہرائی سے ہُوا کبھی پایاب سے ہُوا

کچھ میں ہی جانتا ہوں کہ اثنائے راہ میں
جو کچھ مرے تنے ہوئے اعصاب سے ہُوا

میرے خلاف جا اُسے بدظن کیا ، ظفر
یہ بھی بجا ہے جو مرے احباب سے ہُوا

☆

کچھ تو خراب صورتِ احوال سے ہُوا
کچھ کام اپنی شامتِ اعمال سے ہُوا

پہنچا نہیں مدد کو مری ، یہ ہے اور بات
واقف کسی قدر تو مرے حال سے ہُوا

اِس سے سوا تو سعی تھی میری مرے خلاف
جتنا بھی کچھ تمھارے خدوخال سے ہُوا

جب ہم مرے تھے اُس پہ تو وہ بھی تھا ایک دور
اور عُمر کا شُمار اُسی سال سے ہُوا

لالچ نہیں تھا شہر کے لوگوں میں کچھ ، مگر
آغازِ فتنہ اُس کے زر و مال سے ہُوا

بس دیکھتے ہی دیکھتے بازی پلٹ گئی
یہ معجزہ بھی اب کے مری چال سے ہُوا

پرواز بھی تھی کوئی انوکھی ہی سربسر
کافی ہے جو بھی اپنے پر و بال سے ہُوا

پانی کے زور میں بھی جو ڈوبا نہیں تھا میں
جو ہو سکا نہ سطح سے ، پاتال سے ہُوا

اِس کا سبب کسی کی محبت نہیں ظفر
یہ سب کچھ ایک اور ہی جنجال سے ہُوا

☆

جھگڑا نسب سے تھا نہ مرے نام سے ہُوا
جو بھی ہُوا ، شروع مرے کام سے ہُوا

باقی بچا نہ کچھ بھی بتانے کو بزم میں
آغاز اس فسانے کا انجام سے ہُوا

پہنچے مکان ہی کے ذریعے مکین تک
کچھ رابطہ جو اپنا در و بام سے ہُوا

نقصان ہی تھا اپنا سراسر جو آج تک
خالی تمھارے وصل کے الزام سے ہُوا

اب اور بات ہے ، یہاں پہلے تو اپنا کام
جس سے بھی پڑ گیا ، بڑے آرام سے ہُوا

ہوتا تھا وُہ جو رات گئے کافی دیر بعد
اُس کا بھی انتظار مجھے شام سے ہُوا

مجھ پر تو تھا ہی صورتِ حالات کا اثر
کچھ نرم وہ بھی سختیِ ایام سے ہُوا

سیدھا معاملہ جو مجھ سے رہا ہے دُور
واضح وُہ میرے ذہن میں ابہام سے ہُوا

کچھ طبع اُس کی اپنی بھی ایسی ہی تھی ظفر
منت سے جو ہُوا نہیں ، دُشنام سے ہُوا

-☆-

کچھ بھی نہ اُس کی زینت و زیبائی سے ہُوا
جتنا فساد ہے مری یکتائی سے ہُوا

لگتا ہے اتنا وقت مرے ڈوبنے میں کیوں
اندازہ مجھ کو خواب کی گہرائی سے ہُوا

لازم تھا جست بھرنے کی خاطر یہ کام بھی
واقف میں اپنے آپ کا پسپائی سے ہُوا

کافی تھا یوں تو رنگِ تماشا بذاتِ خود
جو بچ رہا وُہ کام تماشائی سے ہُوا

ہُوں کس قدر کسی کے شمار و قطار میں
ظاہر وہاں پہ اپنی پذیرائی سے ہُوا

کمزوریاں ہماری ہوئیں واشگاف جب
اپنا بھی حشر پوری توانائی سے ہُوا

جو اصل چیز تھی وُہ چھپی رہ گئی کہیں
کچھ فائدہ نہ حاشیہ آرائی سے ہُوا

کُھلنا تھا اپنے عیب و ہُنر کا بھرم کہاں
یہ بھی ہُوا تو قافیہ پیمائی سے ہُوا

ہنگامہ گرم ہے جو مرے چارسُو ظفر
سو بھی ہجوم سے نہیں ، تنہائی سے ہُوا

-☆-

اک ہوا سی کوئی رُکی ہُوئی ہے
کبھی چلتی ، کبھی رُکی ہُوئی ہے

میرے اُس کے ہے بیچ میں دُنیا
اور سب روشنی رُکی ہُوئی ہے

راستے ہیں کُھلے ہُوئے سارے
پھر بھی یہ زندگی رُکی ہُوئی ہے

چلتی رُکتی سی دل کی یہ دھڑکن
چل پڑے گی ، ابھی رُکی ہُوئی ہے

سلسلہ جو رواں ہے نیکی کا
اس کے پیچھے بدی رُکی ہُوئی ہے

آپ ہی چل پڑے گی یہ کسی وقت
یہ گھڑی آپ ہی رُکی ہُوئی ہے

بات کیا ہے کہ آج کل اپنی
ساری جادوگری رُکی ہُوئی ہے

یہ جو چلتا ہے اختیار ، اس کے
درمیاں بے بسی رُکی ہُوئی ہے

پسِ گریہ ہے وُہ بھی صاف ، ظفر
جو ہنسی آپ کی رُکی ہُوئی ہے

☆

طلسم سا جو کوئی چار سُو رُکا ہُوا ہے
رُکا ہُوا ہے تماشا کہ تُو رُکا ہُوا ہے

مَیں اُس کے ساتھ روانہ رہا ہُوں دشت بہ دشت
جو ایک خواب مرے رُوبرو رُکا ہُوا ہے

یہی وہ آبِ رواں ہے کہ جو مرے آگے
رُکا ہُوا بھی ہے اور ہوبہو رُکا ہُوا ہے

جو تشنہ کام نہیں وہ بھی کوئی عذر لیے
کسی طرح سے لبِ آبجُو رُکا ہُوا ہے

گھروں کو اور تو سارے چلے گئے واپس
مگر مرے لیے وُہ نرم خُو رُکا ہُوا ہے

کہیں تھما ہُوا ہے کاروانِ باغ و بہار
کہیں وہ مرحلۂ رنگ و بُو رُکا ہُوا ہے

کبھی وہ موجِ مُلاقات پھر سے ہو آغاز
ابھی وہ سلسلۂ گفتگو رُکا ہُوا ہے

عجیب ٹھہرے ، ٹھہرتے ہوئے زمانے ہیں
لبوں پہ لفظ ، رگوں میں لہُو رُکا ہُوا ہے

کلام کر کے وہ جا بھی چکا ہے اور ، ظفر
ہجومِ خلق ابھی کُوبکُو رُکا ہُوا ہے

☆

کسی طرف سے کوئی راستا رُکا ہُوا ہے
بدن رواں ہے، رنگِ قبا رُکا ہُوا ہے

الگ رُکی ہوئی ہے دیر سے ہوائے چمن
ہجوم، خوابِ ہوس میں جدا رُکا ہُوا ہے

ہوں فکرمند بھی، منظر بھی خوب ہے کہ ابھی
ہوا کی لہر پہ سنگِ صدا رُکا ہُوا ہے

برس کے کھل بھی گیا ابر، اور یہ پانی
اُسی طرح سے یہاں جابجا رُکا ہُوا ہے

مزے کی بات ہے یہ بھی کہ رنجِ رفتہ کہیں
مسافری میں ہے، لیکن ذرا رُکا ہُوا ہے

چڑھا ہُوا ہے مری زندگی پہ زنگ سا ایک
مری زباں پہ کوئی زہر سا رُکا ہُوا ہے

جو لفظ ہے تو لرزتا ہُوا سا ہے مجھ میں
اگر لہو ہے تو وہ بھی رُکا رُکا ہُوا ہے

جو چل پڑا تو تباہی مچائے گا ہر سمت
مَیں خوش نہیں ہوں کہ سیلِ بلا رُکا ہُوا ہے

مرے بھی حصے میں تھا کوئی چل چلاؤ، ظفرؔ
مجھے بتاؤ کہ مجھ میں یہ کیا رُکا ہُوا ہے

☆

کھڑی ہے شام کہ خوابِ سفر رُکا ہُوا ہے
یقین کیوں نہیں آتا، اگر رُکا ہُوا ہے

گزرنے والے تھے جو بھی، گزر گئے لیکن
میانِ راہ کوئی بے خبر رُکا ہُوا ہے

برس رہا ہے نہ چھٹتا ہے یہ کئی دن سے
جو ایک ابر مری خاک پہ رُکا ہُوا ہے

رواں بھی سلسلۂ اشک ہے ابھی کچھ کچھ
یہ قافلہ جو کہیں بیشتر رُکا ہُوا ہے

ابھی نکل نہیں سکتا گھروں سے کوئی یہاں
کہ سیلِ آب ابھی دربدر رُکا ہُوا ہے

ہر ایک شے ہے کسی راکھ میں بدلنے کو
کہیں جو خانۂ خس میں شرر رُکا ہُوا ہے

چلی ہوئی تھی مری بات جتنے زوروں سے
اُسی حساب سے اُس کا اثر رُکا ہُوا ہے

پہنچ سکے کسی منزل پہ کیا مسافرِ دل
کہ چل رہا ہے بظاہر، مگر، رُکا ہُوا ہے

یہ حرف و صوت کرشمے ہیں سب اُسی کے، ظفرؔ
لہو کے ساتھ رگوں میں جو ڈر رُکا ہُوا ہے

☆

یہ دُنیا ہے تو آخر خوابِ دُنیا کس طرف ہے
ہیں آنکھیں کون سی جانب، تماشا کس طرف ہے

سراسر شور ہے اور زور ہے پانی کا لیکن
کنارے کو نہیں معلوم دریا کس طرف ہے

یکایک بھسم ہو جانا ہے آخر کس طرح سے
جو ہے یہ شامِ تنہائی تو شعلہ کس طرف ہے

محبت کی فراوانی اُدھر بھی ہے، اِدھر بھی
مگر، کچھ کر گزرنے کا ارادہ کس طرف ہے

علاقہ بانٹ رکھا ہے تو پھر معلوم تو ہو
ہمارا کس طرف ہے اور تمھارا کس طرف ہے

سخاوت شیوۂ اہلِ کرم ہے، لیکن اس بار
کسی نے یہ نہیں دیکھا تقاضا کس طرف ہے

وہ مٹی ہے کہاں پہ جو اُڑا سکتے نہیں ہم
یہ وحشت کس زمانے کی ہے، صحرا کس طرف ہے

یہاں اطراف کا احساس ہی باقی نہیں اب
کہ سُورج کس طرف کو اور سایا کس طرف ہے

ظفر کو بھی نہیں معلوم کچھ تقسیم ہو کر
ہے کس کے ساتھ آدھا اور آدھا کس طرف ہے

☆

میلا سا ہے لگا ہُوا باہر مری طرف
ہے کوئی اور بھی کہیں اندر مری طرف

ظاہر میں اور کچھ تو حقیقت میں ہیں کچھ اور
میری طرف ہیں جو نہیں اکثر مری طرف

اُس کو خبر نہیں مگر اُس کی ہی سمت سے
خوشبو کی لہر سی ہے برابر مری طرف

رُکتا نہیں، اگرچہ وہ آتا ہے بار بار
جاتا ہے اُلٹے پانو ہی آ کر مری طرف

سیدھا سا ہونے لگتا ہے پُرپیچ راستہ
اُلٹا سا ہونے لگتا ہے منظر مری طرف

لگتا ہے، ایک صُورتِ احوال، شام کو
ہوتی ہے چند روز سے بہتر مری طرف

رہتی ہے کوئی آمد و رفتِ آب و خواب کی
مجھ سے ہٹی ہٹی ہوئی شب بھر مری طرف

باہر کے لوگ ساتھ مرا دے سکیں گے کیا
رہتا نہیں اگر یہ مرا گھر مری طرف

میں گھومتا ہوں ساتھ ہی ساتھ اُس کے اے ظفر
ہے ایک صبح و شام کا چکر مری طرف

☆

کیسی رُکی ہوئی تھی روانی مری طرف
ٹھہرا ہُوا تھا اپنا ہی پانی مری طرف

تحریر میں بھی جو وہ مثال اپنی آپ ہے
پیغام بھیجتا ہے زبانی مری طرف

پتوں کا رنگ تھا کہ ہُوا اور بھی ہرا
چلتی رہی ہَوائے خزانی مری طرف

ہے کوئی آسمان میں جس کی طرف سے روز
آتی ہے ایک یاددہانی مری طرف

لفظوں کا بوجھ رہتا ہے سر پر شبانہ روز
رہتی ہے گفتگو کی گرانی مری طرف

کردار اُس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں جابجا
گم آ کے ہو گئی ہے کہانی مری طرف

تھے اُس کی دسترس میں عجائب تو بیشتر
بھیجی نہ اُس نے کوئی نشانی مری طرف

رہتا ہے لفظ لفظ کوئی شور مجھ سے دُور
کرتی ہے زور موجِ معانی مری طرف

جب کوئی بھی نہیں ہے تو پھر رات بھر ظفر
ہوتا ہے کون آ کے بیانی مری طرف

☆

گرتے ہیں ٹوٹ کر جو ستارے مری طرف
پیغام سے ہیں یہ بھی تمھارے مری طرف

وا تھے ہر ایک سمت سے خار و خسِ بدن
جس وقت اُڑ رہے تھے شرارے مری طرف

آثار اُس کے میرے اندھیروں میں ہیں ابھی
کچھ دن جو روشنی نے گزارے مری طرف

آواز ہی ہُوبہو ہے اُس کا ہرا بھرا
بے شک وہ دُور سے ہی پکارے مری طرف

کیسا ہجومِ حُسن میں گم ہوں میں آج تک
جو قافلے سے اُس نے اُتارے مری طرف

آنکھوں کو بند رکھنا بھی اچھا رہا کہ اب
آتے ہیں آپ چل کے نظارے مری طرف

جیسے انھی کی طرح کا لگتا نہیں ہوں میں
یوں دیکھنے لگے ہیں یہ سارے مری طرف

جن کو نظر اُٹھا کے بھی دیکھا نہ تھا کبھی
کرتے ہیں آج وہ بھی اشارے مری طرف

ہوں اپنے آپ ہی میں کوئی فاصلہ، ظفر
آتے نہیں ہیں میرے کنارے مری طرف

☆

طبعاً تو وہ اتنا کوئی بدخو بھی نہیں ہے
غصے پہ بہرحال اُسے قابو بھی نہیں ہے

شامل نہیں گو اپنے عقیدے میں تو لیکن
اُس جیسا کسی اور میں جادو بھی نہیں ہے

کیا باغ ہے جس میں کوئی رنگت نہ ہو تیری
کیا پھول ہے جس میں تری خوشبو بھی نہیں ہے

یوں اُس نے پریشان بھی کر رکھا ہے مجھ کو
کچھ دن سے طبیعت مری یکسو بھی نہیں ہے

آواز سے ہٹ کر بھی پکارا ہے کئی بار
روتا بھی ہوں اور آنکھ میں آنسو بھی نہیں ہے

ہنگامہ بپا بھی کیے رکھا یہاں مل کر
دیکھا تو کہیں میں ہی نہیں تُو بھی نہیں ہے

ظاہر میں تو کانٹا بھی نہیں پانو میں اپنے
اور دل میں کوئی تیر ترازو بھی نہیں ہے

کچھ دن سے مرا ذہن بھی ہے مجھ سے الگ سا
اور ساتھ مری قوتِ بازو بھی نہیں ہے

کب سے ہوں، ظفرؔ، زیرِ علاج اُس کے شب و روز
لیکن کہیں پر فرقِ سرِ مُو بھی نہیں ہے

☆

زمیں ٹھہری ہوئی ، آسماں رُکا ہوا ہے
رُکی ہے سانس تو سارا جہاں رُکا ہُوا ہے

ابھی رُکو کہ ابھی بات ہو نہیں سکتی
ابھی ہمارے گھروں میں دُھواں رُکا ہُوا ہے

کئی دنوں سے عدالت کے طور ہیں کچھ اور
کئی دنوں سے ہمارا بیاں رُکا ہُوا ہے

جہاں سے آ گئی تھی نیند سُننے والوں کو
وہیں پہ سلسلۂ داستاں رُکا ہُوا ہے

بدل گیا ہے اچانک ہی رنگِ موسمِ دل
ہوا تھمی ہوئی ، خوابِ گراں رُکا ہُوا ہے

رُکا ہوا کوئی جھونکا ہوا کا ہے کب سے
مگر پتا نہیں چلتا کہاں رُکا ہُوا ہے

یہ انتظار ہے اثنائے راہ میں کس کا
جو چلتے چلتے کوئی رائیگاں رُکا ہُوا ہے

ہے اب مُسافرِ دل کی یہ صورتِ احوال
جہاں پہ رُک نہیں سکتا ، وہاں رُکا ہُوا ہے

کٹے گا اپنا سفر جانے کس طرح ، کہ ظفرؔ
رواں ہے گرد ، مگر کارواں رُکا ہُوا ہے

☆

ایک ہی بار نہیں ہے وہ ، دوبارہ کم ہے
میں وہ دریا ہوں جسے اپنا کنارہ کم ہے

وہی تکرار ہے اور ایک وہی یکسانی
اس شب و روز میں اب اپنا گزارہ کم ہے

میرے دن رات میں کرنا نہیں اب اُس کو شمار
حصۂ عمر کوئی میں نے گزارا کم ہے

میں زیادہ ہوں بہت اس کے لیے اب تک بھی
اور ، میرے لیے وہ سارے کا سارا کم ہے

اُس کی اپنی بھی توجہ نہیں مجھ پر کوئی خاص
اور میں نے بھی ابھی اُس کو پکارا کم ہے

آج پانی جو اُچھلتا نہیں پہلے کی طرح
ایسا لگتا ہے کہ اس میں کوئی دھارا کم ہے

ہاتھ پیر آپ ہی میں مار رہا ہوں فی الحال
ڈوبتے کو ابھی تنکے کا سہارا کم ہے

میں تو رکھتا ہوں بہت روز کے روز ان کا حساب
آسماں پر کوئی آج ایک ستارہ کم ہے

پیش رفت اور ابھی ممکن بھی نہیں ہے کہ ظفر
ابھی اُس شوخ پہ کچھ زور ہمارا کم ہے

☆

کچھ دنوں سے جو طبیعت مری یکسو کم ہے
دل ہے بھرپور مگر آنکھ میں آنسو کم ہے

تجھے گھیرے میں لیے رکھتے ہیں کچھ اور ہی لوگ
یعنی تیرے لیے یہ حلقۂ بازو کم ہے

توڑ جیسے ہے کوئی اپنے ہی اندر اس کا
ورنہ ایسا بھی نہیں ہے ترا جادو کم ہے

میں ان آفاتِ سماوی پہ کروں کیوں تکیہ
کیا مری ساری تباہی کے لیے تُو کم ہے

رنگ موسم ہی محبت کا دیا جس نے بگاڑ
شہر بھر کے لیے کیا ایک ہی بدھو کم ہے

پیڑ کی چھاؤں پہ کرتی ہے قناعت کیوں خلق
اور ، کیوں سب کے لیے سایۂ گیسو کم ہے

زندگی ہے وہی صد رنگ مرے چاروں طرف
کچھ دنوں سے مگر ، اس کا کوئی پہلو کم ہے

وہ بھی جامے سے ہُوا پھرتا ہے باہر ، اور کچھ
دل پہ اپنا بھی کئی روز سے قابو کم ہے

شاعری چھوڑ بھی سکتا نہیں میں ورنہ ، ظفر
جانتا ہوں اس اندھیرے میں یہ جگنو کم ہے

☆

پانی اتنا ہے کہ اس کے لیے دریا کم ہے
میری آوارہ خرامی کو یہ دُنیا کم ہے

منتظر میں بھی کنارے پہ کھڑا ہوں اُس کا
ایک صُورت جو ابھی دشت میں پیدا کم ہے

میں سمجھتا رہا کافی جسے آتے جاتے
مجھے معلوم نہیں تھا کہ وُہ اتنا کم ہے

اس تجارت کی سمجھ ہی نہیں آئی اب تک
نفع جس میں ہے زیادہ نہ خسارہ کم ہے

صبر آتا ہی نہیں مجھ کو کسی بھی صُورت
وُہ تو میرے لیے جتنا بھی ہے ، سارا کم ہے

شہر میں اُس کے نہ ہونے کی تلافی کیا ہو
یہ کمی یوں ہی رہے گی کہ وہ ایسا کم ہے

میں اسی وجہ سے جاتا نہیں اکثر اُس سمت
باغِ دل میں مرے جتنے کا تماشا کم ہے

بس بیاں کی بھی جگہ رنگ بیاں ہے یکسر
میرا ملبُوس زیادہ ہے ، سراپا کم ہے

ظفر آیا نہیں اُس کو بھی کبھی آپ خیال
اور ، اپنا بھی کئی دن سے تقاضا کم ہے

☆

شور اُگلا سا جو ہر سمت برابر کم ہے
زور اس طبعِ رواں کا مرے اندر کم ہے

اس چکا چوند سے ہٹ کر نہیں رہ سکتا میں
روشنی آج مرے خواب سے باہر کم ہے

ایک رفتار ہے دونوں کی وہی ایک طرف
بوجھ اُڑتے ہوئے بادل کا ہوا پر کم ہے

کمی ایسی ہے کہ جو آنکھ کا دھوکا ہے فقط
اور ، بظاہر جو زیادہ ہے وُہ اکثر کم ہے

پھر اُسی طرح ضرُورت نہیں ہوتی پُوری
کم تھا جو ایک دفعہ ، اب وہ مکرر کم ہے

سوچتے ہیں تو ہے درپیش وہی قحطِ خیال
کھولیے آنکھ تو پھر سامنے منظر کم ہے

مجھے درکار بھی کچھ اتنا زیادہ نہیں تھا
جو مُیسّر ہے مجھے وہ بھی سراسر کم ہے

گئے دیوانے کہیں ، خاک بھی سب بیٹھ گئی
ایک مُدّت سے یہ آئینہ مُکدّر کم ہے

یہ بھی ہو سکتا ہے ساحل سے پلٹ جاؤں ، ظفرؔ
اس قدر میرے سفینے کو سمُندر کم ہے

☆

جب اپنی سوچ میں سوتے ہوئے گذرتا ہوں
تمھارے باغ سے ہوتے ہوئے گذرتا ہوں

جو سوچتا ہوں کسی دل سے پار اترنے کا
تو اپنی ناؤ ڈبوتے ہوئے گذرتا ہوں

یہ خاک زار گذرگاہ جب مری ٹھہرے
تو کوئی بیج ہی بوتے ہوئے گذرتا ہوں

یہ راستہ ہے مرا روز کا کہ مَیں اس سے
خُود اپنا بوجھ ہی ڈھوتے ہوئے گذرتا ہوں

خُود اپنے حال پہ ہنستا ہوں صبح و شام کہ مَیں
ہر ایک راہ سے روتے ہوئے گذرتا ہوں

مجھے وہاں پہ کوئی بات یاد آتی ہے
جہاں سے آنکھ بھگوتے ہوئے گذرتا ہوں

پھر اُس کے بعد مجھے ڈھونڈتا بھی ہے اُس کو
وہ ایک شے جسے کھوتے ہوئے گذرتا ہوں

چمن سے جب بھی گذرتا ہوں سیر کرتے ہوئے
گلوں میں خار چبھوتے ہوئے گذرتا ہوں

ظفرؔ، مآلِ محبت کی بیل گاڑی میں
مَیں اپنے آپ کو جوتے ہوئے گذرتا ہوں

☆

کسی سفر سے پلٹتا ہوا گذرتا ہوں
تو اپنی خاک سے اٹا ہوا گذرتا ہوں

مَیں ایک ہوں، مگر اِن خانوں اور حصّوں میں
کسی حساب سے بٹتا ہوا گذرتا ہوں

شجر شجر سے مری دوستی ہے، اس لیے مَیں
تنوں کے ساتھ لپٹتا ہُوا گذرتا ہُوں

اُجالتا ہُوں کبھی راستے محبت کے
اگرچہ دُھند ہُوں، چھٹتا ہوا گذرتا ہُوں

وُہ ایک نقش جو تکرار ہے اِن آنکھوں کی
وُہ ایک نام جو رٹتا ہُوا گذرتا ہُوں

ہے لمحہ لمحہ مری داستان کا ٹکڑا
کہ رات کی طرح کٹتا ہُوا گذرتا ہُوں

مرے حساب میں گڑبڑ ہے اتنی روز بروز
جو اپنے آپ میں گھٹتا ہُوا گذرتا ہُوں

ابھی مَیں پھیلتا جاتا ہُوں ابر کی صُورت
ابھی یہاں سے سمٹتا ہُوا گذرتا ہُوں

مرا اخیر تو اب جو بھی ہو سو ہو، کہ ظفرؔ
بساطِ شعر اُلٹتا ہُوا گذرتا ہُوں

☆

میں اپنی چال ہی چلتا ہوا گذرتا ہوں
یہ راستے جو بدلتا ہوا گذرتا ہوں

مجھے جو آب و ہوا راس ہی نہیں تھی کبھی
اُسی میں پھولتا پھلتا ہوا گذرتا ہوں

بہت چڑھا ہوا پانی ہوں اپنے دریا کا
سو، لہر لہر اُچھلتا ہوا گذرتا ہوں

کبھی میں ڈرتا رہا بھی ہوں دشمنوں سے، مگر
اب اُس گلی سے ٹہلتا ہوا گذرتا ہوں

کبھی سماتا ہوا ایک شے میں، اور، کبھی
کسی طرف سے نکلتا ہوا گذرتا ہوں

کہیں پڑا ہوا ہر ایک شے کو ٹھکراتا
کہیں میں آگ اُگلتا ہوا گذرتا ہوں

جہاں سے چھوڑ گیا ہے کوئی مجھے پیچھے
حسد کی آگ میں جلتا ہوا گذرتا ہوں

گڑھے سے کھود رکھے ہیں جو دوسروں کے لیے
میں اُن سے گرتا سنبھلتا ہوا گذرتا ہوں

بلا ہوں ایک، ظفر، اور، ناگہاں، لیکن
میں اپنے سر سے بھی ٹلتا ہوا گذرتا ہوں

☆

ہوا کے ساتھ گذرتا ہوا گذرتا ہوں
جو برگ برگ بکھرتا ہوا گذرتا ہوں

اسی طرف سے مجھے خطرہ ہے اگر کوئی ہے
میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوا گذرتا ہوں

ہے ایک ہمہمۂ زندگی مرے درپیش
جو اس دیار سے مرتا ہوا گذرتا ہوں

میں اپنی شامتِ اعمال بھی نہیں کہ یہاں
کیا نہیں ہے جو بھرتا ہوا گذرتا ہوں

جہاں سے تیز گذرتا تھا میں کبھی پہلے
وہیں سے رُکتا ٹھہرتا ہوا گذرتا ہوں

ہے کوئی بات جو بتلا رہا ہوں رہ رہ کر
ہے کوئی کام جو کرتا ہوا گذرتا ہوں

بنی نہیں ہے ابھی کوئی میری آخری شکل
ابھی بگڑتا سنورتا ہوا گذرتا ہوں

میں بیٹھ جاؤں گا پھر جھاگ کی طرح یک دم
پھر اک دفعہ جو بپھرتا ہوا گذرتا ہوں

مرے زوال کا موسم ہے زور پر، سو، ظفر
بلندیوں سے اُترتا ہوا گذرتا ہوں

☆

دربدر پیغام تھا یا جابجا پیغام تھا
دن سا اک نکلا ہُوا تھا جیسے ، کیا پیغام تھا

پُھول پتّے بھی پسینے میں تھے جیسے تربتر
میری خاطر چلنے والی اک ہوا پیغام تھا

صرف معنی اور مطلب ہی نہ تھا اُس کا کوئی
ورنہ کہنے کو تو وہ اچھا بھلا پیغام تھا

کوئی سُنتا ہی نہ تھا ، اِس کو سمجھنا تو بہت
دُور کی تھی بات ، جو میری صدا پیغام تھا

اہلِ دُنیا اپنے اپنے گز لیے پھرتے رہے
بات چھوٹی تھی ، مگر اُس میں بڑا پیغام تھا

سرزنش اُس میں ہمارے نام کی بھی تھی کوئی
دُوسروں کے واسطے جو آپ کا پیغام تھا

اک پُرانی ہی کوئی تکرار تھی انکار کی
ہم تو سمجھے تھے کہ یہ کوئی نیا پیغام تھا

چل رہا تھا مَیں ازل سے ، اور ، میرے سامنے
کوئی بھی منزل نہ تھی ، بس راستا پیغام تھا

اِس طرح لگتا نہ تھا باہر سے تو ، لیکن ، ظفر
اندر اندر ہی کوئی بندِ قبا پیغام تھا

☆

بات سندیسا بھی اُس کی ، گفتگو پیغام تھا
دُور تھا وہ اور ہمارے رُوبرو پیغام تھا

جس نے موسم ہی بدل ڈالا تھا میرے ہر طرف
دفعتہً وہ ایک ایسا رنگ و بُو پیغام تھا

اس سے اچھا کوئی موقع اور کیا ہوتا کہ وہ
تشنگی کے دشت میں جام و سبُو پیغام تھا

ایک طوفانِ خزاں تھا جن دنوں چاروں طرف
اُس کے اندر ہی کوئی خوابِ نمو پیغام تھا

کاٹ دی اُس کی وضاحت میں ہی ساری زندگی
ایسا پیچیدہ زمانے بھر میں تُو پیغام تھا

ایک سنگینی بھی تھی اُس میں کہیں رکھی ہوئی
دیکھنے میں تو کچھ ایسا نرم خُو پیغام تھا

یاد ہی رکھا نہ ہم نے ورنہ تو پہلے پہل
کُو بہ کُو اُس کا سبق تھا ، سُو بہ سُو پیغام تھا

ہم نہیں سمجھے تو اُس کا بھی بھلا کیا ہے قصور
اک اشارہ سا تھا ، لیکن ہُوبہُو پیغام تھا

تھا یہی حاصل تگ و تازِ معانی کا ، ظفر
لفظ پیرایہ تھا اپنا ، اور لہُو پیغام تھا

☆

وہ زمیں پیغام تھا، یا آسماں پیغام تھا
خود بھی وہ موجود تھا اُس کا جہاں پیغام تھا

راستے تھے فاصلوں کو کاٹ کر چلتے ہوئے
گرد تھی ہر سمت، کوئی کارواں پیغام تھا

تھے اشارے اور کنایے سے پسِ الفاظ کچھ
شور و شر میں ایک ایسا بے زباں پیغام تھا

جس نے جو بویا تھا اُس نے کاٹا بھی تھا ضرور
اور، وہ سب کے لیے سُود و زیاں پیغام تھا

اس دفعہ تو یہ لطیفہ بھی رہا تھا میرے ساتھ
میں جہاں سے غیر حاضر تھا وہاں پیغام تھا

سُننے والا تھا نہ پہنچانے ہی والا تھا کوئی
ہر طرح اور ہر طرف سے رائیگاں پیغام تھا

کچھ مکینوں کو خبر تھی، اور کچھ تھے بے خبر
وہ مکاں پیغام تھا اور لامکاں پیغام تھا

شام تھی اور ٹوٹتے تھے دم بہ دم تارے، ظفرؔ
صبح کی بھولی ہُوئی اک داستاں پیغام تھا

کیوں بیاں اس میں ظفرؔ کچھ بھی نہیں تھا دُور دُور
کیوں سراسر اس دفعہ طرزِ بیاں پیغام تھا

☆

کچھ نہیں سمجھا ہوں، اِتنا مختصر پیغام تھا
کیا ہوا تھی جس ہوا کے ہاتھ پہ پیغام تھا

اُس کو آنا تھا کہ وہ مجھ کو بُلاتا تھا کہیں
رات بھر بارش تھی، اُس کا رات بھر پیغام تھا

لینے والا ہی کوئی باقی نہیں تھا شہر میں
ورنہ تو اُس شام کوئی دربدر پیغام تھا

منتظر تھی جیسے خود ہی تنکا تنکا آرزو
خار و خس کے واسطے گویا شرر پیغام تھا

کیا مُسافر تھے کہ تھے رنجِ سفر سے بے نیاز
آنے جانے کے لیے اک رہگذر پیغام تھا

کوئی کاغذ ایک میلے سے لفافے میں تھا بند
کھول کر دیکھا تو اُس میں سر بہ سر پیغام تھا

ہر قدم پر راستوں کے رنگ تھے بکھرے ہُوئے
چلنے والوں کے لیے اپنا سفر پیغام تھا

کچھ صفت اُس میں پرندوں اور پتوں کی بھی تھی
کتنی شادابی تھی اور کیسا شجر پیغام تھا

اور تو لایا نہ تھا پیغام ساتھ اپنے ظفرؔ
جو بھی تھا اُس کا یہی عیب و ہُنر پیغام تھا

☆

دل کو رہینِ بندِ قبا مت کیا کرو
ہے لاعلاج، اس کی دوا مت کیا کرو

ویسے تو اختیار ہے سارا تمھیں، مگر
جو ناروا ہے اُس کو روا مت کیا کرو

توفیق تو ہوئی نہیں خیرات کی کبھی
کہتے ہیں اُس گلی میں صدا مت کیا کرو

جو مل گئے ہیں، اُن کی تواضع کو چھوڑ کر
جو کھو گئے ہیں اُن کا پتا مت کیا کرو

اس کا معاملہ ہے جُدا، وضع ہی کچھ اور
دل میں حسابِ تنگیِ جا مت کیا کرو

کچھ اور لوگ ہیں یہاں اس کام کے لیے
واجب ہے جو بھی قرض، ادا مت کیا کرو

جیسا بھی ہے وہ یار ہے اپنا کھلا ڈلا
کچھ اس لیے بھی خوفِ خدا مت کیا کرو

سچ ہے کہ ہم سے بات بھی کرنا نماز ہے
گر ہو سکے تو اس کو قضا مت کیا کرو

تُم سے تو ہے ظفرؔ کا بس اتنا مطالبہ
خُود سے اُسے زیادہ جُدا مت کیا کرو

☆

اس کی تو کچھ خبر نہیں کیوں مت کیا کرو
میں اتنا جانتا ہوں کہ یُوں مت کیا کرو

جادو ہے اک تمھاری خموشی میں بھی عجب
مجھ پر یہ گفتگو کا فسوں مت کیا کرو

آنکھوں کے آس پاس بھی نکلا کرو کبھی
دل میں ہی اتنی دیر سکوں مت کیا کرو

میں نے تو کام لینا ہے ان سے ابھی بہت
میرے خیال و خواب کا خُوں مت کیا کرو

خواہش کو دل میں بیٹھنے دو جم کے ایک بار
اب اور اسے درون و بروں مت کیا کرو

نقصان کوئی اس میں تمھارا بھی ہو نہ جائے
مایوسیوں کو اور فزوں مت کیا کرو

مانا کرو بس ایک مری بات سربسر
اس کے علاوہ جو بھی کہوں، مت کیا کرو

مقدور بھر تو پہلے ہی رسوا ہوں شہر میں
تم اور مجھ کو خوار و زبوں مت کیا کرو

اُس کا خیال ہے کہ ظفرؔ، اُس کے سامنے
جو بھی کہے وہ، تم کبھی چُوں مت کیا کرو

☆

دن رات میرے دل سے گذر مت کیا کرو
اچھا نہیں ہے اتنا سفر، مت کیا کرو

مدت کے بعد انہیں جو ہوا ہے سکوں نصیب
ان پانیوں کو زیر و زبر مت کیا کرو

ہو جائے گی ہماری ملاقات بھی کبھی
یہ خواب ہے تو اس کو خبر مت کیا کرو

اہلِ غرض بھی ہو کے جو کرتے نہیں سوال
ایسے گداگروں سے حذر مت کیا کرو

مرضی سے اپنی جو بھی کرو ظلم ناروا
یہ دوسروں کے زیرِ اثر مت کیا کرو

رہنے دیا کرو یونہی خواب اور خواہشیں
سامان کو ادھر سے ادھر مت کیا کرو

نقصان بھی کبھی تو اٹھانا ہی چاہیے
ہر کام بے زیان وضرر مت کیا کرو

رونق انہی کے دم سے تمھارے جہاں میں ہے
خلقِ خدا سے صرفِ نظر مت کیا کرو

دل کا دعا سے رابطہ خاص ہے ظفر
یوں امتیازِ شاخ و شجر مت کیا کرو

☆

دل میں طرح طرح کے گماں مت کیا کرو
کر لو تو ان کو آگے بیاں مت کیا کرو

طغیانیاں بھی ہیں کہیں اندر چھپی ہوئی
یخ بستہ پانیوں کو رواں مت کیا کرو

رکھو کہیں کسی کی پہنچ میں بھی جنسِ خواب
یعنی اسے کچھ اتنا گراں مت کیا کرو

کہتے ہو کیا، کہ میری تو پہچان ہی نہیں
جو خود نہیں ہے اس کو نشاں مت کیا کرو

دل میں کسی کے جم کے بھی بیٹھا کرو کبھی
اور، آئے دن یہ نقلِ مکاں مت کیا کرو

کیوں بھسم ہی اسے نہیں کرتے ہو ایک بار
آ کر ہمارے گھر میں دھواں مت کیا کرو

رونے پہ اختیار کسے ہے، کوئی بتائے
کہتے ہیں اتنا شور یہاں مت کیا کرو

یا پھر محاوروں کا رکھو ٹھیک سا خیال
یا پیروی اہلِ زباں مت کیا کرو

دامانِ دل پہ داغ نہ پڑ جائے، اے ظفر
اتنا خیالِ لالہ رخاں مت کیا کرو

☆

ہزار بندشِ اوقات سے نکلتا ہے
یہ دن نہیں جو مری رات سے نکلتا ہے

وہ روشنی میں بھی ہوتا نہیں کہیں موجود
جو رنگ ماہ و ملاقات سے نکلتا ہے

مجھے پتہ ہے جو خوشبو کا ایک جھونکا سا
کبھی کبھی ترے باغات سے نکلتا ہے

اسی نواح میں آباد ہوں کہیں میں بھی
دھواں جو میرے مضافات سے نکلتا ہے

دل اور طرح کے حالات سے اُلجھتا ہوا
کچھ اور طرح کے حالات سے نکلتا ہے

ثبوت سارا ہمارے خلاف بھی اب تو
ہمارے اپنے بیانات سے نکلتا ہے

جو چاروں سمت گرانی کی ہے فراوانی
تو قحط بھی اسی بہتات سے نکلتا ہے

وہ لحن جس کا سروکار ہی نہیں مجھ سے
کبھی تو وہ بھی مری ذات سے نکلتا ہے

ظفر، یہ باعثِ تشویش بھی ہے سب کے لیے
جو مطلب اور مری بات سے نکلتا ہے

-☆-

وہ جس طرح کے بھی ہنگام سے نکلتا ہے
ہمارا کام ترے نام سے نکلتا ہے

کہیں وہ اپنے ہی کہرام سے نکلتا ہے
جو دیکھنے میں کسی کام سے نکلتا ہے

ہے مستحق وہ زیادہ تری توجہ کا
جو اپنے آپ ترے دام سے نکلتا ہے

ہے یہ بھی چیز مرے کام کی جو شعلہ سا
تمھارے سلسلۂ شام سے نکلتا ہے

جو گھر میں گھستا ہے اودھم سا اک مچاتا ہوا
وہ باہر اتنے ہی آرام سے نکلتا ہے

نوید ہو کہ نہ ہونے سے ہے مرا ہونا
شروع بھی مرا انجام سے نکلتا ہے

تو روشنی مرے دالان تک ہی رہتی ہے
جو ماہتاب کسی بام سے نکلتا ہے

چلا جو کرتے ہیں مخصوص لوگ ہی اُس پر
وہ راستہ روشِ عام سے نکلتا ہے

ظفر، کسی کے بھی پلّے نہ پڑ سکے بے شک
ہمارا کام تو ابہام سے نکلتا ہے

-☆-

جہاں یہ دل ترے جنجال سے نکلتا ہے
تو جیسے قید مہ و سال سے نکلتا ہے

ابھی حساب نہیں ہو سکا، ابھی اپنا
کچھ اور تیرے زر و مال سے نکلتا ہے

یہ راز کیا ہے کہ اس بار میری حالت کا
سُراغ سا ترے احوال سے نکلتا ہے

سمجھتے ہیں کہ ترے گھر کا راستہ شاید
ہمارے سبزۂ پامال سے نکلتا ہے

تری جزا و سزا کا معاملہ بھی کہیں
ہمارے نامۂ اعمال سے نکلتا ہے

رواں ہیں دل کی طرف سے ہرے بھرے آنسو
یہ چشمہ بھی اسی پاتال سے نکلتا ہے

میں یادگار ہوں اپنے پُرانے وقتوں کی
کہ ماضی اب بھی مرے حال سے نکلتا ہے

ابھی نہیں کسی تفصیل کی طلب ہم کو
کہ مدعا ابھی اجمال سے نکلتا ہے

یہی بہت ہے کہ پرواز کے بجائے، ظفر
جو حوصلہ سا پر و بال سے نکلتا ہے

☆☆☆

کہاں وہ کوشش بسیار سے نکلتا ہے
جو کام طعنۂ اغیار سے نکلتا ہے

تجھے خبر نہیں، پہلو ہماری صحت کا
کبھی کبھی ترے آزار سے نکلتا ہے

کہاں پہنچنا ہے اس کو، یہ سب خبر ہے مجھے
جو راستہ ترے انکار سے نکلتا ہے

لگی ہے آگ تو دریا کے اس کنارے پر
دھواں سا کس لیے اُس پار سے نکلتا ہے

ہوا نہ ہو بھی تو وقفوں کے ساتھ اب بھی کبھی
غبار سا مرے آثار سے نکلتا ہے

ہمیں خبر ہے بہت، اور ہی کوئی مطلب
ہماری گرمیِ گفتار سے نکلتا ہے

کیا ہے جمع تو یہ خاروخس، اور اب دیکھیں
نتیجہ بھی کچھ اس انبار سے نکلتا ہے

کبھی کبھی ہو برآمد بھی اس مشین سے شعر
تو اک تھکی ہوئی رفتار سے نکلتا ہے

تعلق اپنا بہت لاتعلقی کا، ظفر
کسی ہمارے سروکار سے نکلتا ہے

☆☆☆

مزہ کچھ تو ملے گا موج کو منجدھار کرنے میں
بھلے میں ڈوب ہی جاؤں یہ دریا پار کرنے میں

محبت لفظ تھا ، مُشکل بُہت پیش آئی تھی ہم کو
جسے مستور رکھنے میں ، جسے اظہار کرنے میں

یہ لگتا ہے لگے گی اور کافی دیر دُنیا کو
ہمیں اک دن تمہارے خواب سے بیدار کرنے میں

تمھیں پہنچا ہو کوئی فائدہ اس کا تو پہنچا ہو
ہمیں دوبارہ ان حالات سے دوچار کرنے میں

ہماری موت کو کچھ اور بھی آسان ہونا تھا
ہماری زندگی کچھ اور بھی دشوار کرنے میں

کبھی ایکا تھا جن کو اک جگہ مل جُل کے رہنے کا
وہی اب مُستعد ہیں درمیاں دیوار کرنے میں

لگاتے اینٹ ایک آدھ اپنی بھی تعمیر میں کوئی
وہ جن کی عمر گذری ہے مجھے مسمار کرنے میں

گڑھے بھی کھودنے کا کام ساتھ اُس کے رہا جاری
بہت مصروف تھے جب راستا ہموار کرنے میں

ظفر کس سے شکایت کیجیے جا کر ، کہ بیش و کم
ہمارا ہاتھ بھی ہے اُس کو دنیادار کرنے میں

☆

ہیں نقصانات یُوں تو اور بھی تعجیل کرنے میں
مَیں خود معدوم ہو جاتا ہُوں کچھ تشکیل کرنے میں

ہمارا وقت بھی اچھا گذر جاتا ہے اور تم بھی
ہُنرمندی بہت رکھتے ہو قال و قیل کرنے میں

محبت پر ذرا اک تازگی آ جائے گی اس سے
سو کیا نقصان ہے لمبی سی اک تعطیل کرنے میں

کئی فرمائشیں ہیں اور بھی اس طرح کی ، یہ بھی
رُکاوٹ ہے تمہارے حکم کی تعمیل کرنے میں

اسی مصروفیت میں رات دن رہتے ہیں کیا کیجے
کہیں ارسال ہونے میں ، کہیں ترسیل کرنے میں

مَیں اُن الفاظ کا بہتر کوئی مصرف نکالوں گا
جو استعمال ہوں گے آپ کی تذلیل کرنے میں

بُرا بھی شعر کہنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے
مدد کرتا ہے مُنہ کا ذائقہ تبدیل کرنے میں

نکالی ہیں کئی خود شعر کی زنجیر سے کڑیاں
مکمل صُورت اظہار کی تقلیل کرنے میں

ظفر ، اس کو ادھورا چھوڑ دو اب بھی تو بہتر ہے
پریشاں ہو بہت جس کام کی تکمیل کرنے میں

☆

رہ رہ کے زبانی کبھی تحریر سے ہم نے
قائل کیا اُس کو اسی تدبیر سے ہم نے

کس سمت لیے جاتے ہو، اور کیا ہے ارادہ
پوچھا نہ کبھی اپنے عناں گیر سے ہم نے

دل پر کوئی قابو نہ رہا جب تو کسی طور
باندھا ہے یہ وحشی تری زنجیر سے ہم نے

ہر بار مدد کے لیے اوروں کو پکارا
یا کام لیا نعرۂ تکبیر سے ہم نے

بہتر ہے کہ اب کام کوئی اور کیا کر
یہ بھی نہ کہا کاتبِ تقدیر سے ہم نے

اپنی ہی کرامات دکھاتے رہے سب کو
سرقہ نہ کیا معجزۂ میرؔ سے ہم نے

تخریب تو کرتے رہے سو طرح کی، لیکن
یہ کام کیا جذبۂ تعمیر سے ہم نے

اب دیکھیے کیا اس کا نکلتا ہے نتیجہ
ماتھا ہے لگایا ہُوا تاثیر سے ہم نے

وہ بامِ تماشا ہُوا غائب تو، ظفرؔ آج
لٹکا لیا خود کو کسی شہتیر سے ہم نے

☆

بدلہ یہ لیا حسرتِ اظہار سے ہم نے
آغاز کیا اپنے ہی انکار سے ہم نے

دروازہ نہیں اپنے سروکار میں شامل
ہے رابطہ رکھا ہُوا دیوار سے ہم نے

امکان سا کھولا ہُوا ساحل کی ہوا پر
اُمید سی باندھی ہوئی اُس پار سے ہم نے

اپنی ہی بگاڑی ہوئی صورت کے علاوہ
کچھ اور نکالا نہیں طومار سے ہم نے

اُس کا بھی کوئی فائدہ پہنچا نہ کسی کو
آساں جو برآمد کیا دُشوار سے ہم نے

منزل جو ہماری تھی، کہیں رہ گئی پیچھے
یہ کام لیا تندیِ رفتار سے ہم نے

یہ دُھوپ ہی تھی اپنی گذرگاہ، سو، رکھا
اک فاصلہ بھی سایۂ اشجار سے ہم نے

جانچا ہے کسی اور طریقے سے یہ سب کچھ
پرکھا ہے کسی اپنے ہی معیار سے ہم نے

اُس کی بھی ادا کی ہے، ظفرؔ آج تو قیمت
جو چیز خریدی نہیں بازار سے ہم نے

☆

جوڑا ہے کسی اور ہی انجام سے ہم نے
کرنا تھا جو آغاز ترے نام سے ہم نے

مصروفیت اپنے لیے گھر میں ہی نکل آئی
جانا تھا وہاں پر بھی کسی کام سے ہم نے

رکھتی ہے پریشاں بھی وہی حد سے زیادہ
جو بات سُنی تھی بڑے آرام سے ہم نے

تا دیر ہی رہنا تھا یہاں ذکر تمھارا
کچھ لوگ بُلائے ہوئے تھے شام سے ہم نے

وہ شامت اعمال تھی اپنی کوئی ، ورنہ
اک فاصلہ رکھا ہُوا تھا دام سے ہم نے

اک چیز منگائی تھی بہُت دُور سے اُس رات
اک چاند اُتارا تھا لبِ بام سے ہم نے

جس شور سے قائم ہوئی پہچان ہماری
مُنہ موڑ لیا تھا اُسی کہرام سے ہم نے

پہلے تو نہیں تھی کوئی لوگوں کی توجہ
سو کام نکالے ترے الزام سے ہم نے

تھا باعث رُسوائی ، ظفر ، اپنا وہی کام
ہٹ کر جو کیا ہے روشِ عام سے ہم نے

☆

ٹکرا دیا بھرپور کو پایاب سے ہم نے
بدلا ہے ترا خواب کسی خواب سے ہم نے

ایک اور طرح کی چمک اُس میں نظر آئی
دیکھا جو اندھیرے کو تب و تاب سے ہم نے

اک راز چھلکتا ہُوا ، دُشمن کی زباں پر
اک رنگ چھپایا ہُوا احباب سے ہم نے

رشتہ کوئی جوڑا ہُوا شاور سے شب و روز
ناتا کوئی توڑا ہُوا تالاب سے ہم نے

اوکاڑہ سے لاہور ہی پہنچی ہے بمشکل
آواز اٹھائی تھی جو پنجاب سے ہم نے

سرگرمیاں اپنی رہیں ملتان کی حد تک
اُمید لگا رکھی ہے خوشاب سے ہم نے

دُشنام طرازی پہ بھی مجبور ہوئے جب
کی ہے یہاں وہ بھی ادب آداب سے ہم نے

ظاہر ہے ، سُکڑتی ہوئی شُہرت میں اضافہ
ناچار کیا جس پر سُرخاب سے ہم نے

دیوار ہی پھاندی ہے ، ظفر ، اُس کی ہمیشہ
زحمت نہیں کی کُھلتے ہوئے باب سے ہم نے

☆

ہوتے گئے تھے جمع ہی ارمان ہمارے
سارے جو ہوئے خواب پریشان ہمارے

خوش فہم تھے اتنے کہ سمجھتے رہے، خود ہی
اچھے کبھی ہو جائیں گے سرطان ہمارے

شب جنگ عدو سے رہی، جاگے تو یہ دیکھا
ہاتھوں میں تھے اپنے ہی گریبان ہمارے

آبادیاں گنجان تھیں باہر سے ہی اُتنی
اندر سے یہی شہر تھے سُنسان ہمارے

بادل کو ہوا لے گئی ہر بار اُڑا کر
ساون میں بھی سُوکھے ہی رہے دھان ہمارے

مضبوط نہ تھا ہم سے کبھی کفر تو اتنا
لیکن، ذرا کمزور تھے ایمان ہمارے

اشیائے خور و نوش کی قلت ہوئی جب سے
بچوں ہی سے بھرپور ہیں دالان ہمارے

جس بات پہ یہ فخر کیا کرتے تھے اتنا
ہیں اُس پہ ہی اب لوگ پشیمان ہمارے

ہوتا رہا اندر تو، ظفر، گھر کا صفایا
سویا کیے باہر کہیں دربان ہمارے

☆

چلتی نہیں اب کوئی جو تدبیر ہماری
آتی ہے کہیں اور سے تقدیر ہماری

پیتل ہُوا جاتا ہے بنایا ہُوا سونا
اور، راکھ ہوئی جاتی ہے اکسیر ہماری

سیدھا تھا اگر راستہ اپنا تو بھلا کیوں
اُلٹی ہوئی ہر خواب کی تعبیر ہماری

کچھ ہم بھی خوشی سے بھگت لیتے ہیں تعزیر
کچھ وہ بھی بتاتے نہیں تقصیر ہماری

رخنہ جو کبھی اس میں پڑا تھا کہیں پہلے
ویسی ہی رُکی رہ گئی تعمیر ہماری

دیوانہ پن اگلا سا وہ باقی بھی نہیں اب
کچھ کھول بھی رکھتے ہیں وہ زنجیر ہماری

جلسے جو ہیں سُنسان، جلُوس اپنے ہیں ویران
آتا نہیں سُننے کوئی تقریر ہماری

دشمن کے مُقابل تھے صف آرا تو بہت ہم
پر، نیام سے نکلی نہیں شمشیر ہماری

بولا ہے، ظفر، جھوٹ ہی لوگوں سے کچھ اتنا
اب آئے گی کیا بات میں تاثیر ہماری

☆

اگرچہ ہم لوگ داستاں میں پڑے ہوئے ہیں
مگر، ابھی معرضِ بیاں میں پڑے ہوئے ہیں

زمیں پہ ہیں نہ آسماں میں پڑے ہوئے ہیں
نہیں بھی ہیں، اور ترے جہاں میں پڑے ہوئے ہیں

گریں، مگر، واپس آسماں کو پلٹ گئی تھیں
جو بجلیوں کے پر آشیاں میں پڑے ہوئے ہیں

ابھی کسی رہزنی کا ہے انتظار ہم کو
ابھی جو کچھ دن تری اماں میں پڑے ہوئے ہیں

ہماری ہستی بھی عکس ہے تیری نیستی کا
کہ وہم ہیں، اور، ترے گماں میں پڑے ہوئے ہیں

نظر ہی پڑتی نہیں خریدار کی تو ہم پر
کچھ اس طرح سے کسی دکاں میں پڑے ہوئے ہیں

کچھ اس نہ ہونے میں ہی کہیں تھا ہمارا ہونا
ہمارے نقشے اسی نشاں میں پڑے ہوئے ہیں

ابھی جو تعمیر ہونے والا ہے اپنی خاطر
سو، ہم ازل سے اسی مکاں میں پڑے ہوئے ہیں

زمیں سے بھی، ظفر، نظر آنا چاہئیں تھے
مرے ستارے جو کہکشاں میں پڑے ہوئے ہیں

☆

یہ موت ہے یا کہ زندگی میں پڑے ہوئے ہیں
کسی سے باہر ہیں، اور کسی میں پڑے ہوئے ہیں

ہمارے سر سے گذرنے والا ہے رنگ پانی
جو ہم یہاں اپنی سادگی میں پڑے ہوئے ہیں

لطیفہ یہ ہے، وہی کسی کو نظر نہ آئے
کہ جو یہاں تیز روشنی میں پڑے ہوئے ہیں

ابھی سے گذرے گا کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
یہ اتنے رخنے جو دوستی میں پڑے ہوئے ہیں

لباس کی طرح سے ارادہ بدل لیا ہے
کہ جو ابھی میں تھے، اب کبھی میں پڑے ہوئے ہیں

یہی محبت ہے آئے دن کی کوئی مصیبت
نکل کے پہلی سے دوسری میں پڑے ہوئے ہیں

وہ آپ نے ہم کو جس گڑھے سے نکالنا تھا
کئی زمانوں سے ہم اسی میں پڑے ہوئے ہیں

پنپ رہی کوئی ابتری سی ہے اندر اندر
کہ ہم بظاہر تو بہتری میں پڑے ہوئے ہیں

ظفر، ہر اک شے سے جیسے برکت ہی اٹھ گئی ہے
بہت زیادہ کسی کمی میں پڑے ہوئے ہیں

☆

ظفر، یہ کس طرح کے سفر میں پڑے ہوئے ہیں
کہ ایسے لگتا ہے جیسے گھر میں پڑے ہوئے ہیں

نکل تو آئے ہیں شہر سے ہم کسی بہانے
یہی بہت ہے کہ رہگذر میں پڑے ہوئے ہیں

چھپا ہُوا ہے جہاں یہ اعلان مختصر سا
ہم اپنے مرنے کی اُس خبر میں پڑے ہوئے ہیں

سمجھ سکو تو نہاد میری بھی ہے اُنھی پر
وہ خاک پارے جو دشت و در میں پڑے ہوئے ہیں

وہیں پہ ہر چیز ہے جہاں ہونا چاہیے تھی
فساد خُوں میں، فتُور سر میں پڑے ہوئے ہیں

کسی کو پروا نہیں کسی کی، مگر ہم ایسے
جو ڈر رہے تھے یہاں خطر میں پڑے ہوئے ہیں

یہ خاک ہے، اور، زور کرتی ہوئی روانی
کئی سفینے ابھی بھنور میں پڑے ہوئے ہیں

یہ آج تک بھی الگ نہیں کر سکا ہُوں ان کو
جو عیب ہیں، اور مرے ہنر میں پڑے ہوئے ہیں

جو بجلیوں کے رہے، ظفر، منتظر ہمیشہ
وہ آشیانے ابھی شجر میں پڑے ہوئے ہیں

-☆-

الگ الگ، اور، جابجا میں پڑے ہوئے ہیں
ہوا کے ٹکڑے ابھی ہوا میں پڑے ہوئے ہیں

کوئی مُلاقات، کوئی مُہلت، کوئی محبت
یہ مرحلے سب مری دُعا میں پڑے ہوئے ہیں

پہنچ گئی ہے کہاں سے دنیا کہاں، مگر، ہم
یہاں اُسی وعدۂ وفا میں پڑے ہوئے ہیں

نہ جانے کیوں وہ بھی اپنی ضد پر اڑا ہُوا تھا
سو، ہم بھی اپنی کسی انا میں پڑے ہوئے ہیں

ہمیں خبر تھی کہ اُس کی تعبیر کیا ہے، پھر بھی
ابھی اُسی خوابِ خوش نُما میں پڑے ہوئے ہیں

زمین پر تھا اسی طرح قصۂ زمیں بھی
خلا کے احوال بھی خلا میں پڑے ہوئے ہیں

ہمیں عبث ڈھونڈتی تھی دنیا، وگرنہ ہم بھی
یہیں کہیں خیمۂ خُدا میں پڑے ہوئے ہیں

جنھیں کبھی کوئی آنکھ بھر کر نہ دیکھ پایا
کچھ ایسے منظر ابھی فضا میں پڑے ہوئے ہیں

ظفر، انھیں کھولنے کو بھی وقت چاہیے تھا
کہ پیچ ایسے مری نوا میں پڑے ہوئے ہیں

-☆-

جہاں پہ ہونا کہیں، وہیں سے لگے ہوئے ہیں
کہ آسماں پر ہیں، اور، زمیں سے لگے ہوئے ہیں

یہ پھول ہم نے چُنے ہوئے ہیں اسی چمن سے
یہ زخم شاید ہمیں یہیں سے لگے ہوئے ہیں

میں خود تو پندار اپنا قائم رکھے ہوئے تھا
ہزار سجدے مری جبیں سے لگے ہوئے ہیں

تمھارا چہرہ کہ دیدنی اب ہُوا ہے جا کر
تمھارے پیچھے تو قبل ازیں سے لگے ہوئے ہیں

جو ایک پل میں جھلک دکھا کر پلٹ گیا تھا
سو، ہم اسی خواب واپسیں سے لگے ہوئے ہیں

سمجھ رہے ہیں کہ ربط ہے استوار، یعنی
مکاں سے باہر ہیں، اور مکیں سے لگے ہوئے ہیں

جہاں بھی ہو اب ہمارا ٹوٹا ہُوا سفینہ
ہم اپنے اسباب تہ نشیں سے لگے ہوئے ہیں

یہ کام اپنا ہے، جس قدر بھی ہے، اور جس میں
لگے ہوئے ہیں جہاں کہیں سے لگے ہوئے ہیں

ظفر، اگر کوئی خاروخس ہیں تو کس لیے ہم
خود اپنی آواز آتشیں سے لگے ہوئے ہیں

-☆-

گل و سمن سے نہ رنگ و بُو سے لگے ہوئے ہیں
ابھی تو ہم صرف گفتگو سے لگے ہوئے ہیں

نہیں لگے تھے تو ہم نہیں تھے کسی طرف بھی
جو لگ گئے ہیں تو چار سُو سے لگے ہوئے ہیں

کبھی کوئی موج اُچھل بھی سکتی ہے اپنی جانب
اسی لیے تو کنارِ جُو سے لگے ہوئے ہیں

یہیں کہیں اپنے آپ کو گم کیا ہُوا تھا
سو، آج اپنی ہی جستجو سے لگے ہوئے ہیں

چلو، ہمارا نہیں، کسی کا تو ہے جو اب تک
سڑک پہ بکھرے ہوئے لہُو سے لگے ہوئے ہیں

یہ نرم کوشی ہماری حد سے بڑھی ہوئی تھی
اسی لیے ایک تُند خُو سے لگے ہوئے ہیں

یہ ناتوانی ہماری جیسی بھی تھی، مگر، ہم
یہ دیکھیے کیسے دُوبدُو سے لگے ہوئے ہیں

ہر آن ذلت ہے، اور، رسوائی ہے شب و روز
سو، کام ہے، عزت آبرو سے لگے ہوئے ہیں

ظفر، ابھی ٹھیک سے ہمیں بھی خبر نہیں ہے
کہ آج کل کس کی آرزو سے لگے ہوئے ہیں

-☆-

نظر نہیں آ رہا جدھر سے لگے ہوئے ہیں
ذرے ذرے اپنے اپنے گھر سے لگے ہوئے ہیں

لگا تو رکھی ہے گھر میں چوروں نے سیندھ، لیکن
پتا نہیں چل رہا کدھر سے لگے ہوئے ہیں

بگاڑ دیتے ہیں شکل جب بھی ذرا سی نکلے
جسے بنانے میں عمر بھر سے لگے ہوئے ہیں

خبر کوئی لا سکیں کبھی شاید اُس طرف کی
ہم اپنی دھن میں جو بے خبر سے لگے ہوئے ہیں

مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں
یہ بازوؤں کے بجائے پر سے لگے ہوئے ہیں

مرے علاوہ تمھیں بھی اک دن دکھائی دیں گے
کہ جو ہواؤں میں یہ شجر سے لگے ہوئے ہیں

ہوا گذرتی ہے، اور، کبوتر سُلگتے پھرتے
جہاں کہیں مجھ میں بام و در سے لگے ہوئے ہیں

کبھی جو دیکھو تو آ کے پھیلاؤ بھی ہمارا
کہ ہم بظاہر تو مختصر سے لگے ہوئے ہیں

ظفرؔ، سمجھتے ہیں نفع و نقصان خوب اپنا
جو فائدے میں کسی ضرر سے لگے ہوئے ہیں

☆

غبار غربت میں بھی وطن سے ملے ہوئے ہیں
کہ یہ بیاباں کسی چمن سے ملے ہوئے ہیں

کوئی بھی موسم ہو، تازہ تر ہے مہک ہماری
کہ ہم کبھی ایک گلبدن سے ملے ہوئے ہیں

ہمارا مل بیٹھنا یہی ہے کہ ہم کسی سے
اگر ملے ہیں تو سوءِ ظن سے ملے ہوئے ہیں

کبھی جو بیٹھے تو بے خبر ایک دوسرے سے
جو سچ کہیں تو اسی ملن سے ملے ہوئے ہیں

ہمارے اندر ہی اب ہیں موجود بھیڑیے بھی
کہ شہر پھیلے تو جا کے بن سے ملے ہوئے ہیں

یہ ہم جو اک دوسرے سے بدظن ہیں، اور، شاکی
ہمیں یہ تحفے اُس انجمن سے ملے ہوئے ہیں

اب اور محفوظ کیا ہو یہ جان و مال اپنا
کہ جو محافظ ہیں راہزن سے ملے ہوئے ہیں

سفید پوشی ہماری اتنی سی ہے کہ اپنے
لباس جیسے بھی ہیں، کفن سے ملے ہوئے ہیں

ہنر کوئی تھا تو ہاتھ اُس سے بھی دھو چکے ہم
ظفرؔ یہاں شاید اہلِ فن سے ملے ہوئے ہیں

☆

جو دوستی سے نہ دشمنی سے ملے ہوئے ہیں
یہ لگ رہا ہے کہ ہم ابھی سے ملے ہوئے ہیں

ہمیں وضاحت سے یاد ہیں خدوخال اُس کے
اگرچہ اک بار سرسری سے ملے ہوئے ہیں

جو تھی تو کس طرح کی مُلاقات یہ ہماری
کہ دُور ہیں مجھ سے، اور، کسی سے ملے ہوئے ہیں

یہ شہر اپنے لیے جو بیگانہ ہے سراسر
ہم اصل میں تو یہاں تجھی سے ملے ہوئے ہیں

اُڑائے پھرتی ہے رات بھر دُور دُور ہم کو
تو کیوں نہ ہو جب کسی پری سے ملے ہوئے ہیں

ہمارے احوال کا اب اندازہ آپ کر لو
کبھی جو ملتا نہیں، اُسی سے ملے ہوئے ہیں

ہمارے رُخ پہ یہ نُور کیوں کر بھلا نہ آتا
کہ اندر اندر کسی بدی سے ملے ہوئے ہیں

تو یہ سفیدی میں اک سیاہی کہاں سے آئی
اگر اندھیرے نہ روشنی سے ملے ہوئے ہیں

ہمارے حالات ہیں، ظفر، موت سے بھی بدتر
کہ ہم بظاہر تو زندگی سے ملے ہوئے ہیں

☆

مقام ہی اور تھا جہاں سے ملے ہوئے تھے
کہ ہم زمیں سے نہ آسماں سے ملے ہوئے تھے

تمھیں ہی کچھ یاد ہو، کہ مَیں تو بھلا چکا ہُوں
کہاں سے بچھڑے تھے ہم، کہاں سے ملے ہوئے تھے

نکل رہے تھے تمام اطراف سے گزر کر
ہوا کے جھونکے جو بادباں سے ملے ہوئے تھے

سُنائے ہم نے بھی انجمن میں وہی کہ ہم کو
وہ چند ٹکڑے جو داستاں سے ملے ہوئے تھے

اخیر تک شہر بھر پہ کچھ بھی ہُوا نہ ظاہر
کہ راز بھی اپنے رازداں سے ملے ہوئے تھے

بجا ہے اپنائیت جو پیدا نہیں ہوئی تھی
مکین ہی کب یہاں مکاں سے ملے ہوئے تھے

چلا کیے ہیں معاملے ہی یہاں زبانی
کہ لوگ دل سے نہیں، زباں سے ملے ہوئے تھے

وہاں پہ مسجد سے باہر آواز کیسے جاتی
جہاں مؤذن ہی خود اذاں سے ملے ہوئے تھے

ظفر، سزا بھی یہاں کہاں قاتلوں کو ملتی
کہ لکھنے والے تھے جو بیاں سے ملے ہوئے تھے

☆

چراغ تھے جس قدر ہوا سے ملے ہوئے تھے
یہاں پہ کفار بھی خدا سے ملے ہوئے تھے

ابھی وہی فاصلہ تھا شہروں سے جنگلوں کا
مگر، یہ پھر بھی جگہ جگہ سے ملے ہوئے تھے

ندی کے ہم ایسے دو کنارے تو تھے، مگر ہم
کہیں کہیں پہ ذرا ذرا سے ملے ہوئے تھے

اسی میں شامل تھا میری جانب نہ دیکھنا بھی
یہ سارے حیلے تری حیا سے ملے ہوئے تھے

مرے ستارے سے دُور کب تھا، ترا ستارہ
ترے خلا بھی مرے خلا سے ملے ہوئے تھے

میں اندر اندر ہی اپنے تجھ کو پکارتا تھا
ترے سلیقے مری صدا سے ملے ہوئے تھے

کسی بھی کوشش سے تیرے دریا کا رُخ نہ بدلا
اگرچہ آپس میں تیرے پیاسے ملے ہوئے تھے

دلوں میں ویسے تو ایک فرق آ گیا تھا، لیکن
الگ الگ بھی جدا جدا سے ملے ہوئے تھے

ظفر، ارادے ہمارے اُس کے کہیں کہیں پہ
کسی اجازت، کسی رضا سے ملے ہوئے تھے

-☆-

عرب سے اُٹھ کر کہیں ہم سے بچھڑے ہوئے ہیں
زیادہ ہوتے ہوئے بھی کم سے بچھڑے ہوئے ہیں

ہمارے ساتھ اُن کو آ کے جوڑا ہے مصلحت نے
کہیں نہیں جُڑ سکے تو ہم سے بچھڑے ہوئے ہیں

اُکھڑ گئے تھے کسی سبب سے تو اب دوبارہ
بڑا تردّد کیا ہے، گم سے بچھڑے ہوئے ہیں

تمہاری راہیں بھی اب تو مشکل نہیں ہیں، لیکن
ابھی تو اپنے ہی پیچ و خم سے بچھڑے ہوئے ہیں

کہیں پہنچتے ہیں یا نہیں، اس کا ذکر چھوڑو
قدم ہمارے کسی قدم سے بچھڑے ہوئے ہیں

ہم اپنی اوقات سے جو باہر نہیں نکلتے
ہماری خوشیوں کے خواب غم سے بچھڑے ہوئے ہیں

کسی کا تحریر پہ نہیں اختیار کوئی
کہ سارے کاغذ کسی قلم سے بچھڑے ہوئے ہیں

اب آخری بار اُس کے جلسے میں جائیں گے ہم
اسے بھی لے کر مریں گے، بم سے بچھڑے ہوئے ہیں

ظفر، کہ اُمیدوار جنت بھی ہیں سراسر
خدا کے ہوتے ہوئے صنم سے بچھڑے ہوئے ہیں

-☆-

عجب نہیں ہے جو رفتگاں سے جُڑے ہوئے ہیں
زمیں پہ آ کر بھی آسماں سے جُڑے ہوئے ہیں

بہت صفائی سے ہم کو جوڑا گیا ہے اب کے
پتا نہیں چل رہا کہاں سے جُڑے ہوئے ہیں

ذرا سی ٹھوکر میں ٹوٹ سکتے ہیں پھر وہیں سے
خیال رکھنا جہاں جہاں سے جُڑے ہوئے ہیں

جب آئے دن بجلیاں لپکتی ہیں اپنی جانب
تو کس لیے شاخِ آشیاں سے جُڑے ہوئے ہیں

سفر میں یوں تو کسی نے شامل نہیں کیا تھا
مگر، کسی طرح کارواں سے جُڑے ہوئے ہیں

کبھی تھے پیوستہ ایک خوابِ خزاں نُما سے
اور، اب کسی رنجِ رائگاں سے جُڑے ہوئے ہیں

کہیں کسی گُم شدہ ستارے کی جستجو ہے
جو آج بھی تیری کہکشاں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہم اپنی وابستگی کا احوال کیا بتائیں
جہاں نہیں بھی تھے ہم وہاں سے جُڑے ہوئے ہیں

ظفر، ہماری یہ بے بسی کوئی آ کے دیکھے
زباں کو توڑا ہے، اور، زباں سے جُڑے ہوئے ہیں

-☆-

کسی گماں سے، کسی یقیں سے جُڑے ہوئے ہیں
کہیں سے اُکھڑے ہوئے، کہیں سے جُڑے ہوئے ہیں

کچھ ایسی پیچیدہ تو نہیں ہے جُڑت ہماری
جہاں سے توڑا گیا، وہیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہمیں جُدائی نہیں تھی اُس ذات سے گوارا
اسی لیے اپنے ہم نشیں سے جُڑے ہوئے ہیں

کوئی سلوک آسماں نے اچھا نہیں کیا تھا
سو، اپنی چھوڑی ہوئی زمیں سے جُڑے ہوئے ہیں

یہ زہر شاید کبھی ہمارے بھی کام آئے
ضرورتاً مارِ آستیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہمارے اندر ہیں جو بھی ہیں فاصلے ہمارے
کہ دُور سے، اور، کبھی قریں سے جُڑے ہوئے ہیں

ابھی تو ممکن نہیں کہیں جاگنا ہمارا
ابھی اُسی خوابِ اولیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہمارے اندر کی برف شاید اسی سے پگھلے
جو ہم اِس آوازِ آتشیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ظفر، اُنھیں بھی پناہ ملتی نہیں کہیں پر
ہمارے دُشمن جو تھے ہمیں سے جُڑے ہوئے ہیں

-☆-

ٹھہرتے ہیں تو ہم سہاروں میں رہ گئے ہیں
اگر چلے ہیں تو رہگزاروں میں رہ گئے ہیں

چھلک سکیں باہر، اتنی کوشش تو کی ہے، لیکن
اُچھل اُچھل کر بھی ہم کناروں میں رہ گئے ہیں

سوادِ ساحل پہ منتظر تھا کوئی، مگر، ہم
کچھ اپنے پانی کے تیز دھاروں میں رہ گئے ہیں

ہمارے بس کا ہم یہ نئی زندگی کی مہلت
سوائے اس کے کہ اپنے پیاروں میں رہ گئے ہیں

بھٹک گئے سب، ہماری باری ہی آ نہ پائی
یہاں کھڑے ہم یونہی قطاروں میں رہ گئے ہیں

یہ لگ رہا ہے، ہمارے حصّے کے سارے دریا
وہیں کہیں اپنے کوہساروں میں رہ گئے ہیں

یہ ایک امانت ہے جس کو لوٹانا چاہتا ہوں
ترے ستارے مرے ستاروں میں رہ گئے ہیں

مزہ تو یہ ہے، سنور گئی عاقبت اُنہی کی
جو چار دن ہم گناہگاروں میں رہ گئے ہیں

ظفرؔ، رہا ہو کے آئیں گے دیکھنا کسی دن
ہوا کے جھونکے جو شاخساروں میں رہ گئے ہیں

☆

کہیں پہ موجود، اور، کہیں سے ہٹے ہوئے ہیں
زمین پر ہیں، مگر، زمیں سے ہٹے ہوئے ہیں

کہیں گئے ہیں نہ جانے والے ہیں سانپ اپنے
یہیں پہ ہیں، لیکن، آستیں سے ہٹے ہوئے ہیں

کمی کوئی آ رہی ہے رُسوائیوں میں شاید
کہ داغ اب کے مری جبیں سے ہٹے ہوئے ہیں

یہ فاصلے گھٹتے بڑھتے بھی ہیں، سو، آج کل وہ
قریں تو ہیں ہی، ذرا قریں سے ہٹے ہوئے ہیں

مکیں بھی رہتے ہیں ان مکانوں میں اجنبی سے
مکاں بھی جیسے ہر اک مکیں سے ہٹے ہوئے ہیں

جُڑے ہوئے ہیں وہ دُوسروں کے تو ساتھ اب بھی
ہٹے ہوئے ہیں تو بس ہمیں سے ہٹے ہوئے ہیں

ہماری آنکھیں ہی خالی خالی ہیں مدتوں سے
مگر، وہ منظر کہیں یہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ ہاں بھی کرتے نہیں ہیں کھل کر
اگرچہ وہ آج کل نہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

خرابِ اُفتادِ طبع نے بھی کیا، ظفرؔ، کو
جہاں سے اچھے لگے، وہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

☆

ظفر، فسانوں کہ داستانوں میں رہ گئے ہیں
ہم اپنے گذرے ہوئے زمانوں میں رہ گئے ہیں

عجب نہیں ہے کہ خود ہوا کے سپرد کر دیں
یہ چند تنکے جو آشیانوں میں رہ گئے ہیں

مکین سب کوچ کر گئے ہیں کسی طرف کو
اب اُن کے آثار ہی مکانوں میں رہ گئے ہیں

سُنا کرو صبح و شام کڑوی کسیلی باتیں
کہ اب یہی ذائقے زبانوں میں رہ گئے ہیں

پسند آئی ہے اس قدر خاطر و تواضع
جو میہماں سارے میزبانوں میں رہ گئے ہیں

ہمیں ہی شوکیس میں سجا کر رکھا گیا تھا
پڑے ہمیں شہر کی دکانوں میں رہ گئے ہیں

ابھی یہی انقلاب آیا ہے رفتہ رفتہ
جو رونے والے تھے، ناچ گانوں میں رہ گئے ہیں

الگ الگ اپنا اپنا پرچم اُٹھا رکھا ہے
کہ ہم قبیلوں نہ خاندانوں میں رہ گئے ہیں

ظفر، زمیں زاد تھے، زمیں سے ہی کام رکھا
جو آسمانی تھے، آسمانوں میں رہ گئے ہیں

☆

گذر گئیں مدتیں، برابر کھڑے ہوئے ہیں
ہمیں نہ چھیڑو، ہم اپنے اندر کھڑے ہوئے ہیں

کسی کی آمد کے منتظر بھی نہیں اگر ہم
تو کس لیے ایک رہگذر پر کھڑے ہوئے ہیں

یونہی ذرا بند ہے ابھی داخلہ ہمارا
اسی لیے آج گھر سے باہر کھڑے ہوئے ہیں

اب اپنا سُود و زیاں سمجھتے ہیں، اس لیے ہم
کسی کے پاس، اور، کہیں سے ہٹ کر کھڑے ہوئے ہیں

اسی طرح سے ہے ان ہواؤں میں اپنا ہونا
کہیں پہ بہتر، کہیں پہ کمتر کھڑے ہوئے ہیں

بٹھا دیا تھا ہمیں جھڑکنے کے بعد اُس نے
کسی توقع پہ اب مکرر کھڑے ہوئے ہیں

کسی اشارے پہ ہیں یہی موم ہونے والے
جو لگ رہا ہے کہ جیسے پتھر کھڑے ہوئے ہیں

دیے ہیں، اور، روشنی نہیں دے رہے کہیں پر
درخت ہیں، اور، کب سے بنجر کھڑے ہوئے ہیں

یہ آپ کی بزم ہی کا اُسلوب ہے کہ ہم نے
ظفر کو دیکھا ہے جب بھی، اکثر کھڑے ہوئے ہیں

☆

ہیں نقشِ دیوار، جابجا سے مٹے ہوئے ہیں
سو، کچھ تو بارش سے، کچھ ہوا سے مٹے ہوئے ہیں

گھر اور باہر ہماری حالت ہے ایک جیسی
یہاں الگ سے، وہاں جدا سے مٹے ہوئے ہیں

زیادہ بدلے نہیں ہیں کچھ خال و خد ہمارے
ہنوز باقی تو ہیں، ذرا سے مٹے ہوئے ہیں

بجھے ہوئے ہیں کئی ستارے سے آسماں پر
جو رہگذر پر بھی نقشِ پا سے مٹے ہوئے ہیں

حدیں ہیں، اور، تیرے دم قدم سے ہیں غیر واضح
حروف ہیں، اور، مری صدا سے مٹے ہوئے ہیں

ہمارا مٹنا بھی اک تماشا تھا، آؤ دیکھو!
مٹے ہوئے ہیں تو کس ادا سے مٹے ہوئے ہیں

وہ اصل صورت میں اپنی خود بھی نہ آئیں گے اب
جو تیری مرضی، تری رضا سے مٹے ہوئے ہیں

قصور اس میں کہیں کسی اور کا نہیں ہے
کہ ہم کسی اپنی ہی خطا سے مٹے ہوئے ہیں

ظفر، وہ تحریر ہیں جسے پڑھ سکے نہ کوئی
کٹے پھٹے، اور، جگہ جگہ سے مٹے ہوئے ہیں

☆

بجھے بجھے، اور، راستوں پر پڑے ہوئے ہیں
کہ ہم ستارے ترے فلک سے جھڑے ہوئے ہیں

ہوائیں بھی اپنے راستوں پر رواں ہیں یوں ہی
درخت بھی ایک خامشی میں کھڑے ہوئے ہیں

ہماری نسبت ہے خاک سے، اور، ثبوت یہ ہے
کہ آج زندہ ہی اس زمیں میں گڑے ہوئے ہیں

یہ کیفیت ہے کہ اب سنبھالے نہیں سنبھلتے
میں خوش نہیں ہوں جو میرے دریا چڑھے ہوئے ہیں

کوئی زمانہ تھا، ہم یہاں خواب تھے کسی کا
اور، اب کسی اور ہی کے ماتھے مڑھے ہوئے ہیں

کہاں تک اس راستے پہ جانا ہے، سب خبر ہے
کہ یہ سبق ہم بھی تھوڑا پڑھے ہوئے ہیں

نہیں ہے کوئی جو پیش رفت اپنی روک سکتا
غلط نہیں ہے کہ اپنی حد سے بڑھے ہوئے ہیں

کسی کے پلے ہی کیا پڑے شاعری ہماری
کہ لفظ کچھ بے حساب ہم نے جڑے ہوئے ہیں

مزاج ہی مل نہیں رہا ہے، ظفر کچھ اپنا
کہ آپ تو جیسے ہر کسی سے لڑے ہوئے ہیں

☆

کہیں ہم اپنی ہی بے کرانی میں رہ گئے ہیں
سو، کم ہیں باہر، زیادہ پانی میں رہ گئے ہیں

بُرا بھلا واقعہ ہی کچھ باہر آ سکا ہے
ہمارے کردار سب کہانی میں رہ گئے ہیں

پہنچ گیا ہے یہاں کہیں کا کہیں زمانہ
مگر، ہمیں تیری باغبانی میں رہ گئے ہیں

کبھی کناروں میں رُک گیا راستہ ہمارا
کبھی کسی زور کی روانی میں رہ گئے ہیں

ترا فسوں ہی ترے فسانے میں بولتا ہے
ترے نشاں ہی تری نشانی میں رہ گئے ہیں

شکایت اُن کی بھی کوئی بے جا نہیں زیادہ
کوئی تو رخنے بھی رازدانی میں رہ گئے ہیں

وہاں پہ وہ انقلاب آنا ہی تھے جو آئے
کہ مست ہم اپنی خوش گمانی میں رہ گئے ہیں

کوئی کسر رہ گئی ہے الفاظ میں کہیں یہ
کئی دقیقے یہاں معانی میں رہ گئے ہیں

مطالبات اے ظفر ہمارے لکھے ہوئے تھے
جو رہ گئے ہیں تو کچھ زبانی میں رہ گئے ہیں

☆

کچھ سبب ہی نہ بنے بات بڑھا دینے کا
کھیل کھیلا ہُوا یہ اُس کو بھلا دینے کا

اپنے ہی سامنے دیوار بنا بیٹھا ہُوں
ہے یہ انجام اُسے رستے سے ہٹا دینے کا

یونہی چُپ چاپ گذر جایئے ان گلیوں سے
یہاں کچھ اور ہی مطلب ہے صدا دینے کا

راستہ روکنا مقصد نہیں، کچھ اور ہے یہ
درمیاں میں کوئی دیوار اُٹھا دینے کا

آنے والوں کو، طریقہ مجھے آتا ہے بہت
جانے والوں کے تعاقب میں لگا دینے کا

ایک مقصد تو ہُوا ڈھونڈنا اُس کو ہر سُو
لُطف ہی اور ہے پانے سے گنوا دینے کا

اک ہُنر پاس تھا اپنے، سو نہیں اب وہ بھی
جو دکھائی نہیں دیتا ہے دکھا دینے کا

سب کو معلوم ہے، اور حوصلہ رکھتا ہُوں ابھی
اپنے لکھے ہوئے کو خود ہی مٹا دینے کا

ٹوٹ پڑتی ہے قیامت کوئی پہلے ہی، ظفر
قصد کرتا ہُوں جو فتنے کو جگا دینے کا

☆

بے نام جس قدر ہیں انھیں نام دے سکوں
شاید یہ کارنامہ سرانجام دے سکوں

اس حال میں بھی میری تمنا ہے یہ کہ مَیں
کام آ سکوں ترے کہ تجھے کام دے سکوں

ہارا ہُوں آپ اور مجھے اُس کی تلاش ہے
اپنی شکست کا جسے الزام دے سکوں

اتنا بھی کامیاب نہیں ہو سکا کہ مَیں
کوئی ثبوتِ کوششِ ناکام دے سکوں

اتنا تو اختیار مجھے ہونا چاہیے
جس کو دُعا نہ دُوں اُسے دُشنام دے سکوں

مُشکل میں ہے جو اُس کو سہولت کروں بہم
مطلوب ہو جسے اُسے آرام دے سکوں

مجھ سے سوال اُس نے کیا ہے جو صبح دم
اُس کا جواب مَیں بھی سرِشام دے سکوں

دیکھیں تو یہ بھی فرضِ کفایہ ہے سربسر
دل کا اگر کہیں اُسے پیغام دے سکوں

چھپ کر مرا سُراغ نہ لیتا پھرے، ظفر
یہ مشورہ اُسے جو سرِعام دے سکوں

☆

الگ الگ اور جدا جدا سے بندھے ہوئے ہیں
چراغ ہیں اور کسی ہوا سے بندھے ہوئے ہیں

ہم اپنی مجبوریوں میں رہتے ہیں جیتے مرتے
کبھی خموشی، کبھی صدا سے بندھے ہوئے ہیں

جو ہم سے مِلنا تو بس ذرا احتیاط رکھنا
کہ ٹوٹ کر ہم جگہ جگہ سے بندھے ہوئے ہیں

ہے اپنی یہ سنگ بستگی ہی ہمارا ہونا
ہمیں نہ کھولو کہ ہم سدا سے بندھے ہوئے ہیں

ہم اُس سے آزاد ہو رہے ہیں ضرور لیکن
ابھی کسر ہے کوئی، ذرا سے بندھے ہوئے ہیں

یہاں کئی لوگ اب بھی موجود ہیں جو اپنی
بچی پُرانی اُسی وفا سے بندھے ہوئے ہیں

نکل نہ سکتے تھے کوچۂ کفر کی طرف کو
کہ ہم زمانہ ہُوا خُدا سے بندھے ہوئے ہیں

خلاف اُس کے ہے نالشِ وصل اپنی جاری
کہ مدعی ہیں سو مدعا سے بندھے ہوئے ہیں

ظفر یہ لگتی ہے دشمنوں کی ہی کوئی سازش
جو ہم کسی یار آشنا سے بندھے ہوئے ہیں

☆

پتا نہیں چل رہا کہاں سے بندھے ہوئے ہیں
زمیں پہ ہیں اور آسماں سے بندھے ہوئے ہیں

ہماری وابستگی کوئی راز بھی نہیں اب
وہیں سے کھولو ہمیں جہاں سے بندھے ہوئے ہیں

نہیں کسی کے بھی پاس تحریر تو ہماری
بندھے ہوئے ہیں تو بس زباں سے بندھے ہوئے ہیں

گواہی اپنے خلاف جھوٹی تو تھی ، مگر ہم
جو دے چکے ہیں اُسی بیاں سے بندھے ہوئے ہیں

فریب کاری ہے سربسر بندوبست اپنا
جہاں سے لگتے نہیں وہاں سے بندھے ہوئے ہیں

تھا ایک دم مُشکل اور آساں ہمارا ملنا
ہیں بے سُراغ اور کسی نشاں سے بندھے ہوئے ہیں

ہمیں کناروں سے دُور لے جا رہے ہیں یکسر
ہوا کے جھونکے جو بادباں سے بندھے ہوئے ہیں

ہماری حیثیت اس سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی
غبار ہیں اور کارواں سے بندھے ہوئے ہیں

نکل کے جاتے بھی ہم یہاں سے ظفر کہیں کو
مگر کریں کیا کہ اس مکاں سے بندھے ہوئے ہیں

☆☆

کسی بہانے سے اب دوبارہ کھلے ہوئے تھے
کہ حبس تھا اور بٹن تمہارے کھلے ہوئے تھے

ابھی میں سمت سفر ہی طے کر نہیں سکا تھا
مرے لیے راستے جو سارے کھلے ہوئے تھے

مچی ہوئی کوئی جیسے بھگدڑ تھی آسماں پر
بندھی ہوئی تھی ہوا ، ستارے کھلے ہوئے تھے

یہاں جو تھا انتظار دریا کو پانیوں کا
مثال آغوش کیا کنارے کھلے ہوئے تھے

اسی لیے پھر پھرا کے میں واپس آ گیا ہوں
کہ میرے اس شہر میں گزارے کھلے ہوئے تھے

وہاں کہیں میں ہی چوک میں آ کے رُک گیا تھا
جہاں مرے سامنے اشارے کھلے ہوئے تھے

کہ شہر سے جیسے کوچ ہی کر رہا تھا میں اب
حساب جتنے تھے میرے بارے کھلے ہوئے تھے

پڑا ہوا ذہن سے کھرچنے کی خاطر اب تو
قدم قدم پر یہاں ادارے کھلے ہوئے تھے

ظفر، کسی چور نے بھی شب بھر نہ کی توجہ
وگرنہ دروازے تو ہمارے کھلے ہوئے تھے

☆☆

ہمارے اندر تو کوئی باہر لکھے ہوئے تھے
کہ فیصلے جو بھی تھے ، برابر لکھے ہوئے تھے

جنہیں مٹایا تھا ہم نے دیوار دوستی سے
وہ سارے مضمون اب ہوا پر لکھے ہوئے تھے

کوئی کھنڈر تھا اور اُس کی مٹتی ہوئی عبارت
مُنڈیر تھی ، اور وہاں کبوتر لکھے ہوئے تھے

خدا کی قدرت ہے لہلہائیں اُنھی میں فصلیں
جو کھیت پٹواریوں نے بنجر لکھے ہوئے تھے

وہ دُور آبِ سراب کا دھوپ میں چمکنا
ہمارے صحراؤں پر سمندر لکھے ہوئے تھے

ہماری قرأت ہی ڈھنگ سے کر سکا نہ کوئی
کہ ہم ذرا دوسروں سے ہٹ کر لکھے ہوئے تھے

کتاب میں رہ گئے تھے بھرتی کے خواب سارے
وہی حذف کر دیے جو بہتر لکھے ہوئے تھے

کبھی نہیں کھولنے بچھانے کی نوبت آئی
ہماری تقدیر میں جو بستر لکھے ہوئے تھے

کئی ظفر عمر جن کی ساری مُسافرت میں
اُنھی کے ناموں کے سامنے گھر لکھے ہوئے تھے

☆

اصل تھا یا کسی ہونے کا اشارہ ہُوا میں
صورتِ حال تھی ایسی کہ دوبارہ ہُوا میں

خود کو پہچان سکوں گا کہیں رفتہ رفتہ
کسی اپنی ہی بلندی سے اُتارا ہُوا میں

چین سے بیٹھنے دیتی نہیں آواز کوئی
ہوں کسی دُوسری دنیا کا پکارا ہُوا میں

کہیں تیرا تو وہاں نام و نشاں تک نہیں تھا
جہاں پہنچا ترے رستے سے گزارا ہُوا میں

موج در موج سمندر مرے اُوپر نیچے
کہ ڈبویا ہُوا ہوں اور نہ اُبھارا ہُوا میں

ناپسندیدہ ہی جیتا رہا اس دُنیا میں
آخری عمر میں اب جا کے گوارا ہُوا میں

زندگی بھر کبھی یکساں مری تقدیر نہ تھی
کبھی آدھا ہُوا ہوں اور کبھی سارا ہُوا میں

کس طرح آئی ہے یہ اتنی بڑی تبدیلی
کبھی اپنا بھی نہیں تھا جو تمھارا ہُوا میں

ریت ہی تھا کسی سُوکھے ہوئے دریا کی ظفر
اب جو پانی نظر آیا تو کنارہ ہُوا میں

☆

خرچ ہوتا ہوں اسی چال سے چلتا ہوا میں
جابجا اپنے کناروں سے اُچھلتا ہوا میں

بیٹھنا ایک جگہ پر مری قسمت میں نہیں
آتا جاتا رہوں گا رنگ بدلتا ہوا میں

فیض چاہوں بھی تو پہنچا ہی کہاں سکتا ہوں
لبِ دریا کوئی چشمہ سا اُبلتا ہوا میں

بے اثر رہتا ہے بیٹھا کوئی موسم مجھ پر
اپنے ہی زہر سے ہوں پھولتا پھلتا ہوا میں

بھاگ کر جاتا ہوا اجنبیوں کی جانب
اور، اپنی طرف آتا ہوں ٹہلتا ہوا میں

کوئی پانی کا پتا مجھ کو بتا سکتا ہو
پُوچھتا پھرتا ہوں ایک ایک سے جلتا ہوا میں

اتنا باہر سے یہ مضبوط نظر آتا ہوا
اندر اندر ہوں شب و روز دہلتا ہوا میں

ایسے حالات میں اتنا بھی غنیمت سمجھو
کہ بُرا وقت ہوں اور شہر سے ٹلتا ہوا میں

اپنے ہی آپ میں ہر وقت مگن بھی ہوں، ظفر
اور، خُود سے کہیں باہر بھی نکلتا ہوا میں

☆

آخری ہوں کہ ترے گھاٹ پہ پہلا ہوا میں
جتنا دھویا گیا ہوں اتنا ہی میلا ہوا میں

سیر گاہوں کو عجب کیا ہے جو خاطر میں نہ لاؤں
تیرے باغات میں کچھ دیر کو ٹہلا ہوا میں

ڈالتا رہتا ہوں پھر تیری محبت اس میں
دوسری بار جو اپنے لیے تھیلا ہوا میں

یہ ترا خوف ہے یا اپنی ہی دہشت کوئی
سحر و شام جو رہتا ہوں یہ دہلا ہوا میں

عین ممکن ہے کروں شورِ فغاں پھر سے بُلند
رونقِ شہر میں تھوڑا سا یہ بہلا ہوا میں

احترام اور محبت میں نہیں فرق بہت
ہو کے بوڑھا تو یہاں اور بھی چھیلا ہوا میں

اس میں کیفیتیں دونوں ہیں یہ ناز اور نیاز
کبھی مجنوں ہوا ہوں اور کبھی لیلیٰ ہوا میں

صاف ستھرا نظر آؤں گا بظاہر تو، مگر
اندر اندر سے بہت میلا کچیلا ہوا میں

دیکھ کر خُود کو، ظفر، ہوتی ہے وحشت کیا کیا
بے مُحابا سا جو ہر سمت ہوں پھیلا ہوا میں

☆

پہلے ہی ٹھیک طرح سے ہوں ٹٹولا ہوا میں
گھٹتا بڑھتا نہیں اُس شوخ کا تولا ہوا میں

روشنی کرتا ہوا جا کے گروں گا بھی کہیں
خوش نہ ہوں لوگ اگر آگ کا گولا ہوا میں

چیر سکتا کبھی اس رات کے سناٹے کو
روشن آواز کی گہرائی سے بولا ہوا میں

کہیں اطراف و جوانب میں نہ ڈھونڈو مجھ کو
ان ہواؤں میں ہی موجود ہوں گھولا ہوا میں

سعی بے سود ہے ساری کہ یہ ممکن ہی نہیں
بند ہو جاؤں کسی اور کا کھولا ہوا میں

اس توقع پہ کہ تُو ہی مجھے کر دے گا بحال
تجھ تک آیا ہوں جو اس طرح مدھولا ہوا میں

ایک ہی وضع کا پابند نہیں ہو سکتا
اس لیے بھی کبھی ماشہ، کبھی تولا ہوا میں

مجھے تقسیم کیا اُس نے کئی ٹکڑوں میں
ایک سے چار ہوا، چار سے سولہ ہوا میں

وقت ایسا تو ہمیشہ نہیں رہنے کا، ظفر
کبھی قائم بھی تو ہو سکتا ہوں ڈولا ہوا میں

☆☆

یہ بھی کیا ہوں کسی جانب سے جھجکتا ہوا میں
اور اُسی لمحے کسی سمت لپکتا ہوا میں

کوئی اطراف کا اندازہ ہی رکھتا نہیں اب
اپنے ہی شہر کی گلیوں میں بھٹکتا ہوا میں

کبھی لیتا ہی نہیں شورشرابے کا اثر
خامشی کی کسی آہٹ پہ ٹھٹکتا ہوا میں

چور ہوں، اور، کبھی آنکھ چُرا کر خود سے
اپنے ہی خواب کی گٹھڑی کو اُچکتا ہوا میں

تیر کھایا تھا کسی اور طرف سے، لیکن
گر رہا ہوں ترے پہلو میں پھڑکتا ہوا میں

اور تھا رنگ تماشا مری خاطر، جس کو
دیکھنا چاہتا، اور، دیکھ نہ سکتا ہوا میں

بجھنے ہی والا ہوں چھوڑے ہوئے گھر میں آخر
در و دیوار سے بے سُود جھلکتا ہوا میں

خاک ہو جاؤں گا، احباب تسلی رکھیں
اور کچھ دیر اندھیرے میں چمکتا ہوا میں

کر رہا ہوں اُسے ظاہر جو چھپانا ہے، ظفر
جو دکھانا ہے سراسر اُسے ڈھکتا ہوا میں

☆☆

جیسے ہوں شہربدر شہر میں آیا ہوا میں
یاد آؤں گا کسی روز بُھلایا ہوا میں

کسی شیشے کی ملاوٹ بھی ہو جیسے مجھ میں
ٹوٹ سکتا ہوں کبھی اپنا بنایا ہوا میں

در و دیوار سے ہوتا ہے نمودار مجھے
اسی تعمیر کے اندر ہوں کھپایا ہوا میں

اتنے پردے ہیں مری ذات کے آگے پیچھے
کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہوں چھپایا ہوا میں

کھوج پھر بھی نہیں مِلتا ہے کسی کو میرا
لاپتا ہوں یہاں سو بار بتایا ہوا میں

میرے ہوتے ہوئے کچھ اور نظر آئے گا کیا
سامنے ہوں وہی آگے سے ہٹایا ہوا میں

اب جو دیکھا تو کوئی اور نکل آیا ہوں
کہ نہیں ہوں یہ وہ پہلے سے دکھایا ہوا میں

دن نکلتے ہی کسی اپنی کمی کے ہاتھوں
خرچ ہو جاؤں گا شب بھر کا بچایا ہوا میں

ایک جھونکے سے جل اُٹھوں گا دوبارہ سے، ظفر
رات کی بند ہواؤں کا بُجھایا ہوا میں

-☆-

کچھ روتے ہی تھے ایسے کہ فصیلا ہوا میں
بے سبب تو نہیں میٹھے سے کسیلا ہوا میں

یہ محبت ہی وہ کیچڑ تھا جو آخر آخر
ایک دن مُنھ پہ مَلا، اور، کچیلا ہوا میں

کہیں گرتی رہی شبنم سی مری شام سے دُور
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گیلا ہوا میں

دُور رہتا تھا بہُت اپنی اکڑ میں، لیکن
چُست چولی جو وہ دیکھی ہے تو ڈھیلا ہوا میں

دھیان رکھنا کہ اسی شورشرابے میں کہیں
تیرے قابو سے نکل جاؤں نہ کیلا ہوا میں

پہلے پہلے رہی مجھ میں بھی لہو کی رنگت
خاک سے رنگ جو پکڑا ہے تو پیلا ہوا میں

اپنے ٹکڑے جو کیا کرتا ہوں اب شام و سحر
کچھ پتا ہی نہ چلا، اور، کٹیلا ہوا میں

آسماں زہر کی صورت مرے اندر پھیلا
دھوپ کی لہر کچھ ایسی تھی کہ نیلا ہوا میں

چھال اُتری تو، ظفر، سوکھ بھی جاؤں شاید
تھوڑا اچھا تو نظر آؤں گا چھیلا ہوا میں

-☆-

وقت بے وقت کے ویلے سے کویلا ہوا میں
اور کا اور ہوں سو بار کا جھیلا ہوا میں

بے وفائی تری میرا ہی مقدر ٹھہری
تیرا دل جیتنے والا بھی اکیلا ہوا میں

جذب ہو جاؤں نہ مٹی میں ترے آنے تک
منتظر ہوں ترے رستے پہ اُنڈیلا ہوا میں

اپنی مرضی سے تو شاید نہ یہ ہمت کرتا
آ گھسا ہوں تری محفل میں دھکیلا ہوا میں

اتنے خوش خوش نہ پھرو مجھ سے لگا کر بازی
جیت بھی سکتا ہوں اس کھیل میں کھیلا ہوا میں

مجھے کافی ہے یہ ہونا ترے آگے پیچھے
تو گرو بھی نہیں لیکن ترا چیلا ہوا میں

اپنی ہی بستیاں غرقاب کیے بیٹھا ہوں
کس نئے خواب کے سیلاب کا ریلا ہوا میں

ایک حد تک ہے یہ آوارہ خرامی میری
جا بھی سکتا ہوں کہاں تیرا نکیلا ہوا میں

ایک ہی وقت میں غائب ہوں نہ موجود، ظفر
شہر والوں کے لیے ایک جھمیلا ہوا میں

☆

کس نئے خواب میں رہتا ہوں ڈبویا ہوا میں
ایک مدت ہوئی جاگا نہیں سویا ہوا میں

میری سورج سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے
سوکھنے ڈال دیا جاؤں جو دھویا ہوا میں

مجھے باہر نہیں، سامان کے اندر ڈھونڈو
حل بھی سکتا ہوں کسی شے میں سمویا ہوا میں

بازیابی کی توقع ہی کسی کو نہیں اب
اپنی دنیا میں ہوں اس طرح سے کھویا ہوا میں

شام کی آخری آہٹ پہ دہلتا ہوا دل
صبح کی پہلی ہواؤں میں بھگویا ہوا میں

آسماں پر کوئی کونپل سا نکل آؤں گا
سال ہا سال سے اس خاک میں بویا ہوا میں

کبھی چاہوں بھی تو اب جا بھی کہاں سکتا ہوں
اس طرح ترے کانٹے میں پرویا ہوا میں

میرے کہنے کے لیے بات نئی تھی نہ کوئی
کہہ کے چپ ہو گئے سب لوگ تو گویا ہوا میں

مسکراتے ہوئے ملتا ہوں کسی سے جو، ظفر
صاف پہچان لیا جاتا ہوں رویا ہوا میں

☆

راکھ ہوتا ہوا ، ہر لحظہ بگڑتا ہوا میں
رفتہ رفتہ یہ کوئی آگ پکڑتا ہوا میں

نہیں دیتا ہوں کسی طور ہوا کو زحمت
ایک پتا سا کہیں آپ ہی جھڑتا ہوا میں

پھر کسی کے لیے آغوش کشا ہوں شاید
اپنی کمزور سلائی سے اُدھڑتا ہوا میں

مجھ میں رہتی ہے جو ہر آن کمی بیشی سی
کہیں گھٹتا ہوا ہوں اور کہیں بڑھتا ہوا میں

یہ ہوا ہے جو ہمیشہ مرے کام آتی ہے
سوکھ جاؤں گا اسی طرح نچڑتا ہوا میں

کبھی ایسا تو لگا ہی نہیں پہلے شاید
جیسا لگتا ہوں ترے خواب میں جڑتا ہوا میں

ملنے آؤں گا اُنھیں پھر کسی موسم میں کبھی
جو پریشاں نہیں لوگوں سے بچھڑتا ہوا میں

روک دے کوئی اگر آ کے یہیں پر مجھ کو
پھیلتا جاتا ہوں کچھ اور ، سکڑتا ہوا میں

دیکھتے دیکھتے ہو جاتا ہوں قائم بھی ، ظفر
کسی اندر ہی کی آندھی سے اُکھڑتا ہوا میں

-☆-

ہوں وہ پہلا سا پرانا کہ نرالا ہوا میں
رفتہ رفتہ جو ترا چاہنے والا ہوا میں

تُو فقط ایک اشارے سے اُٹھائے مجھ کو
زندہ ہو جاؤں ترے سامنے ڈالا ہوا میں

مجھے باہر سے پذیرائی ملی ہے ، ورنہ
یہ وہی ہوں تری محفل سے نکالا ہوا میں

تجھ سے نسبت تو کوئی خاص نہیں تھی ، لیکن
اس بھرے شہر میں کیوں تیرا حوالہ ہوا میں

یہ کسی اور کے گھیرے میں نہ آیا تھا کبھی
پھر ہوا یوں کہ ترے چاند کا ہالہ ہوا میں

اپنی کوشش بھی مجھے چاہیے کرنی کوئی اب
گر بھی سکتا ہوں کہیں تیرا سنبھالا ہوا میں

کیفیت اور ہی کچھ ہے مرے اندر باہر
کہ اندھیرا ہی رہا اور نہ اُجالا ہوا میں

اکثر اوقات کناروں سے چھلک جاتا ہوں
زور کرتا ہوا ، اپنا ہی اُچھالا ہوا میں

ایک ہونا بھی مرے واسطے مشکل تھا ، ظفر
کون سے لوگ ہیں یہ جن میں دوبالا ہوا میں

-☆-

مُسترد ہو گیا جب تیرا قبولا ہُوا مَیں
یاد کیا آؤں گا اس طرح سے بھولا ہُوا مَیں

بات مجھ میں بھی کچھ اس طرح کی ہوگی جو یہاں
کبھی واپس ہی نہ ہوتا تھا وصولا ہُوا مَیں

خاک تھی اور ہوا تھی مرے اندر باہر
دشت اک سامنے تھا ، اور ، بگولا ہُوا مَیں

نہیں مرنے میں بھی درکار تعاون مجھ کو
چھت سے اپنی ہی نظر آؤں گا جُھولا ہُوا مَیں

وقت وہ تھا کہ خدوخال نُمایاں تھے مرے
اب یہ حالت ہے کہ بس ایک ہیُولیٰ ہُوا مَیں

یہ بھی سچ ہے کہ عمل مجھ پہ کسی نے نہ کیا
ورنہ کہنے کو تو مشہور مقولہ ہُوا مَیں

اک نحوست ہے مرے موسموں پر چھائی ہوئی
ہے یہی وجہ کہ پھلتا نہیں پھُولا ہُوا مَیں

پھر کسی سے بھی گرہ مجھ پہ لگائی نہ گئی
کوئی بے ڈھب ہی بہت مصرعِ اُولیٰ ہُوا مَیں

موت کے ساتھ ہوئی ہے مری شادی ، سو ظفرؔ
عُمر کے آخری لمحات میں دُولھا ہُوا مَیں

☆☆

جب تمھارے اور اپنے درمیاں ہوتا ہُوں مَیں
کون مجھ کو ڈھونڈ سکتا ہے کہاں ہوتا ہُوں مَیں

ٹکڑوں ٹکڑوں میں نکل پڑتا ہُوں منزل کی طرف
اور ، آخر رفتہ رفتہ کارواں ہوتا ہُوں مَیں

اک زمینِ عاجزی ہُوں اہلِ دُنیا کے لیے
اس سے ملتا ہُوں تو کچھ دن آسماں ہوتا ہُوں مَیں

اپنے ہی رحم و کرم پر ہُوں کوئی سمجھے اگر
برق سے رشتہ ہے میرا ، آشیاں ہوتا ہُوں مَیں

مخمصہ ہُوں اپنے ہونے اور نہ ہونے کا یہاں
کچھ وہاں بھی ہو نہیں سکتا جہاں ہوتا ہُوں مَیں

اک زمانے سے لیے پھرتا ہُوں لہروں پر اسے
کوئی کشتی ہے کہ جس کا بادباں ہوتا ہُوں مَیں

شوق سے سُنتے بھی ہیں ، تسلیم بھی کرتے نہیں
آنے والے دور کی اک داستاں ہوتا ہُوں مَیں

ڈھونڈنے والوں کی خاطر اک اشارہ ہی سہی
ہے یہی میری نشانی ، بے نشاں ہوتا ہُوں مَیں

میرے اندر ہے ستاروں کا کوئی جھرمٹ ، ظفرؔ
رات پڑتی ہے تو اپنی کہکشاں ہوتا ہُوں مَیں

☆☆

ترے راستوں سے جبھی گزر نہیں کر رہا
کہ میں اپنی عمر ابھی بسر نہیں کر رہا

کوئی بات ہے جو ہے درمیاں میں رُکی ہوئی
کوئی کام ہے جو میں رات بھر نہیں کر رہا

ہے کوئی خبر جو چھپائے بیٹھا ہوں خلق سے
کوئی خواب ہے جسے دربدر نہیں کر رہا

تری بات کوئی بھی مانتا نہیں شہر میں
تو مرا کہا بھی کہیں اثر نہیں کر رہا

کہیں میرے گردونواح میں کوئی شے نہیں
میں کسی طرف بھی ابھی نظر نہیں کر رہا

کوئی شاخ ہے جسے برگ و بار نہیں ملے
کوئی شام ہے جسے میں شجر نہیں کر رہا

کوئی اس پہ غور اگر کرے بھی تو کس لیے
یہ سخن میں آپ بھی سوچ کر نہیں کر رہا

ابھی میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی
میں جبھی تو بات کو مختصر نہیں کر رہا

یہ میں اپنے عیب جو کر رہا ہوں عیاں، ظفر
تو دراصل یہ بھی کوئی ہنر نہیں کر رہا

☆

کوئی چیز بھی میں یہاں وہاں نہیں کر رہا
جو زمین کو ابھی آسماں نہیں کر رہا

مری واردات سے باخبر ہیں کبھی کہ میں
کوئی کام بھی یہاں ناگہاں نہیں کر رہا

جو نہیں ہے اُس کا یقین ہے مجھے سربسر
جو ہے سامنے، میں اُسے گماں نہیں کر رہا

ترا دل کہ تیری ہی برق ناز کی زد میں ہے
میں اسی لیے اسے آشیاں نہیں کر رہا

میں وہاں بھی کام سے بھاگتا رہا رات دن
سو، بجا ہے، کچھ بھی اگر یہاں نہیں کر رہا

مری محنتوں کا معاوضہ مجھے چاہیے
کہ میں عشق بھی کوئی رائگاں نہیں کر رہا

مرا خواب زادِ سفر ہے جس کے مدار میں
کوئی ہے کہ میں جسے کارواں نہیں کر رہا

جو رواں ہے میں اُسے روکتا نہیں، اور پھر
جو رُکا ہوا ہے اُسے رواں نہیں کر رہا

مجھے خود کو غور سے دیکھنا ہے کبھی، ظفر
جو میں اپنا آپ دھواں دھواں نہیں کر رہا

☆

جو یہ تیرے بارے میں گفتگو نہیں کر رہا
یہ نہیں کہ میں تری آرزو نہیں کر رہا

میں بکھیر بیٹھا ہوں خود ہی اپنے وجود کو
مگر، آپ ہی اسے ایک سُو نہیں کر رہا

کوئی لہر ہے جو مری خبر نہیں لے رہی
کوئی لفظ ہے جسے میں لہو نہیں کر رہا

سو، گلے لگا کے ہی پاک ہو گیا ہوں اُسے
جو نماز کے لیے میں وضو نہیں کر رہا

فقط ایک بار تری گلی میں لگائی ہے
وہ صدا جو میں ابھی کُو بکُو نہیں کر رہا

کئی بار میں نے زمانے بھر کو سُنائی ہے
وہی بات جو ترے رُوبرُو نہیں کر رہا

کوئی انتظار ہے جس میں ڈوبا ہُوا ہوں میں
کوئی اعتبار ہے جس کو تُو نہیں کر رہا

مرے حال سے تجھے آشنائی ہو کس طرح
میں بیان ہی اسے ہُوبہو نہیں کر رہا

کہیں مل ہی جاؤں گا اپنے آپ کو اے، ظفر
میں اسی لیے کوئی جستجو نہیں کر رہا

☆

اس اندھیرے دل میں جو روشنی نہیں کر رہا
کروں گا ضرور، مگر، ابھی نہیں کر رہا

کسی طرح سے بھی یہ دشمنی تو نہیں کوئی
یہ جو تیرے ساتھ میں دوستی نہیں کر رہا

مرا کچھ نہ کرنا بھی خوب سوچ سمجھ کے ہے
کہ میں کوئی کام بھی سرسری نہیں کر رہا

مجھے پانو پڑنے سے اتفاق نہیں ابھی
مگر، اس طرح سے میں سرکشی نہیں کر رہا

جو ہمیشہ رہتا ہوں ایک اشارے کا منتظر
یہی کہہ رہا ہوں کہ نوکری نہیں کر رہا

وہی آسماں کو ملا رہا ہوں زمین سے
کہ یہ کام اور یہاں کوئی نہیں کر رہا

یہ خلاف طبع ہی کرتا رہتا ہوں رات دن
کہ جو کرنا چاہتا ہوں وُہی نہیں کر رہا

مجھے اتفاق ہے آپ سے کہ دراصل میں
یہ کچھ اور کرتا ہوں، شاعری نہیں کر رہا

مری عاجزی ہی بہت ہے میرے لیے، ظفر
میں یہاں کسی کی برابری نہیں کر رہا

☆

مرے گھر تو کیا سرِ رہگذر نہیں آ رہا
بڑی دیر سے کوئی بھی اِدھر نہیں آ رہا

میں اس انتظار کی اُلجھنوں سے نکل سکوں
وہ بتا تو دے کسی طور ، اگر نہیں آ رہا

وہی دُھوپ ہے مرے سر پہ چھاؤں کیے ہُوئے
مرے راستے میں کہیں شجر نہیں آ رہا

کوئی بوند ہے مری چشمِ تر میں رُکی ہُوئی
کوئی خواب ہے جو مجھے نظر نہیں آ رہا

تری آرزو میں کوئی کمی ہے ، اسی لیے
مری گفتگو میں ابھی اثر نہیں آ رہا

کئی روز سے مری دھڑکنیں ہیں رُکی ہُوئی
کئی روز سے کوئی بام پر نہیں آ رہا

کئی کام ہیں یونہی درمیاں میں پڑے ہُوئے
اُسے آنا چاہیے تھا ، مگر ، نہیں آ رہا

مجھے بھیجتے تو ہیں ، لیکن اپنے حساب سے
کہ جو آ رہا ہے وہ اس قدر نہیں آ رہا

جو ملے تو خُود ہی بتاؤ ، کیسے ملے ، ظفر
تُم اُدھر ہی جاؤ گے وہ جدھر نہیں آ رہا

-☆-

کچھ کام اس زمین پہ کرنے تو دے مجھے
اپنی بلندیوں سے اُترنے تو دے مجھے

جاتا نہیں ہے جانبِ منزل تو کیا ہُوا
تُو اپنے راستے سے گذرنے تو دے مجھے

یہ خُوب صُورتی کسی دہشت سے کم نہیں
کچھ روز دُور دُور سے ڈرنے تو دے مجھے

اپنی جگہ پہ ایک رُکاوٹ ہُوں آپ بھی
دیوار دوستی ہُوں ، اُسرنے تو دے مجھے

جینا یہ میرا تیرے لیے تھا بھلا بُرا
تُجھ کو جو ناپسند ہے ، مرنے تو دے مجھے

کیا کیا سمندروں کا سفر کر کے آیا ہُوں
اس خاک پر قدم کہیں دھرنے تو دے مجھے

کہتے ہیں لوگ ، مَیں کسی خُوشبو کا خواب ہُوں
کچھ دیر اس ہوا میں بکھرنے تو دے مجھے

پانی کی تہہ جو اب مجھے کرتی نہیں قبول
مَیں ڈوب ہی چکا ہُوں ، اُبھرنے تو دے مجھے

دریا بھی مہربان ہے ، موقع بھی ہے ، ظفر
خالی ہُوں ایک عُمر سے ، بھرنے تو دے مجھے

-☆-

مکان پھر مُتلاشی ہُوئے مکینوں کے
چلے گئے ہیں کہیں سانپ آستینوں کے

کبھی بھی چین سے دم بھر کو بیٹھنے نہ دیا
ہمیشہ ساتھ رہے آسماں زمینوں کے

وہ کوئی اور بھی تھا میرے اور تُمھارے سوا
کیے گئے ہیں یہاں انتظام تینوں کے

شکستگی کے علاوہ بھی تھے تقاضے کچھ
دلوں سے بڑھ کے بھی نازک ان آبگینوں کے

ہمیں بھی کچھ ادب آداب سے نہ تھی رغبت
زیادہ آپ بھی قائل نہ تھے قرینوں کے

نجانے کون سی جلدی میں تھے کہ اُس دوران
دنوں میں کام نمٹتے رہے مہینوں کے

عجب تو یہ ہے کہ اس بے قرار پانی پر
نشان ہیں ابھی ڈوبے ہُوئے سفینوں کے

چھپا سکے ہی نہیں اہلِ دہر سے کچھ بھی
کہ جتنے راز تھے باہر تھے اپنے سینوں کے

رُکا ہُوا ہے یہاں سارا کاروبار ، ظفرؔ
خراب رہتے ہیں پُرزے مری مشینوں کے

☆

تُمھارے ہو گئے ہیں اور ہمارے ہو گئے ہیں
یہاں جو کام تھے سارے کے سارے ہو گئے ہیں

کبھی یک بارگی بھی ہو نہیں پائے تھے جو کام
وہی ہونے پہ آئے تو دوبارے ہو گئے ہیں

فقط اک ریت کی تصویر باقی رہ گئی ہے
کہ سب دریاؤں کے پانی کنارے ہو گئے ہیں

بچی ہے اہلِ ساحل کے لیے جھلمل ذرا سی
اگر اپنے سفینے بھی ہمارے ہو گئے ہیں

کسی کی دستگیری کا اثر ایسا ہُوا ہے
کہ پہلے سے زیادہ ہم بچارے ہو گئے ہیں

لرزتا ہے مرے اندر خسِ خوابِ محبت
کہ میری شام کے ٹکڑے شرارے ہو گئے ہیں

سہولت سے تمھارا وقت جیسا کٹ گیا ہے
اسی صُورت ہمارے بھی گزارے ہو گئے ہیں

بھلا بیٹھے ہیں پہلے والا برتاؤ تُمھارا
سو ، ہم اک بار شاید پھر تُمھارے ہو گئے ہیں

ظفرؔ خود پر بھلا کرتے یہاں کب تک بھروسا
کہ ہمت ہار دی ہے ، بے سہارے ہو گئے ہیں

☆

منکر ہے آج کل جو سلام و کلام سے
منسوب کر رہا ہوں کتاب اُس کے نام سے

دن ڈوبنے کا یہ جو مجھے انتظار ہے
کچھ کام ہے تمھارے علاوہ بھی شام سے

کچھ سوجھتا نہیں ہے ، اندھیرا ہے اس قدر
ایسے میں کوئی چاند ہی چمکاؤ بام سے

دل پھڑپھڑانے لگتا ہے کیوں جانے ایک دم
ویسے تو پھر رہا ہوں ذرا دُور دام سے

میری ضرورّیات بھی کچھ اور ہو گئیں
کچھ مطمئن نہیں ہوں ترے انتظام سے

ہم نے رکھا تھا یاد شرارت سے بیش و کم
اُس نے بھلا دیا ہے بڑے احترام سے

اک خاص بات ہے جو کسی اور میں نہیں
ویسے تو آدمی نظر آتے ہو عام سے

مصروفِ کار تو وہاں رہتے ہو رات دن
آجاؤ اس طرف بھی کسی روز کام سے

اُونچی نکل گئی تھی عمارت بہت ، ظفرؔ
میں بچ نہیں سکا ہوں تبھی انہدام سے

عرضِ ناشر

برق رفتار مقناطیسی لہروں کے بل انٹرنیٹ کے ذریعے پل پل جڑتے بکھرتے اس عالمگیر گاؤں میں ظفر اقبال بخوبی آگاہ ہیں کہ اُردو شاعری کا فیشن تبدیل ہو چکا ہے۔ کلاسیکی دور کی طرح شاعری اب نہیں کی جا سکتی، بلکہ تقسیم کے وقت کا محاورہ بھی متروک ہو چکا ہے۔ جدید تر اور مابعد جدیدیت سے مملو طرزِ احساس کا دور رواں دواں ہے۔ اسی لیے ظفر اقبال نے ہر طرح کا شعر کہہ رکھا ہے، لہٰذا اُن کا محاکمہ کسی ایک طرح سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس شاعری کی کئی آوازیں ہیں، اُن کے معاصر اور آیندہ ناقدین کو ہر بار نئے سرے سے اُن کے شاہ کاروں کو آنکنا اور ہر آواز کا الگ سے محاکمہ کرنا پڑے گا۔ ظفر اقبال کی تمام تر تلازماتی، علاماتی، استعاراتی، تجریدی، لایعنی، مابعد جدید اور ماورائے حقیقت شعری دریافت اس امر پر دال ہے کہ دراصل حسیاتی انعکاس سے حاصل کیا گیا سوچ ہی حقیقت کو منعکس کرتا ہے۔

پرت در پرت، جہت در جہت افقی و عمودی طریق پر ہزار ہا تصوّرات کے اُن تھک تخلیقی عمل کے دوران میں ظفر اقبال بنیادی طور پر سمجھے جانے کے قائل نہیں کہ اُن کے تئیں شاعری صرف لطف اندوز ہونے کی چیز ہے، مزہ لینے کا مواد ہے، کائنات کے راز معلوم کرنے کا سائنسی، میکانکی اور تکنیکی آلہ نہیں، نہ ہی اُن کا قاری خدا اور انسان کے رشتے کے سربستہ اسرار معلوم کرنے کے لیے شاعری پڑھتا ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس شاعری دُوسروں سے مختلف ہونی چاہیے، شعر میں تازگی، تاثیر ہونی چاہیے۔ اس حد تک کہ بے شک اوٹ پٹانگ شاعری ہو مگر دُوسروں سے مختلف ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعری اگر دُوسروں جیسی کرنی ہو تو کوئی اور مفید کام کر لیں، یہ کسی دیگر اہل شاعر کو کرنے دیں۔ بے طرح اس تخلیقی رویے کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ مختلف سماجی طبقات بدلتی ہوئی حقیقت کے پیش نظر دنیا کے تبدیل ہوتے ہوئے اپج سے مطابقت پیدا کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں ظفر اقبال نے اُن تغیر آشنا ذہنی ساختوں کی صورت گری کرتے ہوئے انھیں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے جس سے ہر زمانے اور ہر نسل کے قارئین اپنے اپنے تئیں محظوظ ہوتے رہیں گے۔

ظفر اقبال کے باطنی اور ظاہری دوستوں کا سب سے بڑا اصرار ہے کہ یہ اُن جیسی شاعری کیوں نہیں کرتے؟ ہر مرتبہ جواباً وہ کہتے ہیں کہ پھر مجھے کیا ضرورت ہے، تمھی کرتے رہو۔ صنفِ شاعری کی ہیئت کے ضمن میں اُن کا موقف ہے کہ عشق اور محبت غزل کا اساسی موضوع ہے، اگرچہ اس سے اِدھر اُدھر بھی ہوا جا سکتا ہے اور بیش تر شعرا ہوتے بھی ہیں۔ روایت میں ردّ و بدل، نئی تشکیلات یا انحراف کے طریق پر ہی گھسے پٹے یا مروّج مضامین اور

موضوعات کو ایک نئی جہت دے کر تازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہر حال یہ تخلیق کار کی توفیق پر منحصر ہے۔ ظفر اقبال کا کہنا ہے کہ شاعری بل کہ ادب کا کماحقہٗ ترکیبی عمل دراصل تشکیلِ نو ہے۔ ہم کسی بنی بنائی چیز کو نئی شکل دیتے ہیں، یہ سب پہلے ہو چکا ہے، ہم اپنے حساب سے وضاحت کر کے ہر مرتبہ از سرِ نو ایک بار پھر سے لگ بھگ وہی کرتے ہیں، جو ہمارے پیش رو کرتے رہے، فقط ایک تسلسل اور ارتقا جاری و ساری ہے۔ ظفر اقبال کی شاعری سے ہو بہ ہو مخاطرہ نقالی اور ماخوذ شاعری کے تو ماہ لگے ہیں۔ چیزوں کو دہرانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ حضرت علیؓ کے بقول جو باتیں اب تک کی گئی ہیں اگر انھیں دہرایا نہ جاتا تو وہ کب کی ختم ہو گئی ہوتیں۔ لیکن ظفر اقبال کے تناظر میں تخیل، موضوع یا معروض کو دہرانے کا مطلب کبھی چربہ مارنا نہیں، اس میں شاعر کو جس قدر ہو سکے اپنا آپ بھی شامل کرنا پڑتا ہے۔

ظفر اقبال کا ادبی نظریہ ہے کہ شاعری میں کھلا پن ہونا چاہیے، زبان میں بے تکلفی ہونی چاہیے۔ اس کی عملی تشکیل و تجسیم ظفر اقبال نے ممکن کر دکھائی ہے اور ان کے بعد آنے والوں کو خاصی سہولت بھی اس سے میسر ہوئی ہے، کیوں کہ کئی شاعروں یا نوآموز شعرا کو اکثر بہ سہولت ایک جعلی یا اصلی سند مل جاتی ہے کہ ظفر اقبال نے ایسا کر لیا تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ اسی لیے نذیر قیصر نے کہا کہ ظفر اقبال نے اپنے بعد آنے والوں کو متاثر بھی سب سے زیادہ کیا اور گمراہ بھی۔ تاہم ظفر اقبال از خود یہی سمجھتے ہیں کہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کی نسبت گمراہ ہونا اور بھٹک جانا زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ اسی گمراہی میں سے نیا راستہ نکلتا ہے۔ ہمیں اس امر پر بھی صاد کرنا چاہیے کہ زبان کے ذریعے پیدا کردہ حقیقت نگاری اس دنیا کا عکس پیش کرتی ہے، اسے تکرار بامعنی نہیں کہا جا سکتا۔

ظفر اقبال از خود ایک انشراح مثال بنے ہوئے ہیں کہ شاعر میں خود ستائی کے بجائے انکسار ہونا چاہیے، بل کہ خود تنقیدی بھی ہونی چاہیے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ سیلف پروموشن/ایڈورٹائزیشن کا زمانہ ہے، اسی لیے ان کی شاعری میں تعلّی کا کوئی شعر شاید ہی دستیاب ہوتا ہو، ورنہ اکثر یار لوگ اپنا ہی باجا بجاتے اور پیا کوٹتے رہتے ہیں کہ میں یہ ہوں میں وہ ہوں۔ مگر اس کے بالعکس ظفر اقبال تو یہ کہتے ہیں: "میں تو کچھ بھی نہیں ہوں حتیٰ کہ اپنے شاعر ہونے سے ہی منکر ہوں"۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے بعض ہمعصر خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں، میں تو اپنے آپ کو شاعر ہی نہیں سمجھتا اور یہ کہتا ہوں کہ میں تو اس کوچے میں محض سیر سپاٹا کرنے آیا ہوں"۔ حال آں کہ وہ مصاحبوں میں اُٹھائے جانے والے فرسودہ سوالات سے اوب چکے ہیں، ایک انٹرویوئر نے پسند کا شعر سنانے کا کہا تو ان کا جواب تھا کہ میں نے آج تک کوئی پسندیدہ شعر کہا ہی نہیں، اور اپنا شعر سنایا کہ

میں بھاگتا پھرتا ہوں بے سود تعاقب میں
یہ شعر کی تتلی ہے جو ہاتھ نہیں آتی

یہ امر مسلّمہ ہے کہ ظفر اقبال کا سارا کام شعری کی جستجو کا سفر ہے۔ کسرِ نفسی کے باعث خود سمجھتے ہیں کہ وہ ابھی تک کہیں بھی نہیں پہنچے۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ زبان اور شعر کے امکانات پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں اور لفظ کے مختلف معنوی امکانات کو ابھارا ہے۔ وہ کسی مخصوص نظریے کے پیشِ نظر شعر نہیں کہتے، کیوں کہ نظریے کی شاعری میں نظریہ تو موجود ہوتا ہے شاعری نہیں۔ البتہ ہر تخلیق پارے کے مانند ظفر اقبال کی شاعری میں سے کسی نہ کسی نظریے کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔

بے شک اظہارِ زبان معروضی حقیقت کے وجود کی شکل ہے۔ ظفر اقبال کا مطمحِ نظر ہے کہ شاعری میں براہِ راست بات نہیں کرنی چاہیے اور براہِ راست اظہار بھی نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ شاعر کچھ بات کرتا ہے اور کچھ چھپاتا ہے، بل کہ اسے تھوڑی بات کرنی چاہیے اور زیادہ چھپانی چاہیے۔ انھیں یقین ہے کہ شعر کو سب سے زیادہ نقصان مُشکل اظہار نے پہنچایا۔ شعر میں ابہام کے بغیر گہرائی پیدا نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ شعر کی تفہیم میں قاری کا بھی حصہ ہوتا ہے، اور خود اس کے اندر جو شاعری ہوتی ہے اسے وہ شعر کے ساتھ ملا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس لیے شعر کے اظہار میں قاری کی فکری اور کیفیاتی شمولیت کے لیے بھی کچھ نہ کچھ چھوڑ دینا چاہیے۔ چند پیشہ ور ناقدین کا کہنا ہے کہ ظفر اقبال نے تجریدی اور بے معنی شعر بھی کہے ہیں لیکن کوئی شعر بے معنی نہیں ہوتا کہ بظاہر بے معنی سے بے معنی شعر میں بھی کوئی معنی ہوتے ہیں، کیوں کہ کوئی بھی لفظ جب آتا ہے معنی اپنے ساتھ لاتا ہے، حتیٰ کہ لفظ کو توڑنے پھوڑنے کے بعد بھی اس میں معنی باقی رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ تبدیل بھی ہو چکے ہوں۔ لفظوں کی ان کڑیوں سے متعلق سوسیئر نے کہا تھا کہ جو الفاظ ایک تصور کے لیے مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں، اگر یہ الفاظ ماقبل موجود تصورات کے لیے قائم ہوتے تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کے معنی متبادل پائے جاتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف سامعین اور زبانیں دنیا کی چیزوں کو مختلف زاویوں سے اور الگ سطحوں پر پیش اور ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ظفر اقبال لفظ کو اس کے غیر معمولی سیاق و سباق میں استعمال کرنے کے قائل ہیں کیوں کہ لفظ عام سیاق و سباق میں استعمال کرنے سے وہی معنی دے گا، جو اس کے روایتی معنی ہیں۔ اس لیے لفظ کو اُلٹ پلٹ کر بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کے اندر کون کون سے راز چھپے ہوئے ہیں۔ ظفر اقبال کی زبان میں لفظ اور شے کے درمیان ایک مربوط رابطہ ہے، وہ اپنے شعر کے لسانیاتی نظام کے طور پر متنوع مقاصد کے لیے طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں، یوں وہ حیران کن طریق پر زبان کی کثیر المعنویت کو زیرِ دام لائے ہیں۔

گمراں وسائل کے باوصف "اب تک" کی جلد چہارم زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے، اور اب ظفر اقبال کے کلیات کی جلد پنجم زیرِ طبع ہے اور تنقیدی مضامین کے کلیات "لاتنقید" (حالانثر مابشتو) کی جلد اول بھی منصۂ شہود پر آنے کو ہے۔ عالمی ادب شاہد ہے کہ لسانیات کا ترکیبی عمل بھی عمرانیات جتنا ہی قدیم ہے، نہ صرف زبان یوں ہی وجود پذیر ہوئی، بل کہ اس کی توسیع بھی اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال امیر خسرو نے قائم کی "زحالِ مسکیں مکن تغافل"۔ "گلافتاب" کی وجہِ شاعری ظفر اقبال کا یہی نقطۂ نظر تھا، مختلف زبانیں ایک دوسرے سے مل کر مزید توانا ہوں کہ لسانی تال میل ازل الخلق سے ہی ارتقا پذیر ہے۔ جلد چہارم کا دوسرا مجموعہ "تحلیل" پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور کشمیری زبانوں کی روائف پر مبنی غزلیات اور لفظیات کا حامل ہے۔ گو اردو زبان معرضِ وجود میں ہی اسی لیے آئی تھی کہ یہ ہر خطے کے باسیوں کو شیر و شکر کر دے، لیکن ظفر اقبال نے قومی اور ملکی سطح پر علاقائی زبانوں اور لوگوں کو صوبائی سطح پر ایک دوسرے کے قریب لانے اور مافی الضمیر جاننے کے لائق بنانے کا جتن کیا ہے۔ پاکستان کے پانچ صوبوں اور کشمیر کے باسی ایک دوسرے کی بولی سے ناواقف ہیں، البذا اردو ہی ان ہموطنوں

کے روزمرہ اور ثقافتی روایات کو مؤثر اور مستحکم بنا سکتی ہے۔ اس لیے اس شاعری کی اکادمیانہ حیثیت فزوں تر ہے۔ جلد چہارم کا پانچواں مجموعہ ''ترکیب'' جہاں اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کی تمام غزلیات کے ردائف گجراتی زبان پر مشتمل ہیں، وہاں اسے بھارتی نژاد امریکی شاعر و مصور مرحوم و مغفور عادل منصوری نے گجراتی رسم الخط میں امریکا سے شائع کیا تھا۔ میں نے اس کتاب کا ٹائٹل، بیک ٹائٹل اور دیباچہ بھی گجراتی میں ہی شاملِ اشاعت کیا ہے کہ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی مادری زبان گجراتی ہی تھی۔

بلاشبہ ظفر اقبال کی لسانی تشکیلات سے پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں سے نہ صرف اردو غزل کے روابط مستحکم ہوئے ہیں، بل کہ اردو شاعری متعاصر معنوی تشکیلات کے زیور سے بھی مزید آراستہ ہوئی ہے۔ مختلف زبانوں کے صحت مندانہ انضمام و ادغام کا تسلسل ظفر اقبال کی مستحکم کردہ روایت کے ذریعے، یقینِ محکم ہے کہ جاری و ساری رہے گا، کہ اس طریق پر مختلف علاقائی اور لسانی ذائقے، اسالیب اور موڈز جدت آمیزی اختیار کرتے، پنپتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

کم از کم دو اعتبار سے ضرور یہ عام المسرت ہے کہ اس برس 27 ستمبر 2012ء کو ظفر اقبال کی عمر 80 برس کو پہنچی، اور ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آبِ رواں'' کی اشاعت کو بھی پچاس برس پورے ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنا ملک بنتے ہوئے، بل کہ ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ 1960ء میں اُن کی شادی ہوئی اور پھر 2 نومبر 2009ء کو انھوں نے اپنی زوجۂ محترمہ سے جدائی کا صدمہ سہا۔

ظفر اقبال جیسے افراد ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہیں، اسی تسلسل میں وہ ہمارے عہد میں نہ صرف وارد ہوئے، بل کہ لسان العصر ٹھہرے۔ جس طرح تصوف میں ہر زمانے یا علاقے کی ولایت ہوتی ہے، یا پھر بودھ مت میں دلائی لامہ۔ ہر شعبہ ہائے زندگی میں ایک مخصوص غیبی نظام کے نتیجے میں اپنے منصب سے عہدہ برآ ہونے والے رجالِ رجائیت کی خود کار طریق پر تعیناتی ہو جاتی ہے، بعینہٖ تخلیقی فن اپنے تدریجی عمل کے دوران میں اپنے سربرآوردہ فن کار کا از خود بندوبست رکھتا ہے۔ اردو دنیا کے عہدِ موجود میں ظفر اقبال بھی اسی نوع، مقام اور منصب کی لاثانی اور لافانی شخصیت ہیں۔ گو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک بڑے فن کار کے لیے بہت اچھے کردار کا حامل ہونا قطعی اضافی خوبی یا غیر ضروری ہے، کیوں کہ نیکی اور اوصافِ حمیدہ کے بل پر تخلیقی تاریخ کی جنت میں کوئی گوشہ کسی کے لیے مخصوص نہیں ہو سکتا، تاہم یہ درجۂ کاملہ بلا تمیزِ نیک و بد فقط اعلیٰ و انفرادی تخلیقی ہنر، صلاحیت اور وصف رکھنے والے کے نصیب میں ہی ہو سکتا ہے۔ شاید ظفر اقبال اس اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت کے حامل ہیں کہ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی نہایت ادبی، اخلاقی اور دیانت دارانہ طبع کے مالک ہیں، ورنہ گذشتہ ادوار کی طرح عہدِ حاضر میں بھی دیگر شعبہ ہائے زندگی کے مانند ہمارے درمیان ادیبوں اور فن کاروں کی اکثریت جلبِ زر، وقتی مفادات اور تعصباتی کینگیوں کا شکار ہے اور کسی کی حق تلفی بھی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کر کے اس کا جواز مہیا کرنے کی خاطر یہ بھی کہہ دیتے ہیں، ''یار! بس بچوں کی خاطر کرنا پڑتا ہے''۔ حتیٰ کہ بے اولاد فن کار بھی ایسے طامع عیال داروں سے قطعی مماثل پائے جاتے ہیں۔ دراصل کسی بھی عام آدمی کے مثل کسی فن کار کی شخصیت میں عالی ظرفی اور اعلیٰ انسانی

اقدار کی موجودگی ایک فضیلت بل کہ نعمتِ غیر مترقبہ کے مترادف ہے۔ میرے ذاتی تعلق کے تجربے کا جائزہ یہ ہے کہ ظفر اقبال نہایت وضع دار، ملن سار، متواضع، شائستہ، نفیس اور ظریفانہ خصلت رکھتے ہیں۔ میرا اور اُن کا ذاتی تعلق جو ایک باپ اور بیٹے کا بھی ہے، ایک چھوٹے اور بڑے کا بھی، ایک ادیب اور قاری کا بھی، اور ایک مصنف اور ناشر کا بھی، گذشتہ پندرہ برس پر محیط ہے۔ اس دوران میں ہمارے حالات میں کئی بار اور کئی طرح کا نزاع در آیا، مگر ہمارے تعلق میں ذرا سا بگاڑ نہیں ہو سکا۔ کسی بھی صورتِ حالات میں اعتبار و یقین کی فضا آلودگی کا شکار نہ ہو سکی، اعتماد کے آبگینے کو ہلکی سی ٹھیس تک نہ پہنچی۔ اس تناظر میں ظفر اقبال کی شرافت اور شگفتگی قابلِ مثال اور نمونۂ تقلید ہے۔ میں نے کئی بحرانوں اور نقصانوں میں (جن میں اُن کی زوجہ محترمہ کے انتقال کا سانحہ بھی شامل ہے) اُن کی قوتِ برداشت، صبر، تحمل اور استقلال کو بھی لائقِ استحسان پایا ہے۔ ظفر اقبال کی سوانح اور زندگی کے حالات و واقعات کا بیان کئی دفتر بھر دے، اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ وہ من حیث المجموع واقعی فرشتہ سیرت ہیں۔

''انگارے'' نے اب تک جامع ترین ''ظفر اقبال نمبر'' شائع کر دیا۔ غالباً دنیا بھر سے شائع ہونے والے ادبی جرائد میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جس نے ''ظفر اقبال نمبر'' طبع نہ کیا ہو، کم از کم ''خصوصی گوشہ'' تو ضرور چھاپ چکا ہے، اور متواتر تین یا زائد غزلیات باقاعدگی سے شامل ہوتی ہیں۔ ظفر اقبال کے اپنے لکھے ہوئے کالم اور مضامین روزانہ اور آئے روز اخبارات و رسائل کی زینت میں اضافے کا موجب ہیں۔ اُن کے انٹرویوز کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی کارِ آساں نہیں۔ ریکارڈ مرتب کرنے کی خاطر ایک مکمل ادارہ قائم کیا جانا ازبس ضروری ہے۔ جو ادب فیس بک کے چوراہے پر شب و روز منہ کالا کرتے ہیں، بخوبی آگاہ ہیں کہ شاعری کا سب سے مقبول و ہنگامہ خیز موضوع ہی ''ظفر اقبال'' ہے۔ ادبی مراکز میں دو ہی معروف دبستان ہیں: ایک شیعانِ ظفر اقبال، دوسرا کفارِ ظفر اقبال۔ حتیٰ کہ جو فقط شاعر بہ زعمِ خود سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں، وہ بھی اپنی منافقت اور مخاصمت کے باوصف ظفر اقبال سے ہی اپنے بارے میں رائے بہ ہر صورت حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ 2011ء میں بھارتی نژاد معروف شاعر شہریار اور مہتاب حیدر نقوی نے بہ عنوان ''بکھرنے کے نام پر'' ظفر اقبال کی غزلیات کا انتخاب دیوناگری رسم الخط میں بھارت سے شائع کیا، یوں میر تقی میر کے انتخابوں کی طرح ظفر اقبال کی شاعری کے انتخاب پر مبنی مجموعے مرتب کرنے کا چلن سرعت سے عام ہو رہا ہے۔ یعنی عمر اور تخلیق کے تناظر میں ظفر اقبال نے گذشتہ نصف صدی کے دوران میں ہی جیتے جی وہ بھی کچھ پا لیا ہے، کہ جس کے بارے اُن کا موقف تھا کہ اُن کے مقام کا حقیقی تعین اُن کے بعد اگلے پچاس برس میں ہوگا۔ اسے کرامت قرار دیجیے یا استدراج، کرشمہ کہیے یا ثمرِ محنت، یہ ادبی مؤرخ کے عقیدے پر موقوف ہے...... میں نے کلیاتِ ظفر اقبال کی تین جلدیں شائع کرنے کی بابت 2004ء کے آغاز میں جو ارادہ یا دعویٰ کیا تھا، اپنے غیر یقینی وسائل کے باوصف اُس سے زیادہ کر دکھایا ہے، حال آں کہ اس کا سہرا بھی غیر متنازع نابغۂ روزگار، ملک الشعرا ظفر اقبال کے تخلیقی وفور کے سر ہے۔

اظہر غوری

اقدار کی موجودگی ایک غنیمت بل کہ نعمت غیر مترقبہ کے مترادف ہے۔ میرے ذاتی تعلق کے تجربے کا جائزہ یہ ہے کہ ظفر اقبال نہایت وضع دار، ملن سار، متواضع، شائستہ، نفیس اور ظریفانہ خصلت رکھتے ہیں۔ میرا اور اُن کا ذاتی تعلق جو ایک باپ اور بیٹے کا بھی ہے، ایک چھوٹے اور بڑے کا بھی، ایک ادیب اور قاری کا بھی، اور ایک مصنف اور ناشر کا بھی، گزشتہ پندرہ برس پر محیط ہے۔ اس دوران میں ہمارے حالات میں کئی بار اور کئی طرح کا نزاع در آیا، مگر ہمارے تعلق میں ذرا سا بگاڑ نہیں ہو سکا۔ کسی بھی صورت حالات میں اعتبار و یقین کی فضا آلودگی کا شکار نہ ہو سکی، اعتماد کے آبگینے کو ہلکی سی ٹھیس تک نہ پہنچی۔ اس تناظر میں ظفر اقبال کی شرافت اور شگفتگی قابلِ مثال اور نمونہ تقلید ہے۔ میں نے کئی بحرانوں اور نقصانوں میں (جن میں اُن کی زوجہ محترمہ کے انتقال کا سانحہ بھی شامل ہے) اُن کی قوتِ برداشت، صبر، تحمل اور استقلال کو بھی لائقِ احسان پایا ہے۔ ظفر اقبال کی سوانح اور زندگی کے حالات و واقعات کا بیان کئی دفتر بھر دے، اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ وہ من حیث المجموع واقعی فرشتہ سیرت ہیں۔

''انگارے'' نے اب تک جامع ترین ''ظفر اقبال نمبر'' شائع کر دیا۔ غالباً دنیا بھر سے شائع ہونے والے ادبی جرائد میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جس نے ''ظفر اقبال نمبر'' طبع نہ کیا ہو، کم از کم ''خصوصی گوشہ'' تو ضرور چھپ چکا ہے، اور متواتر میں یا زائد غزلیات باقاعدگی سے شامل ہوتی ہیں۔ ظفر اقبال کے اپنے لکھے ہوئے کالم اور مضامین روزانہ اور آئے روز اخبارات و رسائل کی زینت میں اضافے کا موجب ہیں۔ اُن کے انٹرویوز کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی کارِ آساں نہیں۔ ریکارڈ مرتب کرنے کی خاطر ایک مکمل ادارہ قائم کیا جانا ازبس ضروری ہے۔ جو ادیب فیس بک کے چوراہے پر شب و روز مٹر گشت کیا کرتے ہیں، بخوبی آگاہ ہیں کہ شاعری کا سب سے مقبول و ہنگامہ خیز موضوع ہی ''ظفر اقبال'' ہے۔ ہمیں ادبی مراکز میں دو ہی معروف دبستان ہیں: ایک حیعان ظفر اقبال، دوسرا: کفارِ ظفر اقبال۔ حتیٰ کہ جو قتشاعر بہ زعم خود سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں، وہ بھی اپنی منافقت اور مخاصمت کے باوصف ظفر اقبال سے ہی اپنے بارے میں رائے بہر صورت حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ 2011ء میں بھارتی نژاد معروف شاعر شہریار اور مہتاب حیدر نقوی نے بہ عنوان ''بکھرنے کے نام پر'' ظفر اقبال کی غزلیات کا انتخاب دیوناگری رسم الخط میں بھارت سے شائع کیا۔ یوں میر تقی میر کے انتخابوں کی طرح ظفر اقبال کی شاعری کے انتخاب پر مبنی مجموعے مرتب کرنے کا چلن سرعت سے عام ہو رہا ہے۔ یعنی عمر اور تخلیق کے تناظر میں ظفر اقبال نے گزشتہ نصف صدی کے دوران میں ہی جیتے جی وہ سبھی کچھ پا لیا ہے، کہ جس کے بارے اُن کا موقف تھا کہ اُن کے مقام کا حقیقی تعین اُن کے بعد اگلے پچاس برس میں ہوگا۔ اسے کرامت قرار دیجیے یا استدراج، کرشمہ کہیے یا ثمرِ محنت، یہ ادبی مؤرخ کے عقیدے پر موقوف ہے..... میں نے کلیاتِ ظفر اقبال کی تین جلدیں شائع کرنے کی بابت 2004ء کے آغاز میں جو ارادہ یا دعویٰ کیا تھا، اپنے غیر یقینی وسائل کے باوصف اُس سے زیادہ کر دکھایا ہے، حالاں کہ اس کا سہرا بھی غیر متنازع نابغۂ روزگار، ملک الشعرا ظفر اقبال کے تخلیقی وفور کے سر ہے۔

اظہر غوری

میں شاعر ہوں نہ نقاد، صرف شعر کا قاری ہوں۔ اس لیے تقید کرتا ہوں کہ میں یہاں جو کچھ بھی کہوں گا قارئین اُسے میرے انتہائی حدود علم کی علامت سمجھ کر درگزر کریں گے۔

ظفر اقبال کی شاعری کو پہلی بار پڑھتے ہوئے میں چونک اٹھا کہ یہ کیسی شاعری ہے جو اس سے قبل نظر سے نہیں گزری۔ پھر پڑھتے پڑھتے یہ انکشاف ہوا کہ شاعری کے مجموعی جسم کے بیچ ظفر اقبال نے ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ یہ گویا ان کا اتفاقی نوٹ تھا کہ یہاں سے جدید شاعری شروع ہوتی ہے۔

جس طرح میرے پسندیدہ جدید انگریزی شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے روزمرہ کی اشیا، مثلاً چائے پانی اور توسٹ وغیرہ کو، اور دوسری زبانوں کے جدید شعرا نے بھی ایسی ہی چیزوں کو شاعری میں سمویا ہے، اسی طرح ظفر اقبال نے پھلوں اور سبزیوں تک نے زمینی حقائق کو شاعری کا جزو بنایا ہے۔

مگر ظفر اقبال کی شاعری کا منفرد ترین عنصر اُن کی زبان ہے۔ میرا ہمیشہ سے اعتقاد رہا ہے کہ نظم ہو یا نثر، اُس کی زبان محض جذبات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بل کہ بہ ذاتِ خود ایک مکمل کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظفر اقبال نے ایک نئی زبان ایجاد کی ہے، جس سے اردو زبان کو توانائی حاصل ہوئی ہے۔

میرے سامنے اس وقت جو اوراق ہیں وہ ان کی غزلوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ایک ہی قافیہ، ردیف اور بحر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں سینکڑوں اشعار اور سینکڑوں نے نوبلے الفاظ اٹھکیلیاں کر رہے ہیں، مگر قول کا کالان ایک طرف کو جھکتا ہے نہ دوسری جانب، گویا ایک قدرتی توازن والا حلقلساتا ہوا پانچ ہے۔

ظفر اقبال نے کبھی روایتی رومانی شاعری نہیں کی، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس عمر میں بھی اُن کی شاعری مجموعی طور پر ایک بے باک الھڑ پن کا مظاہرہ پیش کرتی ہے، یا ایک ایسے کھلنڈرے بچے کا جو ایک ٹین اور ایک روڑے کی مدد سے انوکھی دھنیں پیدا کر رہا ہو۔

عبداللہ حسین

Design By

MULTI MEDIA AFFAIRS